سکون کی تلاش

سوانح حیات علامہ عبداللہ یوسف علی

Marfat.com

Searching for Solace

سکون کی تلاش

سوانح حیات علامہ عبداللہ یوسف علیؒ

ایم اے شریف

ترجمہ

زبیر بن عمر

نظر ثانی

افضل اقبال

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی-اسلام آباد

Marfat.com

297.9924
شر 58 ع
9105
1/

اس کتاب کا کوئی حصہ ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر کسی بھی شکل میں شائع نہ کیا جائے، البتہ تحقیقی مقاصد یا تبصرے کی غرض سے ضروری اقتباسات نقل کیے جاسکتے ہیں۔

کوائف فہرست سازی دوران طباعت

شریف، ایم اے
سکون کی تلاش (ترجمہ:Searching for Solace):
سوانح حیات علامہ عبداللہ یوسف علیؒ۔ مترجم: زبیر بن عمر، نظر ثانی: افضل اقبال
(ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد)
۱۔ عبداللہ یوسف علی (۱۸۷۲ء۔۱۹۵۳ء)
۲۔ زبیر بن عمر، مترجم، ۳۔ افضل اقبال، نظر ثانی
الف۔ عنوان ب۔ سلسلہ

ISBN: 978-969-408-301-8

922-971227 dc 21

اشاعت اوّل ۲۰۱۰ء

مطبع: ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی پریس۔اسلام آباد

Marfat.com

مندرجات

حرف اوّل ۷

تعارف ۱۷

حصہ اوّل — حالات زندگی

باب اوّل — صورت گری ۲۳

باب دوم — الجھنیں اور پریشانیاں ۵۱

باب سوم — تاج برطانیا کے لیے خدمات ۹۵

باب چہارم — ہمہ جہت شخصیت ۱۵۱

باب پنجم — جنیوا سے لاہور ۱۸۱

باب ششم — ایک مضطرب روح ۲۳۵

حصہ دوم — مساعیٔ جلیلہ

باب ہفتم — تعلیمی مقاصد اور اہداف ۲۹۱

باب ہشتم — ایک ہم آہنگ اور منظم دنیا ۳۱۱

باب نہم — قرآن بطور ہدایت ۳۲۹

باب دہم — اختتامیہ ۳۵۷

دستاویزات اور تصاویر ۳۶۷

ضمیمہ — کتابیات عبداللہ یوسف علی ۳۸۴

حوالہ جات ۴۰۶

اشاریہ ۴۱۳

Marfat.com

Marfat.com

حرفِ اوّل

آزادی کے حصول اور قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء کے ابتدائی مہینے ایک پُر آشوب، مگر جوش اور امید سے بھرپور دور کی یاد دلاتے ہیں۔ تاریخ سازی کے عمل کو اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھنا کسی بھی شخص کے لیے ایک اعزاز کی بات تھی۔ البتہ یہ بات درست ہو یا نہیں، مگر ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ ہم بھی کسی نہ کسی لحاظ سے تاریخ سازی کے اس عمل میں شریک ہیں۔ وہ عظیم خواب جو ہم سب نے مل کر دیکھا تھا حقیقت کے روپ میں ہمارے سامنے تھا، اور ہم لوگ حصولِ منزل کی خوشی سے سرشار تھے کہ تقریباً ایک صدی پر محیط استعمار کی حکم رانی اب انجام کو پہنچ چکی تھی اور ہم دنیا کے پانچویں بڑے ملک کے آزاد شہری تھے۔ ایک عظیم الشان مستقبل ہماری دست رس میں تھا اور اپنی منزل ہمیں ستاروں سے بھی آگے نظر آتی تھی۔ ایک مکمل خودمختار ریاست معرضِ وجود میں آچکی تھی، جو اس پختہ عہد کی حامل تھی کہ اسلامی نظامِ حکومت کے تصور کو عملاً بروئے کار لایا جائے گا۔ لہٰذا فطری طور پر قیامِ پاکستان کے اس اہم تاریخی واقعے نے اسلامی شناخت اپنانے کے جذبات بیدار کیے اور انھیں مہمیز دی۔ نیز یہ تجسس ابھارا کہ اس مقصد کے بارے میں اور زیادہ واقفیت بہم پہنچائی جائے جس کی خاطر یہ ملک قائم ہوا۔ چنانچہ ہم میں سے دل چسپی رکھنے والے بیش تر لوگ اُن کتابوں کی جانب متوجہ ہوئے جو اس وقت مختلف اسلامی موضوعات پر شائع ہو رہی تھیں اور جن کی تعداد روز افزوں تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن قطعاً اتفاقی طور پر اپنے والدِ مرحوم کی ذاتی لائبریری سے میں نے عبداللہ یوسف علی کا 'ترجمۂ قرآن مع حواشی' اٹھایا اور اس میں سے آخری پارے کی چند سورتوں کا ترجمہ پڑھا۔ ترجمہ میرے قلب و ذہن پر چھا گیا اور کالنقش فی الحجر میرے حافظے پر تحریر

Marfat.com

ہو گیا۔ جو کچھ میں نے پڑھا، وہ میرے لیے انتہائی متاثر کن اور قلب و ذہن میں تلاطم برپا کر دینے والا تھا۔ مثال کے طور پر ذیل کا ترجمہ دیکھیے:

***Surah* 82, *Infitar* or the Cleaving Asunder**

In the name of God, Most Gracious, Most Merciful.
When the Sky
Is cleft asunder;

When the Stars
Are scattered;
When the Oceans
Are suffered to burst forth;

And when the Graves
Are turned upside down;

(Then) shall each soul know
What it hath sent forward
And (what it hath) kept back.

0 Man! What has
Seduced thee from
Thy Lord Most Beneficent?

Him Who created thee,
Fashioned thee in due proportion,
And gave thee a just bias;

In whatever Form He wills,
Does He put thee together.

Nay! But ye do
Reject the Judgement!

Marfat.com

But verily over you
(Are appointed angels)
To protect you;

Kind and honourable,
Writing down (your deeds):

They know (and understand)
All that ye do.

As for the righteous,
They will be in Bliss;

And the wicked
They will be in the Fire;

Which they will enter
On the Day of Judgement,

And they will not be
Able to keep away therefrom.

And what will explain
To thee what the Day
Of Judgement is?

Again, what will explain
To thee what the Day
Of Judgement is?

(It will be) the Day
When no soul shall have

Marfat.com

Power (to do) aught
For another:

For the Command, that Day,
Will be (wholly) with God.

Let us look at another specimen:

***Surah* 102, *Takathur*, or Piling up**

In the name of God, Most Gracious, Most Merciful

The mutual rivalry
For piling up (the good things
Of this world) diverts you
(From the more serious things),

Until ye visit the graves.

But nay, ye soon shall
Know (the reality).

Again, ye soon shall know!

Nay, were ye to know
With certainty of mind,
(Ye would beware!)

Ye shall certainly see
Hell-fire!

Again, ye shall see it
With certainty of sight!.

Marfat.com

Then, shall ye be
Questioned that Day
About the joy
(Ye indulged in)!

To consider still another sample:

Surah 104, _Humaza_, or The Scandal-monger

In the name of God, Most Gracious, Most Merciful

Woe to every
(Kind of) scandal-monger
And backbiter,

Who pileth up wealth
And layeth it by,

Thinking that his wealth
Would make him last
For ever!

By no means! He will
Be sure to be thrown into
That which Breaks to Pieces.

And what will explain
To thee that which Breaks
To Pieces?

(It is) the Fire
Of (the Wrath of) God
Kindled (to a blaze),

Marfat.com

The which doth mount
(Right) to the Hearts,

It shall be made
Into a vault over them,

In columns outstretched.

میں نے بچپن سے قرآنِ مجید کو از اوّل تا آخر کئی بار پڑھا تھا، اور کبھی مختلف آیات کا اردو ترجمہ بھی دیکھا۔ لیکن کتاب اللہ کی قوتِ تاثیر اور عظمتِ بیان کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب عبداللہ یوسف علی کے ترجمۂ قرآن میں سے کچھ سورتوں کا مطالعہ کیا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس نے مجھے قرآنِ عظیم کی دائمی اور فوری اہمیت کا احساس دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ لہٰذا قدرتی طور پر میں عبد اللہ یوسف علی کا مداح اور ان کے ترجمۂ قرآن کا گرویدہ ہو گیا۔ یہ ستائش اور پسندیدگی ایک عرصہ میری ہم عناں رہی۔

عبداللہ یوسف علی سے اس ابتدائی اور مختصر سے تعارف کے کئی عشروں بعد مجھے ان کے 'ترجمۂ قرآن مع حواشی' کو زیادہ توجہ اور لگن کے ساتھ پڑھنے کا موقع دستیاب ہوا۔ یہ بات عیاں ہے کہ خدا کے کلام سے متعلق کسی بھی شخص کے الفاظ کبھی آخری اور حتمی نہیں ہو سکتے۔ عبداللہ یوسف علی بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ تاہم، ان کے ترجمۂ قرآن کا مطالعہ مفید بھی رہا اور بصیرت افروز بھی۔ چنانچہ اس کے لیے میری پسندیدگی اور بڑھ گئی۔ ادبی انداز میں تحریر کردہ یہ دل کش ترجمہ زورِ بیان اور تاثیر ہی کا حامل نہ تھا، بلکہ میرے تصور سے کہیں زیادہ اصل متن کے مطابق اور عالمانہ مہارت کا مظہر تھا۔ دل چسپی اور توجہ کے ساتھ کیے جانے والے اس مطالعے کے دوران پتا چلا کہ ایسے بہت سے مقامات جہاں ترجمہ اولین نظر میں غیر مناسب یا بظاہر غلط دکھائی دیتا ہے، وہاں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان میں سے کئی مقامات پر عبداللہ یوسف علی اپنے بیان کردہ

Marfat.com

معانی کو لغت کے مصادر یا کسی اہم تفسیری مآخذ سے سند فراہم کرتے ہیں۔ میری رائے میں ان کا ترجمہ ذکاوت وشگفتہ بیانی کا نمونہ ہے۔

عبداللہ یوسف علی کے تشریحی حواشی نے بھی مجھے بہت متاثر کیا۔ ان حواشی سے بہت سے موضوعات جیسے تقابلِ ادیان، عالمی تاریخ اور علومِ اسلامیہ، خاص طور پر کتب تفسیر، نیز انگریزی اور مشرقی ادبیات کے بارے میں مصنف کے وسیع علم کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ حواشی انتہائی قابلِ تحسین ہیں۔ تاہم میں نے یہ بات محسوس کی کہ کہیں کہیں تخیل کو آزاد چھوڑ کر عبداللہ یوسف علی اس طرح کی بہت سی باتیں بھی قلم بند کر گئے ہیں جن سے ایک دل کش تحریر تو سامنے آتی ہے لیکن تشریح طلب آیات کے اصل معانی کی بہتر تفہیم کے سلسلے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

عبداللہ یوسف علی کا 'ترجمۂ قرآن مع تشریح' پہلے پہل ۱۹۳۸ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس وقت سے ان کی وفات تک کے عرصے میں عبداللہ یوسف علی کو ایک بڑے مسلم اسکالر کے طور پر پہچانا جانے لگا جس نے انگریزی خوانوں کو قرآن کا مفہوم اور پیغام بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دی، اور یوں قرآنِ مجید کی قابلِ قدر خدمت انجام دی۔ پچاس کی دہائی سے عبداللہ یوسف علی کا یہ 'ترجمۂ قرآن مع تشریح'، بالخصوص مغربی ممالک میں بڑے پیمانے پر شائع ہوا اور تقسیم کیا گیا۔ میری ذاتی رائے میں اس ترجمے کی اشاعت و تقسیم انگریزی میں قرآن مجید کے کسی بھی دوسرے ترجمے سے زیادہ رہی۔

میری طرح بہت سے لوگوں کے نزدیک عبداللہ یوسف علی (جن کے نام کے ساتھ برِّ صغیر میں احتراماً علامہ کا لقب استعمال کیا جاتا ہے) بلاشبہ انگریزی زبان میں قرآن کی ترجمانی کرنے والے سب سے اہم شخص سمجھے جاتے تھے۔ لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ ان کے اس علمی رتبے کی وسیع پہچان کے باوصف، بہت کم لوگ ان کے بارے میں اس سے ہٹ کر کچھ جانتے تھے کہ بس وہ ایک

Marfat.com

بڑے مترجم قرآن ہیں۔ان کی جائے ولادت، بچپن، خاندان، نیز ان کی تعلیم، پیشہ ورانہ کام، اور ان کے مذہبی تشخص کے پس منظر سے متعلق بنیادی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔خود ان لوگوں کے لیے جو اسلام کے بارے میں مطالعے کا ذوق واہتمام رکھتے تھے عبداللہ یوسف علی کی زندگی دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔

برطانیا میں آباد جنوبی ایشیا کے ایک مذہبی اور تعلیم یافتہ خاندان کے چشم و چراغ ایم اے شریف، جو پیشے کے اعتبار سے Systems Analyst ہیں، نے بجا طور پر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔انھوں نے اپنی زندگی کے کئی برس عبداللہ یوسف علی سے متعلق بڑی مقدار میں شائع شدہ مواد، نیز خود ان کی اپنی تحریروں کے گہرے مطالعے کے لیے وقف کیے، تاکہ ان کی زندگی کے اہم واقعات اور درپیش مسائل سے آگاہی حاصل کر سکیں جن کا انہیں سامنا رہا۔ان سب امور کو اس لیے پورے طور پر جاننا ضروری تھا کہ عبداللہ یوسف علی کی شخصیت میں ان داخلی ترغیبات و محرکات کو سمجھا جا سکے جن سے ان کی پہلودار اور کسی قدر پیچیدہ شخصیت تشکیل پائی۔یہ ایک بہت بڑا کام تھا جو انتہائی صبر اور مستقل مزاجی کا متقاضی تھا، جس کے لیے ایم اے شریف کو محنت و کوشش اور دقتِ نظر کے ساتھ مختلف مآخذ و مراجع سے رجوع کرنا اور انھیں کھنگالنا ضروری تھا۔ان مآخذ میں انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے اجلاسوں کی روداد؛ انڈیا آفس لائبریری؛ پبلک ریکارڈ آفس اور جنرل رجسٹریشن آفس کی فائلیں؛ پیدائش، ازدواج اور اموات کے رجسٹر؛ نیز مختلف مقامات، خاص طور پر انگلستان میں وصیت اور طلاق کے ریکارڈ شامل ہیں۔اس سلسلے میں ۳۸۵ تراشوں پر مبنی عبداللہ یوسف علی کی ذاتی بیاض بھی کم اہمیت کی حامل نہ تھی، جو انتہائی خوش نصیبی کی بات تھی کہ ایم اے شریف کو لندن میں پرانی Regent's Lodge (جو Islamic Cultural Centre اور Mosque of London کے لیے منتخب جگہ تھی) سے دستیاب ہو گیا۔

Marfat.com

اس بھرپور اور منظّم و منضبط تحقیق پر، کہ جس کے ساتھ ایم اے شریف کی قدرتی فکری صلاحیت (یعنی بصیرانہ ذہانت، گہرا مشاہدہ اور نکھری ہوئی برجستہ و موزوں تحریر) شاملِ کار تھی، ان کا سپاس لازم ہے کہ ہمیں ایک دل کش اور معیاری سوانحِ حیات دیکھنے کو ملی جو گوشت پوست کے عبداللہ یوسف علی کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ اس میں بچپن سے لے کر دمِ آخریں تک ان کی زندگی کے اہم واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن میں سے بیش تر ہمارے حیطۂ علم میں نہیں تھے۔ اس طرح عبداللہ یوسف علی کی حاصل کردہ کامیابیاں اور وہ کٹھن، حوصلہ شکن حالات جن میں یہ کامیابیاں حاصل کی گئیں، نیز وہ بھاری بھرکم مسائل، تناؤ کی کیفیات اور محسوسات کے کتمان کی حالتیں جو انھیں درپیش رہیں، سب کچھ مناسب انداز میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس تحقیق سے نکھرنے والی عبداللہ یوسف علی کی تصویر ہمارے دل میں ان کے لیے ستائش اور ہمدردی کے جذبات ابھارتی ہے، اور بلاشبہ ان کی کثیر پہلو شخصیت کی بہتر تفہیم میں بھی مدد دیتی ہے۔

اس سوانحی تصنیف کے لیے مصنف کا اختیار کردہ عنوان: Searching for Solace بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ عبداللہ یوسف علی کو یکے بعد دیگرے اپنی دو شادیوں میں علیحدگی سے دوچار ہونا پڑا، اور نفسیاتی کرب کا یہ تسلسل ان کے بچوں کی جانب سے عدم احترام کے اظہار سے مزید شدت اختیار کر گیا۔ ان کی پیشہ ورانہ زندگی بھی مناقشہ و نزاع کی الجھنوں کا شکار ہوئی اور انھیں اپنی زندگی کی شام کے جھٹ پٹے میں ہندوستان، برطانوی سلطنت اور عمومی لحاظ سے دنیا میں یکلخت واقع ہونے والی تبدیلیوں کا ساتھ دینے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ان حالات میں بھی عبداللہ یوسف علی اپنے علمی مشاغل کامیابی کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔ یہی بات ان کی شخصیت اور کام کے بارے میں ستائش کے جذبات ابھارتی ہے۔ ان تناؤ بھرے حالات میں فطری امر تھا کہ عبداللہ یوسف علی اپنے قلبی و ذہنی سکون کے لیے خدا تعالیٰ سے اور کتابِ خداوندی سے رجوع کرتے کہ قرآنِ کریم، خود اپنے الفاظ میں ''نصیحت و موعظت اور اسقامِ قلب کا علاج ہے،

Marfat.com

نیز ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا سرچشمہ بھی'' (سورۂ یونس: ۵۷)، اور سب سے بڑھ کر یہ حقیقت کہ ''خدا کی یاد ہی سے دلوں کو تسلی اور اطمینان ملتا ہے'' (سورۂ رعد: ۲۸)۔

یہ کتاب ابتدائی طور پر Islamic Book Trust، کوالالمپور، ملیشیا نے شائع کی۔

ہم مصنف اور شائع کنندگان کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمیں کتاب کا تازہ ایڈیشن شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور یہ پہلی بار ۲۰۰۰ء میں اسلام آباد سے شائع ہوا۔ ہم اس کا اردو ترجمہ شائع کرنے کی اجازت بھی حاصل کر چکے ہیں جو اب پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کاوش کے لیے زبیر بن عمر، جنہوں نے ترجمہ کیا اور افضل اقبال، جنہوں نے نظر ثانی کی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

ظفر اسحاق انصاری

سکون کی تلاش

(Searching for Solace)

تعارف

لندن میں ۱۹۵۳ء کا موسمِ سرما خاصا درشت تھا۔ ۹؍ دسمبر، اتوار کے روز Westminster میں ایک پریشان حال بوڑھا شخص، باہر ایک گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا نظر آیا۔ پولیس اسے ویسٹ منسٹر ہسپتال لے گئی۔ اگلے ہی دن وہاں سے فراغت مل گئی اور اسے Chelsea کی Dovehouse Street میں London County Council کا عمر رسیدہ اشخاص کے لیے قائم کردہ ایک آشرم اپنے ہاں لے گیا۔ ۱۰؍ دسمبر کو اسے دل کا دورہ پڑا اور فوری طور پر Fulham میں سینٹ سٹیفنز ہسپتال لے جایا گیا۔ ہسپتال میں داخلے کے تین گھنٹے بعد وہ بوڑھا شخص وفات پا گیا۔ خلافِ معمول کوئی بھی رشتہ دار میت کو لینے اور دفنانے کا انتظام کرنے کو موجود نہ تھا۔ تاہم پاکستانی ہائی کمیشن مرحوم سے واقف تھا، اور جونہی County of London کے مفتشِ اموات نے اپنی تفتیش مکمل کی، متوفی کو اسلامی طریقے سے Brookwood قبرستان، Surrey میں مسلمانوں کے لیے مخصوص حصے میں دفنا دیا گیا۔ ان افسوس ناک حالات میں عبداللہ یوسف علی کی اکیاسی سالہ غیر معمولی زندگی اپنے اختتام کو پہنچی۔

عبداللہ یوسف علی کو انگریزی میں ان کے شاندار 'ترجمۂ قرآن مع تشریح' کے حوالے سے خوب اچھی طرح پہچانا جاتا ہے، جو پہلے پہل ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا، اور بعد میں فروخت نیز

Marfat.com

مفت تقسیم کے لیے انتہائی وسیع پیمانے پر اس کی اشاعتیں عمل میں آئیں۔ عبداللہ یوسف علی کا یہ ضخیم ترجمہ و تشریح دنیا کے انگریزی بولنے والے مسلمان حلقوں کی مساجد اور گھروں میں ایک معیاری حوالہ جاتی کتاب شمار ہوتا ہے، اور شاید بیسویں صدی کی اسلامی تصنیفات میں سب سے زیادہ شائع اور تقسیم ہونے والی کتاب کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس 'ترجمہ قرآن مع تشریح' کی شہرت فزوں تر ہوتی چلی گئی، جو مترجم کی طرف سے قرآنی عربی کی بالکل درست طور پر انگریزی میں منتقلی، انگریزی اسلوب بیان پر ان کی ماہرانہ دست رس اور عالمانہ حیثیت کو ایک خراجِ تحسین ہے۔

عبداللہ یوسف علی کی سوانحِ حیات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی رہی، خاص طور پر ان کے 'ترجمہ قرآن مع تشریح' کے قارئین کے ہاں، جو یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ اس بے مثل فن پارے کے پسِ منظر میں کس نوعیت کی شخصیت پوشیدہ ہے۔ چند ایک سوانحی قاموسوں میں ان کے نام کا اندراج ضرور پایا جاتا ہے، لیکن ایک تو یہ قوامیس عام طور پر دستیاب نہیں، دوسرے ان کے مشمولات پرانے تذکرہ جاتی انداز کے حامل ہیں۔ عبداللہ یوسف علی کی وفات پر مسلم دنیا کے اخبارات میں جو کچھ شائع ہوا، وہ لندن کے The Daily Telegraph یا The Times میں ان کے اعلانِ وفات کے تحت شائع ہونے والی تفاصیل سے کہیں کم واقعاتی سچائی کا حامل تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلم دنیا نے ان کا تشخص، صوفیانہ میلانات رکھنے والے ایک خاموش عالم کے طور پر قبول کرتے ہوئے اسی پر اکتفا کر لیا تھا، جو فی الواقع ایک ایسے شخص کے ساتھ کھلی ناانصافی تھی جو مختلف سرکاری عہدوں پر خدمتِ عامہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ سیاسی وابستگی بھی رکھتا تھا اور کثیر التصانیف ادبی شخصیت کا بھی مالک تھا۔

Marfat.com

عبداللہ یوسف علی کا شمار ہندوستان کے ذہین اور روشن دماغ مسلمانوں کی اس نسل کے منتخب افراد میں تھا جو تقریباً سب کے سب انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں پیدا ہوئے تھے، اور جنہوں نے آکسفرڈ یا کیمبرج میں تعلیم حاصل کی یا لندن میں بیرسٹری کی سند کے لیے قانون کی تربیت پائی یا پھر یوسف علی کی طرح دونوں اداروں سے فیض یاب ہوئے۔ اس نسل میں محمد علی جناح، محمد علی جوہر اور محمد اقبال شامل تھے اور شیخ عبدالقادر اور فضل حسین جیسے نسبتاً کم معروف لیکن انتہائی بااثر لوگ بھی تھے۔ عبداللہ یوسف علی کی شخصیت جناح یا اقبال جیسی عبقریت کی مظہر نہ تھی، نہ ان کی شخصیت میں جوہر جیسی جرأت و بے خوفی یا فضل حسین کی سی سیاسی ہنر مندی اور چابک دستی نظر آتی ہے۔ مگر یہ امر یوسف علی کی جامع اور بھرپور شخصیت کے لیے خراج تحسین کا طالب ہے کہ ایسے حالات میں جب کہ مذکورہ بالا ہستیوں میں سے کئی اصحاب، جن سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مسلم ہندوستان کی تاریخ سازی میں مرکزی کردار ادا کریں گے، تھک ہار کر بیٹھ گئے، عبداللہ یوسف علی ایک نسبتاً چھوٹا مگر مستقل اور دائمی اہمیت کا کردار ادا کرتے رہے اور تاریخ کے مرکزی سٹیج پر رونما ہونے والے واقعات سے کبھی زیادہ دور نہیں رہے۔

عبداللہ یوسف علی نے کلیدی اہمیت کی سرگرمیوں میں اتنی کثرت سے شرکت کی کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۹ء میں ہونے والی پیرس امن کانفرنس میں شرکت سے لے کر تقسیم ہند سے پہلے یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان ہونے والی کشمکش اور سرد جنگ میں شامل ہونے تک مستقلاً جاری رہا۔ انہوں نے بارہا تعلیمی کانفرنسوں کی صدارت کی۔ یہاں تک کہ ان کا شمار ہندوستان میں تعلیم کے مسلّمہ ماہرین میں ہونے لگا تھا۔ وہ ۱۹۳۲ء میں بننے والی پنجاب یونیورسٹی کی انکوائری کمیٹی کے رکن تھے۔ یونیورسٹی سینیٹ کے ممبر بھی رہے۔ پنجاب کی یونینسٹ حکومت کی تعلیمی اصلاحات کے پروگرام میں، جس کے اثرات دور رس ہوئے،

Marfat.com

عبداللہ یوسف علی کا بھی کردار تھا۔ عبداللہ یوسف علی اپنے عہد کے رہنماؤں سے نہ صرف واقفیت رکھتے تھے بلکہ انہیں ۱۹ ویں صدی کے مسلم زعماء سے ملنے کے مواقع بھی ملے تھے اور ان کا انہوں نے گہرا اثر بھی قبول کیا تھا۔ جن شخصیات نے عبداللہ یوسف علی کے فکر و عمل پر اثر ڈالا ان میں سب سے بڑھ کر علی گڑھ یونیورسٹی کے حوالے سے شہرت و امتیاز کے حامل سر سید احمد خاں، جسٹس بدرالدین طیب جی، جو انڈین نیشنل کانگریس کے ابتدائی زمانے کے رہنماؤں میں نمایاں تھے، اور ماہر قانون اور ''سپرٹ آف اسلام'' جیسی مشہور کتاب کے مصنف سید امیر علی شامل ہیں۔ عبداللہ یوسف علی جذبۂ عمل اور انتھک محنت کی صلاحیت رکھنے والے ایک غیر معمولی انسان تھے۔ ان کی ذاتی زندگی کے کوائف، جن میں آزمائشیں اور کامیابیاں دونوں شامل ہیں، یقیناً اپنی جگہ دلچسپی کی حامل ہیں۔ لیکن ان کی پوری زندگی تجربات کا ایسا قیمتی ذخیرہ ہے جس کے ذریعے جدید مسلم تاریخ کا وہ دور بہتر طور پر دائرۂ ادراک میں آتا ہے جس کے دوران ہر لمحہ واقعات و حوادث تخلیق کر رہا تھا۔ ان کی حیات فانی کے آثار تلاش کرتے ہوئے یہ بھی ممکن ہو سکے گا کہ ہم تاریخ کے اس دور کے بعض لمحات کا مشاہدہ کر سکیں اور یہ اندازہ کر سکیں کہ اس دور میں وقت کا دباؤ کس طرح حالات و عوامل پر اثر انداز ہو رہا تھا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی ہمیں ایک ایسی جدوجہد کے نمایاں شواہد ملتے ہیں جس کی غایت اسلام کی روحانی اور سیاسی ہیئت اجتماعی کی از سر نو تشکیل و تعمیر ہے جس کے ذریعے اس کا روحانی اور سیاسی و اجتماعی نظام ایک مربوط اکائی کی شکل اختیار کر لے۔ یوسف علی کا ذہنی و فکری رجحان کچھ اس امر کا غماز تھا کہ ان کے نزدیک اسلام کا رائج الوقت جزوی تصور دراصل براہ راست نتیجہ تھا نوآبادیاتی سامراجیت کا جو مغربی استعمار کے زیر اثر مسلمانوں کے اجتماعی شعور میں پیوست ہو گیا تھا۔ ان حالات و کوائف

Marfat.com

اور پس منظر کا تجزیہ کرنا جس میں مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں اس رویے نے جنم لیا یوں بھی ضروری ہے کہ ممکن ہے کہ اس طرح اس کیفیت کو سمجھنے میں مدد ملے جس میں مسلمانوں کا اجتماعی شعور اسیر ہو گیا تھا اور اس طرح ان کے افکار کی تطہیر کی کوئی راہ نکل سکے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں: پہلے حصے میں تاریخی ترتیب سے ان کی ذاتی اور عوامی زندگی کی تفصیل ہے۔ دوسرے حصے میں ان موضوعات، مقاصد اور دلچسپیوں کا ذکر ہے جو ان کے مشاغل اور تحریر و تقریر کا مرکزی نکتہ رہے تھے۔ کتاب میں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے۔ یہ ضمیمہ ان کی مطبوعہ تحریروں کی فہرست ہے۔ اس میں وہ تبصرے بھی شامل ہیں جو ان کی تحریروں پر ان کو موصول ہوئے تھے، اور ساتھ ہی ان کی وفات پر جو تعزیتی کلمات کہے گئے یا لکھے گئے شامل کر لیے گئے ہیں۔

بیسویں صدی کی عظیم مسلمان شخصیات پر مسلمان سوانح نگاروں نے مناسب اور وقیع کام عام طور پر نہیں کیا ہے۔ جہاں تک علوم شرقیہ کے ماہرین کا تعلق ہے ان کی ایک قسم وہ ہے جنہوں نے مسلم دنیا میں سماجی رویوں کی بدلتی ہوئی اشکال اور نمونوں کی نشان دہی کرنے میں انتہائی عجلت دکھائی اور اپنے سطحی تجزیوں اور افراد اور شخصیات کو اپنے ڈھلے ڈھلائے سانچوں میں فٹ کر کے پیش کرنے کی قیمت بھی ادا کی۔

یہ ایک بڑا المیہ ہوگا اگر مسلمان خود اپنے طور پر ان شخصیات کے حقیقی خدوخال باریکیوں اور تفصیلات کے ساتھ محفوظ کرنے میں ناکام رہیں۔ اس ورثہ کی حفاظت کی ضرورت اس لیے ہے کہ جب وقت مناسب ہو اور تقاضا کرتا ہوا نظر آئے تو بیسویں صدی کی شخصیات کی زندگی اور افکار کی یہ تصویریں دوبارہ غور سے دیکھی اور پڑھی جا سکیں اور مغربی علماء نے اپنے

Marfat.com

مزعومہ تصورات کے مطابق ان شخصیات کے افکار کو جو رنگ دیا ہے اسے مٹا کر افکار کو ان کی اصل شکل میں پیش کیا جا سکے۔ یہ وہ چیلنج ہے جو مسلمان مؤرخین کو درپیش ہے کہ وہ خود اپنے طور پر تاریخ کے نہاں خانوں میں غوّاصی کریں اور اپنی تاریخی وراثت کے تحفظ کا اہتمام کریں۔

Marfat.com

حصہ اوّل

حالاتِ زندگی

Marfat.com

Marfat.com

91042

باب اوّل

صورت گری

مسلم ہندوستان عملاً ۱۷۶۳ء میں بکسر کی لڑائی کے بعد برطانوی ہندوستان میں تبدیل ہوا۔ صوبہ بہار میں ہونے والی اس عسکری شکست نے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ لندن میں قائم ایسٹ انڈیا کمپنی کو زمین کے محاصل جمع کرنے اور دیوانی فیصلے کرنے کے اختیارات سونپ دے۔ یہ وہ مراعات تھیں جن کے نتیجے میں برطانیا کو مسلمان حکام کی جگہ انگریز حکام مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستانی معاشرے کو لوٹنے کا موقع مل گیا۔ لوٹی ہوئی دولت کا ایک حصہ کمپنی کے حصہ داروں کو ملتا تھا اور دوسرا حصہ ہندوستان کے باقی ماندہ علاقوں کو برطانوی مقبوضات میں شامل کرنے پر خرچ ہوتا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کے حاکم ٹیپو سلطان کی طاقت کا خاتمہ ہوا اور ۱۸۱۸ء تک ہندوستان کا بیشتر علاقہ برطانوی حاکمیت کے تسلط میں آ گیا۔ ہندو آبادی برطانوی حکمرانوں کی نئی با اعتماد شریک بن گئی اور مسلمان اپنے ہی وطن میں اختیار و اقتدار کے تمام اداروں سے باہر ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد مسلمانوں کا دائرۂ اثر اور بھی کم ہو گیا۔ اس عدم وفاداری کی سزا کے طور پر مسلمانوں کو شدید عسکری اور معاشی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننا پڑا جس میں اردو زبان کو سرکاری دفاتر میں استعمال کرنے پر پابندی اور سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کے مواقع کم کرنے کے اقدامات بھی شامل تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی اس بغاوت کا ایک نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ برطانیا کو ہندوستان کے لیے ایک نیا نظم حکومت تشکیل دینا پڑا جس کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ کے اختیارات برطانوی پارلیمنٹ کو منتقل کر دیے گئے۔ اس نظم و نسق کی ذمہ داری

سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے سپرد ہوئی۔ ہندوستان کے وائسرائے اور سول سروس ان کو جواب دہ قرار پائے۔ لندن میں واقع انڈیا آفس، انڈین آرمی اور انڈین سول سروس کے تمام اخراجات بھی ہندوستان سے حاصل ہونے والی دولت سے ادا کیے جانے لگے۔

۱۸۷۰ء کی دہائی میں مسلمانوں نے اپنے اداروں کی از سر نو تشکیل و تعمیر کا بیڑہ اٹھایا۔ ۱۸۷۶ء میں بمبئی کے مسلمانوں کے ایک گروپ نے ''انجمن اسلام'' قائم کی جس کے مقاصد میں مسلمان بچوں کے لیے ایک سکول قائم کرنا بھی شامل تھا۔

۱۸۷۷ء میں سید احمد خاں نے، جو سر سید کے نام سے معروف ہوئے، علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا جس کے پس پشت ان کا یہ یقین تھا کہ مسلمانوں کی بقا ان کے معیار تعلیم سے وابستہ ہے۔ (۱)

اسی دوران سید امیر علی نے مرکزی قومی محمڈن ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن کلکتہ میں قائم کی۔ چند سال بعد ۱۸۸۴ء میں لاہور میں انجمن حمایت اسلام قائم ہوئی جس کے مقاصد میں تعلیمی اور فلاحی نوعیت کے میدان میں کام کرنا شامل تھا۔ اس انجمن نے لاہور میں اسلامیہ کالج قائم کیا۔ ۱۹ ویں صدی کی ان دہائیوں میں جہاں ایک طرف مسلمان اداروں کی تعمیر و تشکیل کا کام ہو رہا تھا وہیں دوسری طرف کچھ ایسے مسلمان علماء اور اسکالرز بھی سامنے آ رہے تھے جن کو انگریزی زبان پر تحریر و تقریر کی قدرت حاصل تھی اور وہ اس صلاحیت کو اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ (۲)

عبداللہ یوسف علی ۱۴ اپریل ۱۸۷۲ء کو مغربی ہندوستان کی ایک ریاست گجرات کے شہر سورت میں پیدا ہوئے جو کپڑے کی صنعت کے لیے مشہور ہے۔ برطانوی راج میں یہ صوبہ پریزیڈنسی آف بمبئی کا ایک حصہ تھا۔ ان کا تعلق داؤدی بوہرہ فرقے کے ایک تاجر خاندان سے

تھا۔ بوہرہ مسلمانوں کا خیال ہے کہ ان کے اسلاف، مصر کے فاطمیہ حکمرانوں کے مقرر کردہ مبلغین کی مساعی سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

اُن کی مذہبی روایات کی رو سے یہ لازم تھا کہ ایک رہنما یا داعی ان کا دینی لیڈر ہو اگرچہ ایک داعی کے بعد دوسرے 'داعی' کو امامت کے منصب کی منتقلی ہمیشہ اختلاف و انتشار کا سبب بھی بنتی رہی تھی۔ سولہویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہ اکبر کے زمانۂ حکومت کے دوران میں ایک ایسے ہی اختلاف و انتشار کے نتیجے میں بوہرہ فرقے کے مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے: ایک گروہ داؤدی کہلایا اور دوسرا اسلیمانی۔

بوہرہ فرقے کے لوگ عموماً سورت اور بمبئی میں تجارتی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ ۱۹۲۰ء تک عبداللہ یوسف علی داؤدی فرقہ کے ایک نمایاں فرد کی حیثیت سے جانے جانے لگے تھے مگر ان کی وجہ شہرت تجارت نہ تھی۔ [۳] وہ دراصل اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ ان کے والد یوسف علی اللہ بخش سورت کی پولیس میں ایک افسر تھے جنہیں ۱۸۸۵ء میں ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد خان بہادر کا خطاب دیا گیا تھا۔ خان بہادر کا خطاب برطانوی حکومت ان مسلمانوں کو دیا کرتی تھی جنہوں نے عوامی خدمت کا کوئی کارنامہ انجام دیا ہو، یا اپنے مال و دولت سے کوئی فلاحی کام سرانجام دیا ہو۔ [۴]

عبداللہ یوسف علی کے نام میں کئی بار تبدیلی ہوئی۔ ۱۸۹۱ء میں کیمبرج میں داخلے کے وقت انہوں نے اپنا نام ''عبداللہ خان بہادر یوسف علی'' لکھا۔ یہ خلاف معمول اس لیے تھا کہ اس نام میں انہوں نے اپنی خاندانی شناخت کی بجائے والد کے خطاب کو استعمال کیا تھا۔ یہ سہوا تفاقیہ نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اسی سال لنکنز اِن (Lincoln's Inn) میں بیرسٹری کے لیے رجسٹریشن کراتے وقت دوبارہ وہی نام استعمال کیا گیا۔ البتہ ۱۸۹۴ء میں جب انہوں نے انڈین سول

Marfat.com

سروس (I.C.S) میں شرکت کے لیے درخواست کا فارم بھرا تو خود اپنے ہاتھ سے اپنا نام ''عبداللہ ابن خان بہادر یوسف علی'' درج کیا، ساتھ ہی دستخطوں میں ''عبداللہ کے بی۔ ابن یوسف علی'' کر دیا۔ یہ تبدیلی ان کے ذہنی تذبذب کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ اپنے نام میں 'ابن' کا اضافہ ایک ہندوستانی مسلمان کے نام میں ایک خلاف معمول بات تھی۔ انڈیا آفس کے منتظمین نے جو آئی سی ایس کے لیے درخواستوں کی جانچ پڑتال کے ذمہ دار تھے دہرے خاندانی نام کو درست سمجھا اور اس طرح ان کا نام ''عبداللہ ابن خان بہادر یوسف علی'' پڑا۔(۵) یوسف علی نے کئی سال تک اپنے اس دشوار نام کو برقرار رکھا۔ کبھی کبھار وہ خط و کتابت میں اختصار کے لیے ''اے، وائی۔ کے۔ بی یوسف علی'' بھی لکھ دیتے تھے۔

ان کا نسبتاً سیدھا اور سادا نام ''عبداللہ یوسف علی'' ۱۹۲۰ کے عشرے سے عام استعمال کے لیے معروف ہوا۔ نوجوان یوسف علی کو مقام اور منصب سے جو دلچسپی تھی وہ کئی طرح سے ظاہر ہوتی ہے۔ جولائی ۱۸۹۱ء میں ان کے والد یوسف علی اللہ بخش کا انتقال ہو جاتا ہے اور اسی سال اکتوبر میں عبداللہ یوسف علی اپنے والد کے پیشے کا ذکر بطور ''سابق سرکاری انسپکٹر پولیس'' کرتے ہیں۔ پھر نومبر کے مہینے میں انہیں ''ڈپٹی کمشنر'' اور ۱۸۹۴ء میں ''میونسپل کمشنر'' لکھتے ہیں۔(۶) حیرت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء میں شائع شدہ ہندوستانی شخصیات کی سوانحی ڈائریکٹری میں عبداللہ یوسف علی کے تذکرے میں ان کے والد کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔ ''شیخ یوسف علی شجاع الدین خان بہادر، سورت میونسپلٹی کے ایک ممتاز رکن''(۷)۔ جب خود یوسف علی کا ۱۹۵۳ء میں انتقال ہوا تو ایک تعزیتی نوٹ میں ان کے والد کا ذکر سورت میونسپلٹی کے سابق ''چیئرمین'' کی حیثیت سے کیا گیا۔(۸)

داؤدی بوہرہ جماعت کی مرکزی دینی درس گاہ ''جامعہ سیفیہ'' سورت شہر ہی میں واقع

Marfat.com

تھی، مگر یوسف علی اللہ بخش نے اپنے بیٹے کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ عبداللہ یوسف علی کو اولاً بمبئی میں انجمن اسلام کی قائم کردہ نئی درس گاہ میں بھیجا گیا اور بعد ازاں ایک مشنری سکول میں داخل کیا گیا جس کا نام اس کے بانی جان ولسن سے منسوب تھا جو سکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے۔ عبداللہ یوسف علی ولسن سکول میں ۱۸۸۲ء میں داخل ہوئے۔ گویا وہ بمشکل آٹھ نو برس کے ہوں گے جب انہیں گھر سے دور روانہ کر دیا گیا۔ (۹)

عبداللہ یوسف علی نے جن دو سکولوں میں تعلیم حاصل کی، ان کے مزاج میں واضح فرق تھا۔ انجمن کے سکول کا مقصد ''محمڈن کمیونٹی کی ترقی اور اس کی تعلیمی، اخلاقی اور سماجی حالت میں کچھ بہتری کی صورت پیدا کرنا'' تھا۔ (۱۰) اس منصوبے کے پس پشت جو لوگ تھے ان میں محمد علی روگے، جو جہاز سازی کی صنعت سے وابستہ تھے، اور طیب جی برادران یعنی قمر الدین اور بدر الدین شامل تھے جو بمبئی کے پہلے مسلمان وکیل اور بیرسٹر تھے۔

سیاسی آزادی کے واحد مظہر کے طور پر جو مسلمانوں کو اس وقت میسر تھی انجمن اسلام' پورے جوش و جذبہ کے ساتھ عثمانی خلافت کی طرف دار تھی۔ ۷۷-۱۸۷۶ء میں روس اور ترکی کے درمیان ہونے والی جنگ میں انجمن نے عثمانیوں کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے جلسے کیے اور ایک بار موقع پر دیکھتے دیکھتے بیس ہزار روپے جمع کر ڈالے۔

'انجمن' کے سکول کا آغاز ۱۸۸۰ء میں ستمبر کے مہینے میں ہوا۔ اس کے لیے بمبئی کی حکومت کو سخت محنت و تگ و دو اور بار بار کی درخواستوں کے بعد ہی قائل کیا جا سکا کہ مسلمانوں کو اپنی فلاح اور شناخت کے لیے بچوں کے ایک الگ سکول کی ضرورت ہے۔ سکول کے افتتاح کے بعد پہلے ہفتے میں ۵۰ بچے سکول میں داخل ہوئے لیکن بہت تیزی سے بڑھتے ہوئے جلد ہی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ بدر الدین طیب جی نے اپنے آپ کو سکول کے کاموں کے لیے وقف

Marfat.com

کر دیا تھا اور وہ ذاتی طور پر اسکول میں ہونے والے ترقیاتی کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ سکول کے دوسرے بچوں میں طیب جی کے دو بیٹوں کے علاوہ محمد علی جناح، جن کا نام اس وقت جناح بھائی تھا، بھی شامل تھے۔ سکول میں ذریعۂ تعلیم اردو اور انگریزی تھا لیکن اردو کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کرنا اس لیے اہم تھا کہ گو مغربی ہندوستان کی غالب اکثریت کی زبان آج بھی گجراتی ہے لیکن اردو کی تدریس انجمن کے اس دعوے کے حوالے سے ضروری تھی کہ مسلمان بچوں کو علیحدہ اسکول کی ضرورت ہے اور اردو جو مسلمانوں کی زبان ہے اس کی تدریس عام سکولوں میں ممکن نہیں۔

برطانوی طرز کی تعلیم بھی سکول کے قیام کے بنیادی مقاصد میں شامل تھی کہ جدید تعلیم کے بغیر بہت کم مسلمان بچے تعلیم کے اعلیٰ مرحلوں میں کامیاب قرار ہو پاتے تھے۔ یوسف علی اور جناح دونوں کے دلوں میں طیب جی کی شخصیت کا احترام اور محبت کا جذبہ ہمیشہ برقرار رہا۔ جب ۱۹۰۶ء میں طیب جی کا لندن میں انتقال ہوا تو یوسف علی جنازے میں موجود تھے۔ اس وقت انہوں نے ایک پرسوز خطاب میں ان دنوں کو یاد کیا جب وہ انجمن اسلامیہ سکول میں ان کے زیر سایہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ (۱۱) جناح نے بھی سکول کو ہمیشہ یاد رکھا اور اپنی وصیت میں جو ۱۹۳۹ء میں تحریر کی گئی طے کیا کہ ان کی املاک میں سے کچھ اثاثے سکول کے نام وقف کر دیے جائیں۔ (۱۲)

انجمن کا مقصد اور اس کا مشن روشن خیالی، ترقی پسندی اور آگے بڑھنے کے جذبے سے عبارت تھا اور اس کی قیادت کی کوششیں ہمیشہ بمبئی کی مسلمان کمیونٹی کی مختلف فرقوں اور جماعتوں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے پر مرکوز رہیں۔

بدرالدین طیب کے مطابق ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد مختلف عقائد اور طرز فکر

Marfat.com

رکھنے والے مسلمانوں کو جن میں سنی، داؤدی بوہرہ، سلیمانی بوہرہ، اور خوجہ مسلمان سب شامل تھے، اس طرح متحد اور یکجا کرنا تھا کہ ان سب کا بنیادی نعرہ صرف اسلام ہو اور بعد میں پیدا ہونے والے اختلافات اور نزاعات علیحدہ رکھ دیے جائیں۔ (۱۳) چنانچہ انجمن ایسے کاموں اور مشاغل کا مرکز بن گئی جس میں مذکورہ فرقوں کے اکثر لوگ شامل تھے۔ اس نئی تعمیری روایت کے قیام اور استحکام میں عبداللہ یوسف علی، جناح اور انجمن کے کارخانے سے نکلے ہوئے دوسرے لوگ شامل تھے جن میں ایک نام اکبر حیدری کا بھی ہے جو پہلے ہندوستانی اکاؤنٹنٹ جنرل مقرر ہوئے اور جنہوں نے حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

بدرالدین طیب جی ہائی کورٹ کے جج اور انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنے جو ایک ایسی سیاسی جماعت تھی جس کی وساطت سے ہندوستان کے جذبۂ آزادی کا سب سے پہلے اظہار ہوا۔ بمبئی کے خوش حال اور پُر اعتماد مسلمانوں کی فطری خواہش تھی کہ آزادی کی جدوجہد کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی تعاون پیدا کیا جائے۔ شمالی ہندوستان میں سر سید احمد خاں اور بنگال میں سید امیر علی اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ وہ دونوں اس ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں محتاط رویہ رکھنے کے حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی مفادات برطانیا سے اشتراک میں مضمر ہیں، اور مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے خصوصی گارنٹی درکار ہے۔ (۱۴) یہ ایک انتہائی پیچیدہ اور شدت سے جاری رہنے والا وہ سیاسی مباحثہ تھا جو عبداللہ یوسف علی کی نسل میں بھی جاری رہا۔

یوسف علی اللہ بخش نے اپنے بیٹے کو انجمن کے سکول میں زیادہ عرصے تک رہنے نہیں دیا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے خیال میں سیاسی مناقشہ سکول کے تعلیمی معیار پر برا اثر ڈالے گا یا پھر پولیس سروس میں ان کے افسر اور دوست فریڈرک لٹی کے کہنے پر انہوں نے اپنے بیٹے کو انجمن

Marfat.com

کے سکول سے ہٹانے کا فیصلہ کیا ہو۔ بہر حال عبداللہ یوسف علی کا داخلہ فری چرچ آف سکاٹ لینڈ کے سکول میں کرا دیا گیا۔ یہ آسانی سے اس طرح ممکن ہوا کہ للّی کی بیوی پونا میں اس چرچ سے وابستہ ایک مشنری کی بیٹی تھیں۔(۱۵) اس طرح عبداللہ یوسف علی انجمن اسلامیہ سکول کی گھریلو فضا اور ماحول سے اسکاٹش سکول کے انتہائی نظم وضبط والے ماحول میں منتقل ہو گئے۔ یوسف علی کا نیا سکول صرف اس کے بانی ریورنڈ جون ولسن کے نام سے ہی منسوب نہیں تھا بلکہ اس کا پورا ماحول اپنے بانی کی شخصیت کے اوصاف کی چھاپ رکھتا تھا۔ جون ولسن ایک قابل ذکر ماہر لسانیات تھے جن کو مغربی ہند کے قدیم آثار سے گہری دلچسپی تھی اور جنہوں نے بائبل کا مرہٹی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔(۱۶) عبداللہ یوسف علی نے پندرہ برس کی عمر تک اس سکول میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸۸۷ء میں میٹرک کیا۔ اس کے بعد اس کے سینئر سیکشن یعنی ولسن کالج میں داخل ہوئے جس کا الحاق بمبئی یونیورسٹی سے تھا۔

عبداللہ یوسف علی پیدائشی طور پر اپنی عمر سے کہیں آگے تھے۔ ابتدائی عمر سے ہی تعلیمی ادارے ان کا حقیقی گھر بن گئے تھے۔ ہوسٹل یا کالج کی ہر تقریب ان کے لیے دلچسپی اور مشغولیت کا سامان تھی۔ اس طرح کی تربیت اور پرورش نے عبداللہ یوسف علی کو قبل از وقت ہی متین اور پختہ کار کر دیا تھا۔

ریورینڈ میکی شن نے، جنہوں نے جون ولسن کا شروع کیا ہوا بائبل کا مرہٹی ترجمہ مکمل کیا تھا، کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے یوسف علی کو جو توصیفی سند لکھ کر دی وہ چھوٹی سے چھوٹی باتوں کا انتہائی باریک بینی سے اہتمام کرنے والے اٹھارہ سالہ نوجوان کی شخصیت کو اس طرح بیان کرتی ہے: ''میں عبداللہ یوسف علی کو کئی سال سے جانتا ہوں۔ یہ واقفیت ان کے سکول اور یونیورسٹی کے پورے زمانۂ تعلیم کو محیط ہے۔ مجھے انتہائی خوشی ہے کہ اس امر کی تصدیق کروں کہ یوسف علی نے

Marfat.com

اپنی ذاتی اور طالب علمانہ زندگی میں ہمیشہ انتہائی اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔''(۱۷)

یہ اس نوجوان طالب علم کے عزم راسخ کی شہادت ہے جس نے عام سے خاندانی پس منظر کا حامل ہونے کے باوجود اپنی جدوجہد اور محنت سے ہر اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا جس کا اس کو زندگی کے سفر میں سامنا کرنا پڑا۔

عبداللہ یوسف علی کے زمانہ طالب علمی کے ایک عشرہ کے بعد کالج سٹاف کے ایک رکن کا بیان اس فضا کی تھوڑی سی نشان دہی کرتا ہے جو وہاں موجود تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ ''ولسن کالج کے طلبہ اس وقت بمبئی کے سادگی پسند گروپ سے تعلق رکھتے تھے جبکہ سینٹ زیویر (St. Xavier) اور ایلفنسٹن (Elphinstone) کے طلبہ نسبتاً خوش حال طبقے سے ہوا کرتے تھے۔ ہمارے اکثر طالب علم کونکن کے دیہی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے چیپوان برہمن تھے۔ خاصی تعداد میں گجراتی، سندھی، پارسی اور چند ایک مسلمان بھی تھے۔ اور اکا دکا یہودی اور عیسائی یا اینگلوانڈین پس منظر رکھنے والے طالب علم بھی کالج میں تھے۔ یہ سب انتہائی محنتی طلبہ تھے اور ان کی توجہ اور سرگرمیاں امتحانات میں کامیابی پر مرکوز رہتی تھیں''۔(۱۸)

عبداللہ یوسف علی کے اپنے خاندان کے ساتھ گزرے ہوئے چند سال ان کا بڑا قیمتی اثاثہ تھے۔ کافی عرصے کے بعد جب وہ عمر کے درمیانی مرحلے میں تھے ان کی ایک تحریر کے بعض فقروں سے ان ایام کے جلد گزر جانے کے احساس اور اس سے وابستہ جذباتی تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میری چار پانچ سال کی عمر ہوگی کہ میں نے قرآن کے عربی الفاظ کو پڑھنا سیکھا اور ان الفاظ کے لحن وترنم سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ الفاظ کے معانی کو سمجھنے اور سمجھ کر حیرت میں ڈوب جانے کا احساس ہوا۔ مجھے اپنے ''ختم قرآن'' کے سلسلے میں ہونے والی تقریب تھوڑی

Marfat.com

تھوڑی یاد ہے، جس کے ساتھ قرآن کی تعلیم کا ابتدائی سلسلہ مکمل ہو گیا تھا۔ میرے والد محترم نے مجھے عربی زبان کی تعلیم تو دی ہی تھی، لیکن میرا یقین ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت سے میں نے اپنی دل کی گہرائیوں میں کچھ اور بھی جذب کیا ہوگا۔ یعنی یہ حقیقت کہ دنیا کی ساری خوبصورت زبانیں اور ان کا ادب صرف اس ناقابلِ اظہار پیغام کو قلب و روح میں منتقل کرنے کا وسیلہ ہے جو وجدانی مسرت کے نادر لمحوں میں خود بخود قلب میں اتر آتا ہے''۔ (۱۹)

اس قسم کے سوانحی حوالے ان کی مطبوعہ تحریروں میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے بارے میں منفرد قسم کی خاموشی ان کی جذباتی زندگی کے خلا کی بڑی نمایاں شہادت ہے۔ (۲۰)

اوائل عمر سے اختیار کردہ منظم زندگی اور ادھورا سا بچپن عبداللہ یوسف علی کی زندگی پر اور بھی کئی گہرے نشانات چھوڑ گیا۔ اس کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب کسی نے ان کی طرف مخلصانہ دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے اعتدال کی ہر روش کو نظر انداز کر کے اس کی توصیف میں حد درجہ فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ اس پیچیدہ حساس طبعی کا اشارہ ان کی اس تحریر میں ملتا ہے جو انہوں نے اپنے کیمبرج کے ایک استاد سر رولینڈ ولسن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقم کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''بدلتی ہوئی دنیا کے رنگین مناظر کے دوران میری ان سے ۲۸ طویل برسوں کی شناسائی اور ذاتی اور اجتماعی زندگی کے حوالے سے ان سے بارہا کی ہوئی گفتگوئیں، ان کا مجھ پر اعتماد اور ہمارا باہمی احترام اور خلوص کا رشتہ، یہ سب تجربات میری زندگی کا عزیز ترین خزانہ اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ خدا ان کی روح کو اپنی رحمت سے نوازے''۔ (۲۱)

آزادی اور خود مختاری اگر اوائل عمر میں مل جائے تو اکثر مزاج میں ایک قسم کی لچک بھی پیدا کر دیتی ہے جو صدمے سے جلد بحال ہونے میں مدد دیتی ہے۔ لیکن عبداللہ یوسف علی کا معاملہ

Marfat.com

ذرا مختلف تھا۔ وہ شدت احساس کے زیر اثر اکثر مواقع پر زود رنج نظر آتے ہیں۔ اگر چہ عوامی حلقوں میں ان کی شخصیت دلکش و دل پذیر تھی لیکن ان کے دوست اور ساتھی ان کو بار ہا معمولی سی بات پر ناراض ہو جانے والے ایک حساس شخص کی طرح دیکھتے تھے۔ اگر ان کو کبھی یہ احساس ہوتا کہ ان کی بات کو صحیح سمجھا نہیں گیا ہے تو ان کو یوں محسوس ہوتا گویا ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے لیکن جب کبھی ان پر اعتماد کیا جاتا اور ان کو کسی خصوصی حلقے میں شرکت کے لائق سمجھا جاتا تو جلد ہی پوری طرح مطمئن اور خوش ہو جاتے تھے۔

ولسن کالج سے تعلق رکھنے والے Free Presbyterian چرچ کے مبلغین انجمن اسلامیہ کے قائدین کی طرح صاحب کمال لوگ تھے۔ مثلاً میکی ہان (Mackichan) نے گلاسگو یونیورسٹی میں طبعیات (فزکس) کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، جہاں اُن کے استاد لارڈ کیلون (Lord Kelvin) نے انہیں اپنے ایجاد کردہ Kelvin electrometers میں سے ایک آلہ تحفتاً دیا تھا۔ جوانہوں نے ولسن کالج کی فزکس کی معمل (لیبارٹری) کو بطور عطیہ دے دیا تھا۔ اس کا تذکرہ اُن کی وفات کے حوالے سے کرتے ہوئے عبداللہ یوسف علی نے لکھا ہے:

''ان طلبہ کے دلوں میں جنہیں ان کے قدموں میں بیٹھنے کا موقع ملا، اور جس شرف کے حاصل کرنے والوں میں میں بھی تھا، میکی ہان کی یاد بہت عزیز رہے گی اور یہ یاد ان طلبہ کی عملی و جذباتی زندگی کے لیے ہمیشہ سرچشمۂ فیض رہے گی۔'' (۲۲)

بہر طور ولسن کالج کا مقصد دوسرے مشنری سکولوں کی طرح ایسے پر جوش طالب علم پیدا کرنے سے کچھ زیادہ ہی تھا جن کا واحد مدعا امتحانات میں امتیازی کامیابی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ میکی ہان کے اپنے الفاظ میں '' کالج ان مقاصد کی تکمیل کرتا ہے جو ہندوستان کے مذہبی ذہن سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ اساتذہ اور طلبہ زندگی کے اصل حقائق کے حوالے سے جو

Marfat.com

رابطہ اور تعلق کالج میں قائم کرتے ہیں وہ ہمارے ان نوجوان طلبہ و طالبات کی زندگی پر دور تک اثر انداز ہوگا اور موجودہ نسل کی اخلاقی اور روحانی زندگی کو ایک بلندتر معیار اور اسلوب عطا کرے گا۔''

بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے الفاظ میں جو یوسف علی کے زمانۂ طالب علمی میں اس منصب پر فائز تھے زندگی کی اعلیٰ اقدار کی حقیقت کچھ یوں تھی۔ وہ فرماتے ہیں: ''مشیت ایزدی نے ہندوستان کے لوگوں کا ربط و تعلق یورپ کی ایک ایسی قوم سے پیدا کر دیا ہے جو انتہائی متحرک، ترقی پسند اور جرأت آزما واقع ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسی قوم ہے جس کا وجود ہی آزادیٔ فکر اور کھلے اور عام بحث و مباحثہ کا مرہونِ منت ہے۔ یہ قوم، اپنی ان خصوصیات کی بنا پر اُن تمام لوگوں کو متاثر کرتی ہے جو اس کے دائرۂ اثر میں آتے ہیں۔ ہم نے عمداً اور بغیر کسی تردد اور تامل کے ہندوستان کے نوجوان طبقہ کو اپنی تاریخ اور ادب پڑھنے کی دعوت دی ہے۔ ہم نے ان کے ذہنوں میں اپنے افکار منتقل کیے ہیں اور اپنے آپ کو تقلید کے لیے ایک قابل قدر مثال کے طور پر پیش کیا ہے''۔ (۲۴) اس برتر ذہنی رویے کی موجودگی میں نوجوان مسلم طلبہ کے لیے ترک و اختیار کے انتہائی دشوار مسائل سامنے آ گئے تھے۔ جن طلبہ میں اپنے دین و مذہب اور تہذیب کے حوالے سے یقین و اعتماد کی کمی تھی وہ ان نئے آقاؤں کے نمونے اختیار کر لیتے تھے۔ لیکن عبداللہ یوسف علی کو انجمن کے سکول کے دنوں میں ایک بنیاد فراہم ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں وہ اس انگریزی تہذیبی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے نسبتاً بہتر ساز و سامان سے مسلح تھے۔

ولسن سکول میں یوسف علی کا تعلیمی ریکارڈ بڑا شاندار تھا۔ ۱۴ برس کی عمر میں وہ بمبئی بھر میں میٹرک کے امتحان میں اول آئے۔ جنوری ۱۸۹۱ء میں انہوں نے بمبئی یونیورسٹی سے (غالباً کلاسیکی علوم میں) بی۔ اے کی سند فرسٹ کلاس میں حاصل کی، کیونکہ اس سند کی بنیاد پر انہیں Latin Prize دیا گیا۔ ان کے اپنے پرانے کالج میں ان کا تقرر ''ڈکشنا فیلوشپ برائے

Marfat.com

تاریخ یونان'' پر ہو گیا۔ (۲۵)

بعد ازاں عبداللہ یوسف علی کو بمبئی گورنمنٹ کا وہ وظیفہ حاصل ہو گیا جس کا آغاز ۱۸۶۸ء میں ایک سکیم کے ماتحت ہوا تھا اور جس کے ذریعے ہر سال نو طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ بھیجا جاتا تھا۔ یہ لائق طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنا میدان تخصص منتخب کرنے میں بالکل آزاد تھے۔ ہر طالب علم جس کو یہ وظیفہ ملتا تھا سالانہ دوسو پونڈ کا مستحق سمجھا جاتا تھا، جو طالب علم کے برطانیہ میں داخلے کے دن سے شروع ہو کر تین سال تک جاری رہتا تھا۔ (۲۶)

خان بہادر اللہ بخش کا انتقال جولائی ۱۸۹۱ء میں ہوا جس کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے کے لیے ہندوستان میں اپنے خاندان سے روابط خاصے کم ہو گئے۔ ستمبر ۱۸۹۱ء میں عبداللہ یوسف علی برطانیہ پہنچے تو ان کی عمر ابھی ۲۰ برس نہیں ہوئی تھی۔ یقیناً یہ ایک دشوار گزار مرحلہ ہو گا کہ اس کم عمری میں اپنے عزیز اور محترم والد کے انتقال کا صدمہ اٹھانے کے چند ماہ بعد ہی وہ ایک اجنبی ماحول میں تن تنہا آ پہنچے تھے۔ سول سروس کے ریکارڈ کے مطابق ''بمبئی گورنمنٹ کے اسکالر عبداللہ کے۔بی۔ یوسف علی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ میری ان سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ برائٹن میں مقیم ہیں۔ لیکن ان کو لکھا گیا ہے کہ وہ ہمیں اپنے لندن آنے کے بارے میں مطلع کریں تاکہ ضروری انتظامات کیے جا سکیں''۔ (۲۷)

عبداللہ یوسف علی نے کیمبرج کے سینٹ جانز کالج میں پڑھنا پسند کیا۔ داخلے کی درخواست کے ساتھ جو تصدیقی اسناد شامل تھیں ان میں سے ایک اپنے سابقہ پرنسپل میکی ہان کی اور دوسری حسن عبدالعلی کی تھی۔ حسن عبدالعلی نے اپنا سفارشی خط ''نیشنل لبرل کلب'' کے نوٹ پیڈ پر تحریر کیا تھا، جس میں لکھا تھا: ''ذاتی واقفیت کی بنیاد پر مجھے عبداللہ کے۔بی۔ یوسف علی کے بارے میں اس امر کی تصدیق کرتے ہوئے انتہائی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ عبداللہ یوسف علی اعلیٰ ذاتی

Marfat.com

اخلاقی اوصاف کے مالک ہیں اور بمبئی یونیورسٹی کے ایک ممتاز گریجویٹ ہیں (۲۸)۔ یہ امر دلچسپی کا حامل ہے کہ ۱۹۱۳ء میں عبداللہ یوسف علی خود اس کلب کے رکن بن گئے۔

عبداللہ یوسف علی نے سینٹ جانز کالج میں ۱۸۹۱ء کی مائیکل ماس ٹرم سے قانون کی تعلیم کا آغاز کیا۔ ۱۸۹۵ء میں انہیں اچھے سیکنڈ ڈویژن میں ٹرائی پوس (Tripos) کی ڈگری دی گئی۔ وہ ۱۸۹۴ء کے پارٹ ون کے امتحان میں ساتویں پوزیشن پر رہے اور پارٹ ٹو کا امتحان انہوں نے ۱۸۹۵ء میں سیکنڈ ڈویژن میں چوتھی پوزیشن حاصل کر کے پاس کیا۔

اس زمانے میں کسی نوجوان کے لیے سب سے اعلیٰ اور قابل رشک مقام آئی سی ایس (انڈین سول سروس) میں داخل ہونا تھا۔ یہی وہ طبقہ تھا جو دراصل ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا۔ لارڈ میکالے جس کی رائے ہندوستان سے متعلق تمام امور میں وکٹورین انگلینڈ کے مقدس فرمان کی سی ہوتی تھی، کا کہنا تھا کہ آئی سی ایس میں داخلے کے امتحان کا مقصد ان لوگوں کا انتخاب کرنا تھا جنہوں نے انتہائی اعلیٰ درجے کی وہ لبرل تعلیم حاصل کی ہو جو برطانیا میں حاصل ہو سکتی تھی۔ اس طرح انڈین سول سروس میں داخلے کا معیار بہت اعلیٰ تھا، اور بدنیتی پر مبنی یہ کوشش بھی کی جاتی تھی کہ کسی طرح ہندوستانی نوجوانوں کو اس مقابلے میں شرکت سے محروم رکھا جائے۔ اس امر کا اشارہ لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے ان فقروں میں بھی ملتا ہے جو ۱۹۰۰ء میں کہے گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا: ''مجھے کسی دن آپ لوگوں کو مخاطب کر کے ایک عظیم خطرے سے آگاہ کرنا ہی ہو گا۔ ہندوستان میں ۹۰۰ سے زیادہ ایسے سرکاری مناصب ہیں جن کے متعلق یہ باور کیا جاتا ہے کہ وہ خالصتاً یورپ کے لوگوں کے لیے مخصوص ہونے چاہییں، مگر آہستہ آہستہ یہ مناصب ہندوستانی نوجوان اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنیاد پر حاصل کرتے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ہماری انتظامیہ کے لیے ایک خطرے کا نشان ہے''۔ انڈین سول سروس میں ہندوستانی لڑکوں کے داخلے کا طریقہ

خاصا دشوار تھا۔اس طریق کار میں ہندوستانی طلباء کے لیے محدود تعداد میں تین سالہ مدت کے لیے تعلیمی وظیفے،زیادہ سے زیادہ ۲۲ سال عمر کی حد اور لندن آکر امتحان دینے کی پابندی شامل تھی۔ ان تمام مشکلات کے باوجود، یا شاید انہی مشکلات کی وجہ سے، آئی۔سی۔ایس عبداللہ یوسف علی اور محمد علی جوہر جیسے ذہین نوجوانوں کی ایک فطری منزل کے طور پر موجود رہی۔

عبداللہ یوسف علی نے اگست ۱۸۹۴ء میں ہونے والے مقابلہ کے امتحان کے لیے درخواست دی تو وہ ۳۵ تھامپسن لین، کیمبرج میں قیام پذیر تھے،لیکن کالج کے باقاعدہ طالب علم نہ تھے۔ان کے کالج کے ٹیوٹر ریورنڈ جے ٹی وارڈ نے اس درخواست پر ان کی ذات اور خصوصیات کے بارے میں ریفرنس لکھا۔عبداللہ یوسف علی نے انگریزی انشا پردازی میں اول آکر اور رومن اور انگریزی قانون کے پرچوں میں امتیازی مقام حاصل کر کے اپنی خداداد صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔آئی سی ایس کے امتحان میں کامیابی کے دو مرحلے ہوتے تھے اور پہلے مرحلے میں منتخب امیدواروں کو اگلے سال ستمبر میں فائنل امتحان دینا پڑتا تھا۔اس درمیانی وقفے میں ایک منظور شدہ یونیورسٹی یا کالج میں تعلیم حاصل کرنا ہوتی تھی۔اگرچہ بمبئی حکومت نے عبداللہ یوسف علی کو جو وظیفہ دیا تھا، وہ اس مدت کے لیے ناکافی تھا،مگر انہوں نے اپنی مالی مشکلات پر قابو پاتے ہوئے یہ عبوری مدت اپنی روایتی محنت سے کیمبرج سے قانون میں ٹرائی پوس کا دوسرا حصہ مکمل کرنے اور یونیورسٹی کالج لندن میں آئی۔سی۔ایس کے فائنل امتحانات کی تیاری اور بار (Bar) میں داخلہ کی تیاری کے لیے استعمال کیا۔

امتحانات کے دوسرے راؤنڈ میں زیادہ تر مضامین ہندوستان میں ان کے کام سے متعلق تھے۔اس میں تین لازمی مضامین شامل تھے (۱) انڈین پینل کوڈ اور کریمنل پروسیجر کوڈ یعنی قوانین تعزیرات اور ضابطۂ فوجداری ہند (۲)، اردو اور (۳) برطانوی ہند کی تاریخ۔اس کے علاوہ کئی

اختیاری مضامین کا امتحان بھی دینا پڑتا تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے سول پروسیجر کوڈ اور انڈین کنٹریکٹ ایکٹ کے مضامین کا انتخاب کیا۔ اس کے علاوہ عربی زبان اور گھڑ سواری کو امتحان کے لیے شامل کر لیا۔ وہ تمام امیدواروں میں اول رہے۔ بالخصوص مختلف زبانوں میں ان کی کامیابی امتیازی تھی۔ ۴۰۰ نمبر کے پرچوں میں اردو میں ان کے نمبر ۳۸۵ اور عربی میں ۳۴۰ تھے۔(۳۱) ان کو اکتوبر ۱۸۹۵ء میں کامیابی کے بارے میں اطلاع دی گئی اور انڈیا آفس نے ان کا تقرر شمال مغربی ہندوستان کے صوبہ جات آگرہ اور اودھ میں کر دیا، جو بعد میں یونائٹڈ پروونسز (یو۔پی) کے نام سے زیادہ معروف ہوا۔ گو عبداللہ یوسف علی نے اپنی ترجیح بمبئی پریزیڈنسی کے لیے ظاہر کی تھی۔

ہندوستان واپسی کا سفر دو مرحلوں میں مکمل ہوا۔ پہلے چھوٹے سمندری جہاز سے اٹلی کے ساحلی شہر برینڈیسی تک اور پھر وہاں سے بڑے سمندری جہاز میں بمبئی تک۔ عبداللہ یوسف علی کی خواہش تھی کہ سال کے اواخر تک واپسی کو مؤخر کر دیا جائے۔ سفر کے بندوبست میں تبدیلی کا نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ برینڈیسی تک خشکی کے راستے سفر ہو، اس میں اخراجات کے فرق کے مسئلے پر حکام سے کچھ اختلافات درپیش ہوئے۔ ۵ نومبر ۱۸۹۵ء کو عبداللہ یوسف علی نے اپنا اولین خط انڈیا آفس کو لکھا۔ اس خط پر لکھنے والے کا پتا یوں درج ہے: ''۲۰۔ کیمپل اسٹریٹ، رسل اسکوائر'' اور خط کا مضمون یوں ہے:

''جناب عالی!

میں آپ کے یکم نومبر کے خط کے لیے شکرگزار ہوں۔ چونکہ حکومت برینڈیسی تک میرے خشکی کے راستے سفر کے اخراجات اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہے اس لیے میں یہ دریافت کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ کیا حکومت مجھے کچھ سفری الاؤنس دے گی جس سے میرے ریل کے ٹکٹ کے کچھ اخراجات نکل آئیں۔

Marfat.com

میں یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے لندن سے ۲۷ دسمبر سے پہلے روانہ ہونا ممکن نہیں ہے۔اس کا سبب میں نے پہلے اس وقت انڈیا آفس کو بتا دیا تھا جب میں نے ہندوستان میں اپنی ڈیوٹی پر رپورٹ کرنے کی مدت میں توسیع کی درخواست کی تھی۔اگر میں ۲۹ دسمبر کو روانہ ہو کر پورا سفر بحری راستے سے کرتا ہوں تو ہندوستان بروقت نہ پہنچ سکوں گا۔یہی وہ سبب ہے کہ میں خشکی کے راستے سفر ضروری خیال کرتا ہوں۔

لیکن بہر صورت میں اطاعت اور وفاداری کے تقاضے کے مطابق انڈیا آفس کے فیصلے کی پابندی کروں گا جو ریلوے کے سفر کے اخراجات کے بارے میں کیا جائے گا۔

آپ کا وفادار

عبداللہ ابن یوسف علی

اس خط سے کسی حد تک اس احترام کے رشتے کا اظہار ہوتا ہے جو برطانیا اور عبداللہ یوسف علی کے مابین موجود تھا۔(۳۲) عبداللہ یوسف علی کے سفر کی تیاری میں تاخیر لنکنز ان میں رسمی اور ضابطے کی کارروائی کی تکمیل کی وجہ سے ہوئی تھی۔(۳۳)

عبداللہ یوسف علی کے برطانیا میں گزرے ہوئے چار سال ہر اعتبار سے نہایت دلچسپ، اطمینان بخش اور نتیجہ خیز تھے۔کیمبرج میں اپنی تعلیمی زندگی کے ایام ان کو ہمیشہ بہت عزیز رہے۔وہ لکھتے ہیں: ''جو چند سال میں نے وہاں گزارے انہوں نے مجھے ایک سچا اور حقیقی طالب علم بنا دیا۔ میرے اندر علم کی سچی پیاس، ورلگن پیدا کر دی اور کتب کے مطالعہ کا ذوق پیدا کیا''۔(۳۴)

اس دوران، انہوں نے بعض اہم واقعات کا مشاہدہ بھی کیا، مثلاً انہیں سنٹرل فنسبری (Central Finsbury) سے لبرل ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے کے بعد دادا بھائی نوروجی کی برطانوی پارلیمنٹ میں پہلی تقریر سننے کا موقع ملا۔علاوہ ازیں ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کی

تیاریاں اور اس کا تزک و احتشام بھی دیکھا۔

اس زمانے میں ہندوستانی باشندے برطانیا میں خال خال ہی نظر آتے تھے اور استعجاب اور تجسس سے دیکھے جاتے تھے۔ گفتگو اور ملنے جلنے میں تہذیب اور متانت کا ماحول پایا جاتا تھا۔ نسلی عصبیت کا کوئی خاص مظاہرہ مشاہدے میں نہیں آتا تھا۔ عبداللہ یوسف علی جب برطانیا پہنچے تو ان کی عمر کم تھی۔ چنانچہ ان کے لیے ایک نگران تلاش کیا گیا۔ اس گارجین کی فراہمی میں غالباً ان کے والد کے دوست Lely نے مدد کی تھی۔ یہ گارجین ایک مکمل انگریز عیسائی تھا۔ (۳۵) اس کے علاوہ بھی انہیں دو انگریزوں کی دوستی اور تعاون ملا جنھوں نے آنے والے سالوں میں ان کے ادبی اور علمی مشاغل میں ان کی مدد اور رہنمائی کی۔ ان میں ایک جارج برڈوڈ تھے جو ہندوستانی فنون کے ماہر تھے اور دوسرے رولینڈ نائی ویٹ (Roland Knyvet) تھے جو کیمبرج میں ہندوستانی قانون کے ریڈر تھے اور اس حوالے سے آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری میں بھی مدد کرتے تھے۔ (۳۶)

عبداللہ یوسف علی، محمد علی جناح اور محمد علی جوہر تقریباً ایک دوسرے کے معاصر تھے۔ اگرچہ آگے چل کر وہ تینوں مسلم فکر کے مختلف زاویوں کے نمائندے اور ترجمان ہو گئے لیکن ایک وقت ایسا بھی گزرا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے نعم البدل نظر آتے تھے۔ یہ سب انگریزی طرز و اسلوب کے دلدادہ، جمالیات کا ذوق رکھنے والے، فیشن اور لباس کی تراش خراش کا اہتمام کرنے والے نوجوان تھے۔ جوہر کی بھی خواہش تھی کہ وہ آئی سی ایس افسر بنیں، لیکن وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوئے اور دلچسپ امر یہ ہے کہ ہندوستان واپس آ کر انہوں نے یو۔ پی ہی میں سیاسی سرگرمیاں شروع کیں اور اسی انتظامیہ کے لیے راستے کا کانٹا بن گئے جس سے عبداللہ یوسف علی وابستہ تھے۔ (۳۷) محمد علی جناح، جنہوں نے ۱۸۹۳ء میں لنکز ان میں بحیثیت طالب علم داخلہ لیا تھا،

عبداللہ یوسف علی کے چند ماہ بعد فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ دوسروں کی طرح انہوں نے آئی سی ایس کی طرف کسی رغبت کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن ایک عجیب بات جو جناح کے اوائل شباب کی خواہش کے حوالے سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ شکسپیرین ڈرامہ کے اداکار بننا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے والد نے ان کی اس بے ہنگم خواہش پر ان کی سرزنش کی اور اس طرح وہ آئندہ زندگی میں زیادہ اہم اور عظیم تر کاموں کے لیے بچا لیے گئے۔

حواشی باب اول

۱- ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ واحد چیز جو آپ کو سربلند کرسکتی ہے، تعلیم ہے۔ جب تک ہماری قوم انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ پیدا نہیں کرتی، یہ پستی میں غرق رہے گی، دوسرے لوگوں سے نچلی سطح پر شمار ہوگی اور وہ عزت واحترام حاصل نہیں کرسکے گی جو میں اپنی قوم کے لیے چاہتا ہوں۔ یہ خیالات جو میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں میرے دل کی گہرائی میں موجود تھے''۔ سرسید احمد کی تقریر بمقام لکھنو، ۱۸ دسمبر ۱۸۸۷ء، ملاحظہ کیجیے اے۔ ایم۔ زیدی کی تالیف ''مسلم سیاسی فکر کا ارتقا'' (Evolution of Muslim Political Thought)

۲- مثلاً امیر علی کی تصنیف ''دی کریٹکل ایگزامینیشن آف لائف اینڈ ٹیچنگز آف محمد'' مطبوعہ ۱۸۷۳ء دراصل کلارک کی تصنیف ''ٹن گریٹ ریلیجنز'' کا جواب تھی۔ اس طرح سر سید نے ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' پر اپنے لندن کے قیام کے دوران میں ۱۸۶۹ء میں جواب تیار کیا تھا۔

۳- اے۔ اے انجینئر: ''دی بوہراز'' صفحہ ۱۴۷، اقتباس از گلزار داودی،

۴- اکتوبر ۱۸۹۱ء میں سینٹ جونز کالج کیمبرج میں داخلہ کی درخواست دیتے ہوئے عبداللہ یوسف علی نے اپنے والد کا نام یوسف علی اللہ بخش لکھا، جس سے پہلے قوسین میں مندرجہ ذیل عبارت تحریر تھی ''خان بہادر، خطاب جو ۱۸۸۵ء میں حکومت کی جانب سے دیا گیا۔'' والد کے منصب اور پیشہ سے متعلق کالم میں سابق گورنمنٹ انسپکٹر آف پولیس (ریٹائرڈ ۱۸۸۵ء) درج تھا۔

Marfat.com

جے وی۔ وین کی مرتب کردہ کیمبرج کے سابق طلبہ کی ڈائریکٹری (ایلمنائی کنیٹابرجینز) مطبوعہ ۱۹۵۴ء بتاتی ہے کہ ان کے والد سابق گورنمنٹ انسپکٹر آف پولیس تھے جن کا انتقال ۲۲ جولائی ۱۸۹۱ء کو ہوا۔

۵- IOL:L/P&J/381 فائل 1673: یوسف علی کی ۱۸۹۴ء میں آئی سی ایس کے امتحان میں شرکت کی درخواست فارم میں انڈیا آفس کے عملہ نے سرخ روشنائی سے تصحیح اور تبدیلی کی ہے۔

۶- عبداللہ یوسف علی نے لنکنز ان بار میں داخلہ کی درخواست نومبر ۱۸۹۱ء میں بھیجی تھی۔ اس میں اپنے کوائف عبداللہ خاں بہادر یوسف علی، خان بہادر یوسف علی کے فرزند ثانی لکھے، ساتھ ہی ان کو ڈپٹی کمشنر سورت دیش (یا ڈسٹرکٹ) بمبئی انڈیا بھی لکھا۔ ملاحظہ ہو رجسٹر داخلہ لنکنز ان 1893-1420 صفحہ ۴۳۷، ساتھ ہی ملاحظہ کیجیے ایضاً IOL:2/P&J/381 جہاں ان کے والد کا پیشہ میونسپل انڈین کمشنر درج ہے۔ جب عبداللہ یوسف علی نے ۱۹۰۰ء میں پہلی شادی کی تو شادی کے رجسٹر میں بھی ان کے والد کا نام اور پیشہ خان بہادر یوسف علی، میونسپل انڈین کمشنر ہی لکھا ہے۔

۷- یوسف علی کا نام "ہواز ہوان انڈیا" مطبوعہ نول کشور پریس لکھنو ۱۹۱۱ء۔ اس کے بعد کے زمانے کی ایک اور ڈائریکٹری "مسلمز ان انڈیا: اے بائیوگرافیکل ڈکشنری" جلد اول نومبر ۱۹۷۹ء میں ۱۹۱۶ء سے قبل کے ماخذوں کی اساس پر "شیخ یوسف علی شجاع الدین سورت کی معروف شخصیت" کا ذکر ملتا ہے۔

۸- روزنامہ اقدام لاہور ۲۷ دسمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۴ جس میں عبداللہ یوسف علی کے انتقال پر ملال کی خبر ریڈیو پاکستان کے حوالے سے شائع ہوئی۔ اس میں عبداللہ یوسف علی کے

Marfat.com

والد کو سورت کا ممتاز شاعر بھی کہا گیا ہے۔

۹- IOL/L/P&J/381 یوسف علی کا تذکرہ بعنوان ''۱۲ سال کی عمر کے بعد کے سکول'' پہلا نام بمبئی کے ولسن اسکول کا ہے جس کی تاریخیں ۱۸۸۲ء سے نومبر ۱۸۸۷ء تک درج ہیں۔ ۱۸۸۲ء کی تاریخ میں '۲' کے عدد کو ایک سوالیہ نشان کے ساتھ نشان زد کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ۱۸۸۲ء کے بجائے ۱۸۸۱ء ہے، جس وقت ان کی عمر ۹ برس کی ہوگی۔

ولسن کالج میں حاضری کی تاریخ ۱۸۹۱ء ہے۔ کیمبرج میں داخلے کی درخواست کے مطابق سکول یا سکولوں اور ماسٹرز کی تفصیل کچھ یوں ہے:

ولسن سکول اور ولسن کالج، جس کو فری جنرل اسمبلی کا ادارہ بھی کہا جاتا تھا، پرنسپل ریورینڈ ڈی۔ میکی شان، ایم۔ اے۔ ڈی۔ ڈی۔ سکول میں ۳ سال اور کالج میں ۴ سال، بی اے کی ڈگری بمبئی یونیورسٹی سے جنوری ۱۸۹۱ء میں حاصل کی جس کے بعد کالج کے فیلو کی حیثیت سے یونان کی تاریخ پڑھائی۔ گویا اس طرح یوسف علی کے ولسن سکول میں داخلے کی تاریخ ۱۸۸۴ء ہونی چاہیے نہ کہ ۸۲۔۱۸۸۱ء۔

۱۰- انجمن اسلام بمبئی کے بارے میں یہ تفصیل دو ذرائع سے حاصل کی گئی ہے۔

پہلا سی ڈوبن کی کتاب ''اربن لیڈرشپ ان ویسٹرن انڈیا'' اور دوسرا حسین بی طیب جی کی کتاب ''بدرالدین طیب جی۔ اے بائیوگرافی''۔

۱۱- طیب جی (ایضاً) صفحہ ۳۵۳۔ عبداللہ یوسف علی کی تقریر بحوالہ ''ٹائمز آف انڈیا'' ۸ ستمبر ۱۹۰۶ء۔ یوسف علی کے انجمن کے سکول میں حاضری کا ذکر ''قاموس المشاہیر'' کے صفحہ ۴۷۔۳۷ پر ملتا ہے۔

۱۲- ایس۔ والپورٹ کی تصنیف ''جناح آف پاکستان'' صفحہ ۶ اور صفحہ ۱۷۱۔ محمد علی جناح کی قانون کی پریکٹس کے ابتدائی دور میں بھی طیب جی بدرالدین کا حوالہ ملتا ہے۔ طیب جی بدرالدین کے بیٹے فیض نے ان کے ساتھ مل کر بمبئی کا مشہور 'وقف' کا مقدمہ لڑا تھا۔

۱۳- طیب جی۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۲

۱۴- ۱۸۷۷ء میں کلکتہ میں امیر علی کی قائم کردہ ''سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن'' کے بنیادی مقاصد میں ہندوستان کے مختلف مذاہب اور نسلوں سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان برادرانہ رشتے اور اچھے جذبات کی ترویج اور اس کے ساتھ ہی محمڈن افراد کے حقوق کی حفاظت اور ان کی سیاسی تربیت میں تعاون فراہم کرنا شامل تھا: ''جب تک اسلام کے پیروکار اپنے آپ کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے تیار نہیں کریں گے وہ اپنے ہندو ہم وطنوں سے پیچھے رہ جائیں گے''۔ ملاحظہ ہو ایس ایس اے رضوی کی تالیف ''اے سوشیو انٹلکچوئل ہسٹری آف اثنا عشری ان انڈیا'' جلد دوئم صفحہ ۴۳۲۔ امیر علی کی قائم کردہ ایسوسی ایشن دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکا میں قائم ہونے والی ''مسلم لیگ'' کی پیش رو تھی۔

۱۵- للّی (Lely) سورت میں کلکٹر اور مجسٹریٹ تھے اور عبداللہ یوسف علی کے والد کے دوست تھے۔ ملاحظہ ہو تعزیتی نوٹ ''دی ٹائمز'' ۲۶ نومبر ۱۹۳۴ء، للّی گجراتی اور مرہٹی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور روانی سے بول سکتے تھے۔

۱۶- ملاحظہ ہو۔ کے-ڈی-بی-کوڈرنگٹن کی تحریر ''برڈ ووڈ اینڈ دی اسٹڈی آف دی آرٹس آف انڈیا'' مطبوعہ دی جرنل آف دی رائل سوسائٹی آف آرٹس، فروری ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۵۰۔۱۳۵۔ جون ولسن کی شخصیت کا خاکہ جن کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ چھ مشرقی

زبانیں روانی سے بولتے تھے اور انہوں نے ہندوستان کے طول وعرض میں سفر کیا تھا۔اور انہیں اس امر میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں تھا کہ مغربی علوم کی تعلیم سے بہتر مقامی توہمات کو دور کرنے اور ان کے ذہنوں کو انجیل مقدس کے پیغام کے لیے کھولنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہوسکتا''۔ ولسن سکول جو بعد میں ولسن کالج ہو گیا تھا کے بارے میں اس باب میں جو معلومات درج ہیں وہ ''تھاٹس آن انڈین ایجوکیشن'' صفحہ ۱۷،۸ سے، ماخوذ ہیں۔

۱۷- میکی شان کا تحریر کردہ تصدیق نامہ جو گلاسکو سے ۵ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو سینٹ جانز کالج کیمبرج بھیجا گیا تھا۔

۱۸- ''تھاٹس آن انڈین ایجوکیشن'' ایضاً صفحہ ۱۹۔

۱۹- ''قرآن مجید، متن، ترجمہ اور تفسیر تیسرا ایڈیشن (۱۹۳۸ء)'' ملاحظہ کیجیے: پہلے ایڈیشن کا دیباچہ

۲۰- عبداللہ یوسف علی نے کیمبرج میں داخلہ کا فارم پُر کرتے ہوئے اس کالم کو قلم زد کر دیا جس میں والدہ کا پورا نام اور شادی سے پہلے کا خاندانی نام پوچھا گیا تھا۔ ۱۸۷۰ء کی دہائی میں سورت میں ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور غالباً اس میں عبداللہ یوسف علی کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ عبداللہ یوسف علی اس وقت غالباً ایام طفلی سے گزر رہے ہوں گے۔ عبداللہ یوسف نے اپنی کسی بھی تحریر میں اپنی والدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

۲۱- ملاحظہ ہو: دیباچہ۔ ولسن کی ''اینگلو محمڈن لا'' مطبوعہ ۱۹۲۰ء

۲۲- تعزیتی نوٹ ''دی ٹائمز'' ۲؍اپریل ۱۹۳۴ء

۲۳- ''تھاٹس آن انڈین ایجوکیشن'' صفحہ ۲۱

۲۴- ولیم ورڈز ورتھ ۱۸۹۰ء میں مختصر عرصے کے لیے بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے تھے۔''اے ہسٹری آف دی یونیورسٹی آف بامبے ۱۹۵۷۔۱۸۵۷ء صفحہ ۲۶۶'' از ایس آر ڈونگر کیری۔ اس کیفیت اور معانی کے حامل لارڈ میکالے کے یہ الفاظ بھی قابل ذکر ہیں: ''میں مشرقی علوم کو مستشرقین کی رائے کے مطابق پوری اہمیت دینے کے لیے تیار ہوں۔ میرے خیال میں ان میں سے کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ ایک اچھی یورپین لائبریری کے کسی ایک شیلف میں موجود کتابوں کی قدروقیمت پورے ہندوستان اور دنیائے عرب کے مجموعی لٹریچر کے برابر ہے''۔اقتباس ازکوڈرنگٹن۔ایضاً

۲۵- ''ہواز ہوان انڈیا'' ایضاً،مسلمز ان انڈیا۔اے بائیوگرافیکل ڈکشنری، ایضاً یونان کی تاریخ کے لکچرر کی حیثیت کے بارے میں حوالے کے لیے ملاحظہ کیجیے ضمیمہ VII ''دی ہولی قرآن'' ایضاً

۲۶- ''سلیکٹ ڈاکیومینٹس آن دی ہسٹری آف انڈیا اینڈ پاکستان'' جلد IV۔مرتبہ سی۔ایچ فلپس، دی ایولیوشن آف انڈیا اینڈ پاکستان۔ملاحظہ کیجیے سیکشن 'D' انڈیا نائزیشن آف دی سول سروس ۱۹۴۷۔۱۸۵۸ء گورنمنٹ آف انڈیا ریزولیوشن آف ۱۹ اگست ۱۸۶۷ء''۔

۲۷- IOL:/L/:P&J/6/306 ملاحظہ کیجیے ۲۳ ستمبر ۱۸۹۱ء کا نوٹ (۱۵۸۷ء)

۲۸- عبدالعلی کے خط کی تاریخ ۳ر اکتوبر ۱۸۹۱ء ہے۔

۲۹- ''سلیکٹ ڈاکیومینٹس آف دی ہسٹری آف انڈیا اینڈ پاکستان'' ایضاً لارڈ کرزن بنام لارڈ ہیملٹن ۲۳ر اپریل ۱۹۰۰ء۔ اولاً ہندوؤں نے ۱۸۸۴ء میں سول سروس میں

Marfat.com

شمولیت اختیار کرنا شروع کی۔ جبکہ مسلمانوں کو ۱۸۹۰ء تک ملازمت میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سول سروس میں انڈین شہریوں کی تقرری کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: IOL:P/9368 ''دی رائل کمیشن آن دی پبلک سروسز ان انڈیا''۔

۳۰- IOL:2/Pand J/6/407، فائل نمبر ۱۸۵۶ میں عبداللہ یوسف علی کے تعلیمی ریکارڈ کی مکمل تفصیل موجود ہے۔ جس میں لندن میں تحصیل علم کی تفصیلات بھی شامل ہیں۔ عبداللہ یوسف علی کے آئی سی ایس میں دوسرے مضامین میں فرانسیسی، لاطینی، انگلش ہسٹری، جنرل ماڈرن ہسٹری، پولیٹیکل اکانومی، اکانومک ہسٹری اور پولیٹیکل سائنس شامل تھے۔

۳۱- ایضاً، اس کے علاوہ IOL:L/P&J/6/406,409، یوسف علی نے اردو اور عربی میں اپنے قریب ترین مقابل سے ۴۰۰ نمبر زیادہ حاصل کیے تھے۔ ۱۸۹۵ء کے آئی سی ایس کے ۶۵ امیدوار تھے جن میں سے ۳ ہندو اور دو مسلمان تھے یعنی عبداللہ یوسف علی، علی احمد حسن علی۔ علی احمد حسن علی بھی بمبئی یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے جو سندھ گورنمنٹ کے وظیفے پر آکسفرڈ تعلیم کے لیے گئے تھے۔

۳۲- IOL:I/P&J/6/406/1714,408/1740

۳۳- انز کونسل کا اجلاس ۲۵ نومبر ۱۸۹۶ء کو منعقد ہوا جس میں داخلے کے امیدواروں کے بارے میں ارکان کی رائے حاصل کی جاتی تھی۔ اور منتخب افراد سے دو ماہ بعد طلبی کے ریکارڈ پر دستخط ثبت کرنے کے لیے ایک دوسرے اجلاس میں حاضر ہونے کے لیے کہا جاتا تھا۔

قاعدہ یہ تھا کہ بار کی بنچ کا کوئی ممبر امیدوار کے حق میں تجویز پیش کرتا تھا۔ یوسف علی کو

Marfat.com

روانگی سے پہلے اس کا انتظام کرنا تھا۔ وہ دوسری میٹنگ میں حاضر نہ ہو سکے تھے اور اگر چہ اپنی غیر موجودگی ہی میں جنوری میں وہ بار میں شامل کر لیے گئے تھے لیکن رسمی طور پر اپنے ریکارڈ کی دستاویز پر 1905ء تک دستخط نہیں کر سکے۔ یوسف علی کی ''بار'' میں ''بار یابی'' کے لیے تجویز بار کے ایک رکن جون جورج وٹ نے پیش کی تھی اور اس کی بنیاد کیمبرج کے ہی جے، ویسٹ لیک کی تعریفی سند تھی جنہوں نے اپنے تعارفی توصیفی خط میں تحریر کیا تھا: ''مجھے کیمبرج کے ایک طالب علم عبداللہ یوسف علی کی حمایت میں ایک لفظ یہ کہنا ہے کہ وہ غیر معمولی قابلیت کے حامل فرد ہیں''۔ ویسٹ لیک ہی نے 1908ء میں محمد اقبال کو بھی نامزد کیا تھا۔ یوسف علی کا لنکنز ان میں باقاعدہ رسمی داخلہ ''لنکنز ان کی بلیک بک'' میں ۲۷ جنوری ۱۸۹۶ء کو درج ہوا ہے جبکہ جناح کونسل کی اس سے اگلی میٹنگ میں جو ۲۹ اپریل ۱۸۹۶ء کو منعقد ہوئی تھی بار میں شامل کیے گئے تھے۔

۳۴- ''اقدام'': لاہور کا اردو روزنامہ، ایضاً

۳۵- سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور (YA 115),19/7/1936۔ یہ گارجین یا نگران غالباً ریورینڈ ارنسٹ فاسٹر رہے ہوں گے جن کے نام یوسف علی نے ۱۹۲۲ء میں پاور آف اٹارنی (مختار نامہ) لکھا تھا۔

۳۶- جورج برڈووڈ، برڈووڈ خاندان کے ایک فرد تھے جن کے ہندوستان سے وسیع روابط تھے۔ ان کی تالیف ''دی انڈسٹریل آرٹس آف انڈیا'' ۱۸۸۱ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کتاب نے ان کو ہندوستان کے فنون کا ماہر تسلیم کروا دیا تھا۔ وہ برطانیا آنے والے ہندوستانی طلبہ کو دوستی اور تعاون فراہم کرنے کے حوالے سے معروف تھے۔ عبداللہ یوسف علی کے برڈووڈ خاندان کے متعدد افراد سے تعلقات رہے ہوں گے۔ مثلاً جسٹس

Marfat.com

برڈووڈ جو کچھ عرصے کے لیے ۱۸۹۱ء میں بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ خود جورج برڈووڈ بھی بمبئی یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے تھے۔ ولیم برڈووڈ ممتاز فوجی جنرل اور ہندوستانی فوج کے کمانڈر ان چیف رہ چکے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء کے عشرے کی بات ہے۔ ان ہی صاحب نے انڈین لیگ آف نیشنز کے کاموں کو منظم کیا تھا جس میں عبداللہ یوسف علی نے بھی شرکت کی تھی۔ برڈووڈ خاندان کی یہ روایت، کہ برصغیر کے ذہین مسلمان طلبہ کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی جائے، ۱۹۶۰ء کی دہائی تک جاری رہی۔ ولسن کے ساتھ عبداللہ یوسف علی کی دلی وابستگی کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

۳۷- اگرچہ محمد علی جوہر نے اپنی ناکامی کا الزام انگلستان کے موسم بہار اور نوجوانی کے ان تصورات پر ڈالا ہے جن کا عقل و خرد سے تعلق ذرا کم ہی ہوتا ہے لیکن حقیقت میں انڈین ہسٹری جیسے مضامین کے پرچہ میں ایسے سوال شامل کیے جاتے تھے جن سے امیدواروں کے ذہنی رویوں اور جذباتی تعلق کا اندازہ لگایا جا سکے۔ اس طرح امیدواروں کے بارے میں یہ جانچنے کا موقع مل جاتا تھا کہ آیا وہ برطانوی راج کے وفادار کارکن بن سکتے ہیں یا نہیں، مثلاً ''بتایئے آپ ٹیپو سلطان کے متعلق کیا جانتے ہیں؟'' جیسا سوال، جو برٹش انڈیا کی ہسٹری کے پرچہ میں ۱۸۹۵ء میں پوچھا گیا تھا، بڑی آسانی سے یہ بات سامنے لے آتا تھا کہ امتحان میں شریک امیدوار کس حد تک اس مسلم حکمران کی ان کارروائیوں کی تائید کرتا ہے جو اس نے برطانیا کے خلاف کی تھیں۔

دوسرا باب

الجھنیں اور پریشانیاں

عبداللہ یوسف علی کے ملازمت پر تقرر کا آغاز ۲۳ جنوری ۱۸۹۶ کو بحیثیت اسسٹنٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر یو پی کے ضلع سہارن پور میں ہوا۔ (۱) ایک نیا نیا آئی سی ایس افسر اپنے زیر انتظام علاقے میں جج اور جیوری سبھی کچھ تھا۔ اس کو ملزمان کو ۶ ماہ تک کے عرصے کے لیے جیل میں بھیجنے کا اختیار تھا۔ اور دو سال کے بعد اس کا یہ اختیار ۲۴ مہینے کی مدت تک بڑھ جاتا تھا۔ اس کو کوڑے مارنے کی سزا دینے اور کسی یورپین کو بھی ۳ ماہ تک کی قید کی سزا دینے کا اختیار حاصل تھا۔ عبداللہ یوسف علی کے ماتحت ایک ہندوستانی افسر بطور مددگار موجود تھا جو فصلوں پر لگان اور ٹیکس کے مقدمات کے فیصلے کرنے میں ان کی مدد کرتا تھا۔ اگر فصل خراب ہو جائے تو انہیں لگان معاف کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ (۲) یہ ایک ۲۳ سالہ حاکم ضلع کے لیے نہ صرف بڑا جرأت آزما کام تھا، بلکہ یہ برطانوی نظم ونسق کی عظیم الشان عمارت کی پہلی منزل تھی۔ آئی۔ سی۔ ایس افسروں کے اختیارات و ذمہ داریاں، وقت گزرنے کے ساتھ غیر محدود ہوتے جاتے تھے۔

ملازمت کی ذمہ داریوں کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اور زمین کے سروے کے لیے علاقے میں کثرت سے دورے کرنے پڑتے تھے۔ اس وقت سفر کا ذریعہ صرف گھوڑے کی سواری ہی تھا۔ چنانچہ اس امر میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ آئی سی ایس کے امتحان میں گھڑ سواری ایک انتہائی اہم مضمون تھا۔ آئی سی ایس طبقے کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ہندوستان کے بارے میں ان کے جذبات پدرانہ شفقت و سختی، اکتاہٹ اور فخر و غرور سے مملو ہوتے تھے۔

سہارن پور میں دو سال گزارنے کے بعد عبداللہ یوسف علی کا تبادلہ بریلی ہو گیا۔ بریلی

علی گڑھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی وجہ سے مشہور تھا جسے مختصراً ایم اے او کالج بھی کہا جاتا تھا۔ اس طرح عبداللہ یوسف علی کو سرسید احمد خاں سے رابطے میں آنے کا موقع مل گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے سرسید سے ان کی عمر کے آخری سالوں میں ملنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے اور مجھے ان کے ساتھ چند بار کی گفتگو بھی یاد ہے جو افسوس کہ بہت ناکافی تھی۔ اس گفتگو کا موضوع مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ تھی۔ میں اس وقت ایک پبلک سرونٹ کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کر رہا تھا، اور میں نے اپنے تعلیمی مقاصد پورے جوش اور اعتماد کے ساتھ تعلیم کے میدان کے اس رہنما کے سامنے رکھ دیے جس کی زندگی بغاوت ہند اور وکٹورین عہد کے درمیان کے فاصلے کو محیط تھی۔'' (۳)

سرسید کا انتقال مارچ ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ قابل و باصلاحیت افراد قوم میں کم یاب تھے۔ (۴) یوسف علی بڑی تیزی سے آئی سی ایس میں ترقی کے مراحل طے کر رہے تھے۔ مارچ ۱۸۹۹ء میں انہیں یو پی کے کاروی سب ڈویژن کا چارج دے دیا گیا۔ اگلے دس سال کے عرصے کی ملازمت میں وہ براہ راست جیمز میسٹن (James Meston) کے ماتحت رہے جو پہلے یو پی میں فنانس سیکرٹری اور بعد میں صوبے کے گورنر بنے۔ جیمز میسٹن ایبرڈین شائر سے تعلق رکھنے والے ایک اسکاٹ تھے اور ان کے مزاج میں مسلمانوں سے قدرے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس ہمدردی کے پیچھے ایک سخت گیر داخلی رویہ موجود تھا، گویا مخملی دستانے کے اندر جو مٹھی تھی وہ آہنی ہاتھ کی تھی۔

عبداللہ یوسف علی کی ادبی صلاحیتوں کا پہلا اظہار ۱۹۰۰ء میں اس وقت ہوا جب ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک رسالہ بعنوان ''شمال مغربی صوبہ جات اور اودھ میں ریشمی پارچہ جات کی

Marfat.com

صنعت'' شائع ہوا۔ ان کے اس مقالے میں فنی تہذیب و ثقافت اور صنعت سے متعلق مکمل معلومات تھیں اور اسلامی نقطۂ نظر مدلل طریقے سے پیش کیا گیا تھا۔ مثلاً کہا گیا تھا کہ ''عسکری روایت کی حامل نسل سے تعلق رکھنے والے کسی آدمی کے لیے زیب و زینت کی غیر ضروری اشیاء مثلاً ریشمی لباس یا سونے کے زیورات پہننا جائز نہیں ہوسکتا''۔

اس موضوع پر اس مقالے میں ایک حصہ احادیث نبوی ﷺ پر مشتمل تھا۔ جس کے ضمنی ابواب میں سنی اور شیعہ ماخذوں سے علیحدہ علیحدہ روایات کو جمع کر دیا گیا تھا۔ یہ گویا ان کے اس عزم کی مثال تھی کہ وہ ذاتی طور پر ہر قسم کی مذہبی فرقہ پسندی سے بلند نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اور یہی بمبئی کی انجمن اسلام والی سپرٹ تھی (جو عبداللہ یوسف علی کی قدیم مادر علمی کی خصوصیت تھی)۔

اس موضوع پر عبداللہ یوسف علی کی دلچسپی ممکن ہے کہ ان کے داؤدی بوہرہ فرقے سے تعلق کی وجہ سے ہو۔ سورت شہر روایتی طور پر ریشم کی صنعت کا مرکز تھا۔ اس بات کا امکان ہے کہ اس سلسلے میں جورج برڈوڈ کی دلچسپی نے بھی اس صنعت کے فروغ میں کچھ کردار ادا کیا ہو۔ اس لیے کہ جورج برڈوڈ خود اس وقت صدی کے اختتام پر لندن میں ایک ہندوستانی نمائش کے انعقاد اور اہتمام کے سلسلے میں بہت سرگرم تھے۔

آئی سی ایس کے افسران عام طور پر ایک مخصوص رخصت پر جس کو فرلو (Furlough) کہا جاتا ہے اور جو مدت ملازمت کے ایک چوتھائی کے مساوی اور زیادہ سے زیادہ چھ سال ہوسکتی تھی واپس برطانیا جاتے تھے۔ آئی سی ایس کے ریکارڈ کے مطابق عبداللہ یوسف علی کی پہلی باقاعدہ 'فرلو' تعطیلات مئی ۱۹۰۵ء میں شروع ہوئی تھیں۔ لیکن وہ ۱۹۰۰ء میں بھی برطانیا آئے تھے جب انہوں نے ٹیریسا میری شیلڈرز (Teresa Mary Shalders) سے شادی کی تھی۔ یہ شادی ۱۸ ستمبر کو برن ماؤتھ (Bournemouth) کے شہر میں چرچ آف انگلینڈ کے دستور اور

قواعد کے مطابق انجام پائی تھی۔ ٹیریسا اس وقت ۲۷ برس کی تھیں اور اپنے دولہا سے صرف ایک سال چھوٹی تھیں۔ (۵) شادی کی رسومات کینن ہنری سلیٹر (Canon Henry Slator) نے سینٹ پیٹرس چرچ میں ادا کی تھی۔ یہ چرچ اس لیے شہرت رکھتا ہے کہ اس کے قبرستان میں معروف انگریزی شاعر شیلے (Shelley) کا ''دل'' مدفون ہے۔

عبداللہ یوسف علی نے بڑی شان سے شادی کی دستاویز پر عبداللہ ابن یوسف علی کے نام کے دستخط ثبت کیے جیسے کہ وہ بتانا چاہتے ہوں کہ وہ کوئی معمولی ہندوستانی شہری نہیں ہیں۔

آئی سی ایس افسران کے حلقے میں ہندوستانی افسروں کو علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم لوگوں کو اس شادی کا علم ہو سکا۔ لیکن حد درجہ زیرک اور ہوشیار میسٹن (Meston) ضرور اس سے واقف ہو چکے ہونگے۔ اس نوجوان جوڑے کا یہ اقدام یقیناً جرأت مندانہ ہی کہا جائے گا جس کے خیال میں نئی صدی کی آمد اپنے جلو میں ممکنات کی بہت سی شکلیں لا سکتی تھی، جس میں نسلوں کی ہم آہنگی، مذاہب کا باہمی قرب اور دور دراز براعظموں کے فاصلوں کا ختم ہو جانا سبھی کچھ شامل ہو سکتا تھا۔

ٹیریسا عبداللہ یوسف علی کے پاس یو پی پہنچ گئیں اور ان کا پہلا بچہ 'ادریس' نومبر ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا۔ ٹیریسا کے ہاں دوسرا بیٹا اصغر بلوئے اگلے سال اکتوبر میں پیدا ہوا۔ اس وقت تک یوسف علی سہارن پور میں نائب سیشن جج ہو چکے تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ٹیریسا اپنے بچوں کو لے کر ہندوستان سے چلی آئیں اور سینٹ البانز St.Alban'S میں لمسفرڈ روڈ (Lemsford Road) پر ایک مکان میں مقیم ہو گئیں۔ (۶) ان کے مکان کا نام کروی (Kirwee) اس سب ڈویژن کے نام پر رکھا گیا جہاں عبداللہ یوسف علی تعینات رہے تھے۔

اپنی پہلی ''فرلو'' یا رخصت کے وقت عبداللہ یوسف علی کی عمر ۳۳ سال کی ہو گئی تھی وہ

Marfat.com

ڈپٹی کمشنر ہو چکے تھے اور ہندوستان کے اس ممتاز طبقے میں بھی شامل ہو گئے تھے جو اعلیٰ آئی سی ایس افسران کا حلقہ تھا۔ یوسف علی کا برطانیا پہنچ کر یہ ارادہ تھا کہ وہ اپنی دو سال کی رخصت بہت مؤثر طریقے سے استعمال کریں گے۔ سب سے پہلے انہوں نے جس کام کی تکمیل کی وہ لنکنز ان میں ''بار'' میں حاضری ریکارڈ کرنا تھی۔ یہ وہ کام تھا جس میں پہلے ہی بہت زیادہ تاخیر ہو چکی تھی۔ اب یہ کارروائی انہوں نے مئی ۱۹۰۵ء میں مکمل کی۔ اس کے علاوہ دوسرے گھریلو مسائل کی طرف توجہ دینا بھی ضروری تھا، اس لیے بھی کہ ان کا تیسرا بیٹا البان حیدر ستمبر ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوا تھا اور ان کی بیگم ٹیریسا کو بلاشبہ تین بچوں کی نگہداشت و پرورش کے لیے سہارا درکار تھا۔ بالخصوص اس لیے کہ تینوں بچے چھوٹے اور چار سال سے کم عمر کے تھے۔

یہ ۱۹۰۵ء ہی کی بات ہے کہ محمد اقبال بھی پہلی بار حکومت کے وظیفے پر برطانیا پہنچ گئے۔ اقبال نے بھی ہندوستان کے لوگوں کے پسندیدہ تعلیمی راستے کو اختیار کیا اور لنکنز ان اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں مشہور اردو جریدہ ''مخزن'' کے مدیر عبدالقادر بھی بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ عبدالقادر بعد میں عبداللہ یوسف علی کے بہت قریبی دوستوں کے حلقے میں بھی شامل ہوئے۔ اقبال کی عبدالقادر سے بہت اچھی شناسائی تھی اور وہ جب بھی کیمبرج سے لندن آتے تو شیخ عبدالقادر ہی کے ہاں ٹھہرتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اقبال، عبدالقادر اور یوسف علی اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل کی نمائندگی کر رہے تھے تو یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لندن میں دو بزرگ اور سینئر ہستیاں بھی پہلے سے موجود تھیں۔ جسٹس امیر علی کچھ ہی عرصہ قبل اپنی انگریز بیگم کے ساتھ (ان کی شادی ۱۸۸۰ء میں ہوئی تھی) برک شائر (Berkshire) کی ایک دیہی قیام گاہ میں منتقل ہوئے تھے۔ وہ باقاعدگی سے لندن کے ریفارم کلب آیا کرتے تھے اور وہاں بیٹھ کر اخبارات میں ہندوستان اور

Marfat.com

مسلمانوں کے مسائل کے دفاع کے لیے بڑے پرزور خط لکھا کرتے تھے۔

دوسری ممتاز شخصیت بدرالدین طیب جی کی تھی جو طبی علاج معالجے کی خاطر لندن آئے ہوئے تھے۔ یہ ایک دل آویز حلقہ یاراں تھا جن میں آپس میں گونا گوں سماجی اور خاندانی روابط قائم ہو گئے تھے۔ اقبال کی بھی اس حلقے میں دوہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ امیر علی کی کتابوں کی الف بائی فہرست بنانے کا ادارتی کام کر رہے تھے دوسرے طیب جی کے خاندان کی ایک شخصیت عطیہ فیضی سے دوستی بھی ان کی اس حلقے سے وابستگی کا ایک سبب تھی۔ (۷)

ستمبر ۱۹۰۵ء میں بدرالدین طیب جی کے انتقال کے موقع پر یہ مختصر سی مسلمان کمیونٹی ان کی نماز جنازہ پر یکجا ہوئی۔ غم گساروں میں لندن میں مقیم ترکی کے قونصل جنرل حامد بیگ بھی تھے۔ عبداللہ یوسف علی سے اس موقع پر اظہار خیال کے لیے کہا گیا۔ انہوں نے طیب جی کی خوش گوار خاندانی اور گھریلو زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے اس موقع پر یہ کہا: ''ان کو گھر میں افراد خانہ کے ساتھ دیکھ کر ایک مکمل گھریلو شخصیت کی تصویر سامنے آ جاتی ہے جو وفاداری، قربانی اور اشتراک عمل کا کامل نمونہ تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ گھر کی زندگی میں بھی کتنی قوت و توانائی ہوتی ہے۔ ہم نوجوانوں کے لیے ان کی زندگی ایک تحریک پیدا کرنے والی قابل تقلید مثال ہے''۔ (۸)

عبداللہ یوسف علی کا اس طرح اس وقت خانگی زندگی کا ذکر کرنا بلا سبب نہیں تھا ان دنوں ٹیریسا کے ہاں چوتھے بچے کی ولادت ہونے والی تھی۔ ان کے اس طرح خاندان کی زندگی کے تذکرے کو نمایاں کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی اپنی ازدواجی زندگی میں مسائل کا ایک طوفان امڈ رہا تھا۔

عبداللہ یوسف علی نے اپنے آپ کو گھریلو مشاغل میں کھپانے کی بھرپور کوشش کی، مگر

Marfat.com

عوامی زندگی کی کشش شدید تر تھی۔ ہندوستان کا ذکر خبروں کا مسلسل موضوع بنا رہتا تھا۔ جس کی ایک وجہ تو پرنس اور پرنسز آف ویلز کا مجوزہ دورۂ ہند تھا جو مستقبل کے جارج پنجم اور ملکہ بننے والے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ برطانیہ میں لبرل پارٹی کی حکومت آ جانے سے یہ امید بندھ رہی تھی کہ شاید ہندوستان کے لیے سیاسی اصلاحات کا راستہ کھل جائے جیسے کہ آسٹریلیا میں ۱۹۰۰ء سے ایک خودمختار حکومت بن چکی تھی۔ عبداللہ یوسف علی کے ذہن میں ہندوستان کے مستقبل کے حوالے سے خیالات کا بے پناہ ہجوم تھا۔ بیسویں صدی کے بہت سے سماجی اور معاشرتی تقاضے ابھر رہے تھے۔ اور اب یہ عبداللہ یوسف علی جیسے جدید مغربی تعلیم یافتہ لوگوں پر منحصر تھا کہ ان کا وطن تبدیلیوں کی اس رفتار کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو۔

مذہب، سیاست اور ہندو مسلم تعاون کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار عبداللہ یوسف علی نے تحریر و تقریر میں ۷۔۱۹۰۶ء کے دوران کیا، ان ہی حالات کو بعد کی پوری زندگی میں ان کے افکار کی بنیاد بن جانا تھا۔

عبداللہ یوسف علی نے رائل سوسائٹی آف آرٹس میں ایک لیکچر دیا تھا، جس کا عنوان ''ہندوستانی مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل'' تھا۔ غالباً اس کا مشورہ ان کے مربی سر جارج برڈوڈ نے دیا ہوگا جو اس سوسائٹی کے ناظم مالیات اور ایک ٹرسٹی تھے۔ اس اہم واقعہ کی تشہیر مناسب طور پر سوسائٹی کے ہفت روزہ جریدہ میں بھی کی گئی۔ لیکچر کا انعقاد ۶ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہوا۔

عبداللہ یوسف علی کا لیکچر بہت کامیاب رہا اور یہ ان کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ ان کے پاس لالٹین کی روشنی میں دکھائے جانے والے سلائیڈز تھے جن کے ذریعے ممتاز مسلمان شخصیات اور مغل فن تعمیر کے شاندار نمونوں کی تصویریں دکھائی گئیں۔ (۹)

لارڈ ایمپٹ ہل (Lord Ampthill) نے جو مدراس کے ایک سابق گورنر اور

Marfat.com

۱۹۰۴ء میں ہندوستان کے قائم مقام وائسرائے رہ چکے تھے اس اجلاس کی صدارت کی۔ شاہی روایت کے بہترین انداز میں انہوں نے جلسہ کے سامعین سے خطاب کیا اور فرمایا: ''میں امید کرتا ہوں کہ حاضرین جلسہ اس حقیقت کا ادراک ضرور کر سکیں گے کہ ایک ہندوستانی نوجوان کس درجہ توانائی، پختہ کردار اور جرأت و ہمت سے ایک طویل سفر کے بعد یہاں آیا، اس نے اپنی تعلیم مکمل کی اور انگریزوں سے مقابلہ کر کے آئی سی ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی''۔(۱۰) ساتھ ہی انہوں نے اس ہندوستانی نوجوان کی اس بات کے لیے تعریف کی کہ وہ خود ہی انگلستان آیا اور خود اپنی آزادانہ مرضی سے اپنی ہم وطن رعایا کے متعلق ہم کو معلومات فراہم کیں۔ اس فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف علی نے خود اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر سوسائٹی کے اجلاس میں تقریر کے لیے پیش کیا تھا۔

عبداللہ یوسف علی نے ایمپٹ ہل کے ''ارشادات'' کے جواب میں اپنی وفاداری کا مظاہرہ ان الفاظ میں کیا: ''ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو ان کے لیے یورپ کی ایک ترقی پسند اور آزاد سلطنت کے معزز شہری بننے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں ہندوستان کی وہابی تحریک پر تنقید کی جو برطانوی حلقوں میں سخت اعتراضات کا موضوع تھی۔ اس طرح انہوں نے وہابی تحریک کے بارے میں وہی رویہ اختیار کیا جو ۳۰ سال پہلے سر سید احمد خاں نے اختیار کیا تھا۔ یعنی: ''ان لوگوں کی ''دعوت جہاد'' کو بہت شدت اور سنجیدگی سے توجہ کا مستحق نہیں سمجھنا چاہیے۔(۱۱) ان کا خیال تھا کہ یہ تحریک ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بدنامی کا سبب بن رہی ہے۔ جیسا کہ ۱۸۷۱ء میں بنگال کے انگریز چیف جسٹس کے بہیمانہ قتل کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تحریک اس لیے بھی قابل مذمت ہے کہ یہ تحریک موجودہ نظام کے لیے عدم مفاہمت اور عناد کے رویے کا اظہار کرتی ہے۔ ان کا

Marfat.com

خیال تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت نے ہمیشہ ہی اس تحریک کو رد کیا ہے۔ عبداللہ یوسف علی برطانیا کے ان شکوک وشبہات کو رفع کرنا چاہتے تھے جو اس کو مسلمانوں کی عسکریت پسندی اور شوق جہاد وغیرہ کے بارے میں تھے۔

عبداللہ یوسف علی کی یورپی طرز حیات سے شیفتگی نے ان کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کچھ عاجلانہ تجاویز پیش کرنے پر بھی آمادہ کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی مختلف انجمنوں اور تنظیموں کا ہونا بڑی اچھی بات ہے اس لیے کہ ان کے ذریعے بہت سے مفید کام ہو رہے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی تنظیم نو صحت مند وسیع المشربی کی بنیادوں پر اور فرقہ بندی سے بالاتر ہو کر کی جائے۔ ان کی معاشرتی تنظیم نو بھی ترقی پسندانہ خطوط پر ہو جس میں خواتین کا اشتراک اس کے فوائد میں اضافے کا موجب ہونا چاہیے۔ ''میرا خیال ہے کہ ترکی، شام، مصر اور بالخصوص الجزائر کی خواتین ہندوستان کی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں''۔ اس وقت برطانیا میں عورتوں کو ووٹ کا حق دلانے کے لیے تحریک زور وشور سے جاری تھی، اور ہوسکتا ہے کہ عبداللہ یوسف علی نے اس حوالے سے جو کچھ کہا اور جو معذرت خواہانہ نقطۂ نظر پیش کیا وہ اس تحریک کے زیر اثر کیا ہو۔ (۱۲)

اس کے بعد ہونے والی گفتگو کے دوران لارڈ ایمپٹ ہل نے عبداللہ یوسف علی کو ان کی انگریزی زبان پر شاندار قدرت اظہار کے لیے مبارک باد دی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی تقریر کے دوران جرمن زبان میں جو لطیف طنز ومزاح کے فقرے کہے تھے ان کو ایمپٹ ہل سمجھ پائے تھے یا نہیں۔

اس اجلاس میں ایک معمولی سا اختلاف، عبداللہ یوسف علی اور جسٹس امیر علی کے درمیان اٹھ کھڑا ہوا جو خاصا دلچسپ بھی تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے وقف کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ

Marfat.com

یہ مسلمانوں کا ایک ایسا ادارہ ہے جس کی تنظیم نو کی ضرورت ہے۔ عبداللہ یوسف علی نے کہا کہ کیا مسٹر امیر علی اس مسئلہ اور موضوع کا ایسا مفصل تعارف اور تجزیہ پیش نہیں کر سکتے جس میں صرف اصولی باتیں نہ ہوں بلکہ ٹھوس واقعاتی مثالیں بھی پیش کی گئی ہوں۔

جسٹس امیر علی[۹] ۱۸۹۲ء سے مسلم وقف کے مسئلے پر علمی کام کر رہے تھے۔ چنانچہ اس وقت انہوں نے عبداللہ یوسف علی کو ایک ایسا نوجوان سمجھ کر جو وقت سے پہلے بالغ فکری کی حدود کو پہنچ رہا تھا، بات کو سرسری طور پر ٹال دیا۔ بعد ازاں وقفۂ سوالات میں امیر علی نے کہا کہ جہاں تک ان کی ذات کا سوال ہے ان کو اس مسئلے میں کوئی خاص الجھن یا دشواری پیش نہیں آتی۔ محمڈن لا کے اس موضوع پر ان کی تالیف کے ۴۰۰ صفحات اس مسئلے کی وضاحت کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ امیر علی نے بات کو بڑھاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ میرا تاثر یہ تھا کہ یہ صرف انگریز ججوں کا معاملہ ہے جو مسلمانوں کے قوانین کے اس پہلو کو ٹھیک طور پر سمجھ نہیں پائے۔ لیکن حیرت اور افسوس اس بات پر ہے کہ فاضل مقالہ نگار کو بھی وہی دشواری پیش آ رہی ہے جو غیر مسلم انگریز ججوں کو پیش آتی ہے۔ اگر مسٹر عبداللہ یوسف علی مجھے اپنی الجھن اور دشواری کی حقیقی نوعیت بتا سکیں تو مجھے ان کی تشفی کے لیے ہر طرح کی وضاحت اور تشریح پیش کر کے بڑی خوشی ہوگی۔ (۱۳)

سامعین میں موجود ایک اور غیر مطمئن صاحب ڈاکٹر سید عبدالمجید تھے جن کو شکایت پیدا ہوئی کہ مقرر نے ہندوستان کے مسلمانوں کی انتہائی رجعت پسندانہ تصویر پیش کی ہے۔

جب رائل سوسائٹی کی کونسل کی اگلی میٹنگ جون ۱۹۰۷ء میں منعقد ہوئی تو عبداللہ یوسف علی کو ان کے خطبے کے صلے میں سوسائٹی کا سلور میڈل دیا گیا۔ یہ عوامی سطح کا ایک اہم اعتراف تھا جو ان کے حصے میں آیا اس لیے کہ سوسائٹی ہندوستان کے ان مسائل کو جو تاج برطانیا کے مفاد کے لیے بے حد اہمیت رکھتے تھے ان لوگوں کے سامنے بحث و نظر کے لیے پیش کرنے کا

Marfat.com

موقع فراہم کرتی تھی جو بااثر بھی تھے اور مسئلے سے واقعی دلچسپی رکھتے تھے۔(۱۴)

بعد ازاں عبداللہ یوسف علی کو پاسمور ایڈورڈز انسٹی ٹیوٹ (Passmore Edwards Institute) لندن میں ایک ہی سلسلے کے چھ خطبے دینے کی دعوت دی گئی۔ یہ خطبے زیادہ بڑی جگہ پر اس لیے منتقل کرنا پڑے کہ سامعین کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ خطبوں کے اس سلسلے پر مبنی آخر کار ایک کتاب طبع ہو کر آئی جو جون مرے آف لندن (John Murray of London) جیسے طباعتی ادارے نے ۱۹۰۷ء میں شائع کی تھی۔ کتاب کا نام ''ہندوستانی عوام کی زندگی اور کاوش'' (Life and Labour of the People of India) تھا۔ کتاب جورج برڈووڈ کے نام معنون کی گئی تھی۔(۱۵) عبداللہ یوسف علی نے اس کتاب میں ہندوستان کے لوگوں کی زندگی و مشقت کا جو نقشہ پیش کیا تھا وہ ان خیالات کے مطابق تھا جو انہوں نے رائل سوسائٹی آف آرٹس میں قبل ازیں پیش کیے تھے۔ انہوں نے اس کتاب میں زمانہ قدیم بلکہ عہد عتیق کے معاشرے کی تصویر پیش کی تھی جو اب انتہائی بد عنوان فرسودہ سماجی اور مذہبی روایات کے سبب انحطاط پذیر تھا۔ ان کے نزدیک ہندوستانی معاشرے کے نمایاں رجحانات میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ سارے ادارے جن کا کام نظم و ضبط اور اجتماعی کاموں کو منظم کرنا تھا، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ ہندوستانی اسلام اب محض ایک مجرد اصطلاح ہو کر رہ گیا تھا اور کوئی ایسا با اختیار ادارہ یا افراد نظر نہیں آتے تھے جن کے پاس کوئی طاقت یا اختیار باقی رہ گیا ہو۔ ''مسلمانوں کے مذہبی اعمال اب صرف تعزیہ داری کی حد تک رہ گئے ہیں جو محرم کے مہینے میں ہوتی ہے، یا جانوروں کی زوردار قربانی کی رسم جو عیدالاضحیٰ پر ہوا کرتی ہے اس میں اور بھی زور شور پیدا ہو جاتا ہے جب یہ عید ہندوؤں کے کسی تہوار کے موقع پر آ جاتی ہے۔''(۱۶)

عبداللہ یوسف علی کی خواہش سماج اور معاشرے کی اصلاح تھی، لیکن ان کے خیال میں

Marfat.com

ایسی اصلاح صرف اس وقت ممکن تھی جب بعض طاقتوں کو ذرا دور رکھا جانا ممکن ہو سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے پہلے زمین ہموار کرنے کی اشد ضرورت تھی جو اسی صورت میں ممکن تھی جب ہم ان عوامل سے نجات حاصل کر لیں جو ہماری نظروں کو خیرہ اور ہماری قوت فیصلہ کو کند کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی چیز جس کا انسداد ضروری تھا وہ مذہب کے نام پر سیاسی عمل تھا جس کے ذریعے مذہبی اختلافات کا سہارا لے کر سیاسی مفاد حاصل کیا جا رہا تھا۔ عبداللہ یوسف علی کے الفاظ میں ''اس کے نتیجے میں مذہبی منافرتیں جنم لیتی ہیں اور ہز میجسٹی کی وفادار اور قانون پسند رعایا میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے''۔ عبداللہ یوسف علی کا سلطنت سے وفاداری و اطاعت کا جذبہ ان کو مذہب کے غیر سیاسی شعور کا حامی اور نمائندہ بنا رہا تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کا دوسرا اہم قضیہ جسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا وہ ان کا ہندو اکثریت سے مقابلہ تھا۔ بمبئی کے مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ اپنی دولت و خوشحالی اور تعلیمی میدان میں آگے ہونے کی بنا پر اپنے لیے کوئی خاص خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا اور ہندوؤں کے ساتھ سیاسی تعاون کا حامی تھا۔ اپنی کتاب میں عبداللہ یوسف علی نے مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے خصوصی رعایتوں کے طلب کرنے کے سوال پر بحث کی اور کہا کہ مسلمان حکومت سے اپنے لیے خصوصی رعایتیں کیوں طلب کرتے ہیں؟ وہ اپنے لیے منصفانہ برتاؤ کیوں نہیں مانگتے؟

برطانوی دستوری انجمن (British Constitutional Association) کے ایک اجلاس میں جو وائٹ ہال میں منعقد ہوا اور جس کی رپورٹ اواخر جنوری ۱۹۰۷ء کے اخبار ''دی ٹائمز'' میں شائع ہوئی، عبداللہ یوسف علی نے ایک تقریر کی تھی جس میں اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ اکثریت رکھنے والے طبقات اقلیتوں کے بارے میں رعونت اور تحقیر کے رویے سے احتراز کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے غیر مذہبی (سیکولر) نظام تعلیم کی حمایت کا بھی اعلان کیا

تھا۔(۱۷)

ایک ایسے وقت جب کہ مسلمان علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کی کوششیں کر رہے تھے ان کا سیکولر نظام تعلیم کی حمایت کرنا کسی اچھی حکمت عملی کا مظاہرہ نہ تھا۔ تھیوڈر موریسن(Theodore Morison)، جو علی گڑھ کالج کی پرنسپلی سے کچھ ہی عرصہ قبل ریٹائر ہوئے تھے، ایک مہینہ قبل ہی انہیں اس مسئلے کو رائل سوسائٹی آف آرٹس میں اٹھانے پر خاصی سرزنش کر چکے تھے۔(۱۸)

علی گڑھ کی تحریک کے سلسلے میں عبداللہ یوسف علی کا ذہنی تحفظ بمبئی کے معززین کے اُس خاص رویے کا مظہر تھا جس کے نتیجے میں وہاں فرقوں اور مذاہب کی بنیاد پر اداروں کی تشکیل و تنظیم کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کا اظہار ان کے ہم عصر اکبر حیدری نے بڑے واضح الفاظ میں یوں کیا تھا: ''ایک محمڈن یونیورسٹی کے قیام اور تشکیل کے تصور سے مجھے اس لیے ڈر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں جہاں پہلے ہی ذات پات اور عقیدے کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہیں اس طرح قومیتوں اور مذہبی گروہوں کے درمیان فاصلوں میں مزید اضافہ نہ ہو جائے۔''(۱۹)

جناح بھی جداگانہ بنیادوں پر مسلمانوں کے انتخاب کو غیر مناسب سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس امر میں حیرت کی کوئی بات محسوس نہیں ہوتی کہ جب ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کی جدوجہد اور ان کی علیحدہ قومی حیثیت کو تسلیم کروانے کے لیے قائم ہوئی تو یہ کام بمبئی میں نہیں ہوا جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان زیادہ تعداد میں تھے بلکہ اس کے قیام کا فیصلہ اور اعلان ڈھاکا میں منعقدہ اجلاس میں ہوا۔

اس عہد کے انگلستان کو اپنے حال اور مستقبل پر پورا یقین و اعتماد تھا۔ اور یہی وہ عصری فضا اور اسپرٹ تھی جس نے عبداللہ یوسف علی کو بھی اعتماد عطا کیا اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے

Marfat.com

کی طرف مائل کیا۔ان کی زندگی کا بڑا کام اب یہ طے ہوا تھا کہ مزید گہرائی میں جا کر اور مزید تفصیل سے سلطنت برطانیا کے اندر رہتے ہوئے ہندوستان کے کردار کو متعین کرنے کے لیے تجاویز مرتب کی جائیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سیاست میں مناسب لائحۂ عمل کے خطوط کی نشان دہی کی جائے۔ اپنے مقصد کے بارے میں یوسف علی پوری طرح پُر اعتماد تھے۔ مسز ہم فرے وارڈ (Mrs Humphrey Ward) جو Passmore لیکچرز کے سلسلہ کے ایک اجلاس کی صدارت کر رہی تھیں نے کمال مہربانی سے عبداللہ یوسف علی میں موجود ان تین صفات کا ذکر کیا جو ان کو ہندوستان کی زندگی کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے معتبر قرار دیتی تھیں۔ اولاً یہ کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی، گویا وہ انہیں میں سے ہیں۔ دوئم اُن کی حکومت وقت کے ساتھ وابستگی انہیں ملکی زندگی کو انتظامی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے، بحثیت مجموعی بھی اور بالخصوص سماجی نظام اور اس کے باہم ربط و تعلق کے حوالے سے بھی۔ اور سوئم کیمبرج کی تعلیم اور خاصے طویل عرصے تک یورپ کی زندگی اور طور طریقوں کے مطالعہ نے اُن کو اس قابل کر دیا ہوگا کہ وہ حقائق کا تجزیہ کر کے انہیں اس طرح پیش کر سکیں جو یورپ کے لوگوں کو اپیل کر سکے اور ساتھ ہی مشرقی روایت سے بھی متعارض نہ ہو اور نہ ان کے لیے نا قابل قبول ہو۔ (۲۰)

یہ ممکن تھا کہ ان کی ذات کے حوالے سے ایک مزید اضافہ ان کی صفات گناتے ہوئے یہ کر دیا جاتا کہ مشرق اور مغرب کے مابین ایک واسطہ اور پل کا کردار ادا کرنے کے لیے ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ انہوں نے ایک انگریز خاتون سے شادی بھی کی ہوئی تھی۔ اپنی ذات کے حوالے سے ان کے ہاں خود توصیفی کے عنصر کی جھلک بھی نظر آتی تھی جو اس انتہائی محنتی اور روشن دماغ ذہین نو جوان کی شخصیت کا ایک پہلو ضرور تھا۔

اس وقت تک عبداللہ یوسف علی کی زندگی ہموار، مستقل ترقی کی جانب متحرک اور بغیر کسی رکاوٹ کے کامیابی کا سفر نظر آتی تھی۔ ان کو پے در پے اور یکے بعد دیگرے امتیازات حاصل ہوتے رہے۔ برطانوی حلقوں میں ان کی حیثیت ایک انتہائی باصلاحیت آئی سی ایس افسر اور ہندوستان کی مسلم کمیونٹی کے نمائندے کی تھی، جیسا کہ جنوری ۱۹۰۷ء کے دی ٹائمز کے اس شمارہ کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے جو ''وائٹ ہال رومز'' میں منعقد ہونے والے اجلاس کے بارے میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی یہ تعریف کوئی معمولی تعریف نہیں تھی، بالخصوص اگر یہ بات نظر میں رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانوی سلطنت میں خلافت عثمانیہ کی حدود میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ مسلمان موجود تھے۔ برطانیا کو اس امر کا واضح احساس تھا۔ رپورٹ چھ کالمی سرخیوں کے ساتھ صفحہ اوّل پر شائع ہوئی اور اس امر کا اشارہ کرتی تھی کہ عبداللہ یوسف علی کی ترقی کا سفر شہاب ثاقب کی سی تیز رفتاری کے ساتھ ہوا تھا۔ حالانکہ ابھی کیمرج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کو دس سال بھی نہیں ہوئے تھے مگر وہ رائل سوسائٹی آف آرٹس اور رائل سوسائٹی آف لٹریچر کے رکن منتخب ہو چکے تھے اور انتہائی اعلیٰ سوسائٹی اور حلقوں میں ان کے احباب موجود تھے۔ کئی مواقع پر سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا، لارڈ مورلے (Lord Morley) سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں جس میں ہندوستان میں مجوزہ سیاسی اصلاحات سے متعلق امور پر تبادلۂ خیال ہوا۔ عبداللہ یوسف علی نے لارڈ مورلے کے سامنے ہندوستان میں پارلیمانی حکومت کے نظام کے قیام کی تجویز پیش کی لیکن ایک لبرل سیاست دان ہونے کے باوجود لارڈ مورلے نے ان تجاویز سے اتفاق نہیں کیا۔ عبداللہ یوسف علی نے بڑے تاسف سے لکھا کہ میرے دلائل جس میں میں نے اپنی مشروط رائے پیش کی تھی ان کو متاثر اور قائل نہ کر سکے۔ (۲۱)

عبداللہ یوسف علی نے کچھ عرصے کے لیے نارفوک میں کرومر ہاؤس میں قیام کیا تھا

Marfat.com

جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان کے روابط Baring کے امراء کے خاندان سے بھی تھے جن میں سے سب سے زیادہ معروف شخصیت ارل آف کرومر کی تھی۔ (۲۲) مصر کے معروف پروقونصل اور ان کے عزیز بیرن ریول سٹوک دونوں ہی شاہی خاندان کے بااعتماد دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ بعد میں ان میں سے ایک لارڈ چیمبرلین بن گئے اور دوسرے صاحب جارج پنجم کے ذاتی مالیاتی مشیر مقرر ہوئے۔

عبداللہ یوسف علی کی خصوصی رخصت اختتام پذیر ہورہی تھی اور لندن کی انتہائی پررونق اور امنگوں سے بھرپور زندگی کے بعد دوبارہ یوپی کی حد درجہ معمول کی لگی بندھی اور بے رونق مصروفیت والی زندگی کی جانب واپسی کا خیال یقیناً عبداللہ یوسف علی کو خوف زدہ کررہا ہوگا۔

عبداللہ یوسف علی نے اپنے ذہن میں آئی سی ایس کا ایک خوب صورت اور پسندیدہ تصور قائم کیا تھا جس میں افسر ایک انتہائی روشن خیال، منظم اور اعلیٰ علمی ذوق کا حامل شخص ہوتا تھا جس کے پدرانہ سایۂ شفقت اور نگران آنکھوں کے سامنے ہندوستان کا معاشرہ صدیوں کی گہری نیند سے آہستہ آہستہ نکل کر شعور کی آنکھ کھولے گا۔ لیکن بدقسمتی سے حقیقت کچھ یوں تھی کہ انڈین سول سروس بھی رنگ و نسل کی عصبیت سے ماوراء نہیں تھی۔ چنانچہ ان کی جیسی باصلاحیت شخصیت کی اگر ایک طرف لندن میں ہر طرف آؤ بھگت ہوتی تھی اور اُن کو ہر حلقہ میں خوش آمدید کہا جاتا تھا تو دوسری طرف ہندوستان میں مقامی باشندہ ہونے کی بنا پر، خواہ وہ کتنا ہی مغربی یورپی طرز زندگی میں رنگا ہوا کیوں نہ ہو، سفید فام لوگوں کے کلبوں اور جم خانوں کے دروازے ان پر بند تھے۔ عبداللہ یوسف علی اکیلے ہندوستان واپس آئے۔ ٹیریسا تین بیٹوں اور ایک بیٹی، لیلا ٹیریسا، جو دسمبر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئی تھی، کے ساتھ لندن ہی میں رہیں۔ جم خانے کا یورپی ٹولہ رنگ کی بنیاد پر اس شرم ناک تفریق کو نظر انداز کیے جانے کے خلاف پوری طرح یکسو اور متحد تھا۔

Marfat.com

مارچ ۱۹۰۷ء میں عبداللہ یوسف علی نے سلطان پور کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ جب مسٹر میسٹن یو۔پی کی حکومت کی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر مرکزی حکومت میں فنانس سیکرٹری ہوئے تو ان کے مسلمان مرید کو بھی کچھ عرصے کے لیے مالیات کے محکمے میں انڈر سیکرٹری اور ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دینے کا موقع ملا۔ گویا عملاً وہ اس حیثیت میں ہندوستان کے سینئر ترین سول سرونٹ کی حیثیت سے ''چانسلر آف ایکسچکر'' کے ساتھ متعلق تھے۔ میسٹن بذات خود انتہائی محنتی اور فراست کے مالک تھے اور نوجوان مسلمان افسروں کی تربیت کرنے میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے التفات سے فیض یاب وارث نام کے ایک اور سول سرونٹ بھی تھے جو امیر علی کے بیٹے اور پبلک سکول کے تعلیم یافتہ تھے۔ (۲۳)

عبداللہ یوسف علی کی گھریلو زندگی میں انتشار کی ابتدائی علامات ۱۹۰۸ء میں ظاہر ہوئیں جب انہوں نے طبی وجوہ کی بنا پر ۹ ماہ کی رخصت لی۔ یہ چھٹی فروری سے اکتوبر ۱۹۰۸ء تک تھی۔ جس حادثے نے ان کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا، وہ ٹیریسا کی بے وفائی کی خبر تھی۔ یہ شادی ابتدا ہی سے کچھ بے تکی تھی۔ اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ عبداللہ یوسف علی نے ۱۹۰۰ء میں برن ماؤتھ میں شادی کے لیے کوئی رخصت لی تھی، جب کہ چرچ میں منعقدہ شادی کی رسم کا بھی ان کے پس منظر سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ غالباً یہ ملن کچھ جذباتی عجلت یا مجبوری کا معاملہ تھا جس میں فریقین کے مزاجوں کے بنیادی فرق کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں جلد جلد بچوں کی پیدائش نے بھی ازدواجی رشتے کو جو شروع سے ہچکولے کھا رہا تھا مستحکم کرنے میں کوئی خاص مدد نہیں کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عبداللہ یوسف علی جو اپنی عوامی اور علمی مصروفیت اور مشاغل میں بری طرح منہمک تھے، یہ محسوس ہی نہ کر سکے ہوں کہ ٹیریسا ایک غیر مطمئن ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔ ۱۹۰۷ء میں وہ اپنی پبلک لائف کی قابل ذکر کامیابیوں اور کامرانیوں اور تین بیٹوں کے بعد ایک بیٹی کی

Marfat.com

پیدائش پر خوشی سے مسرور اور شاداں و فرحاں ہندوستان واپس آئے تھے کہ اچانک ان کی دنیا اس وقت اندھیر ہوگئی جب انہیں ٹیریسا کی بے وفائی کی خبر ملی۔

سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ ٹیریسا کا یہ فعل شاہ ایڈورڈ کے زمانہ کے انگلستان کے چلن کے مطابق ہی تھا (خود بادشاہ کا ایک معاشقہ ایک خاتون Lillie Langtry سے چل رہا تھا، جس کا علم ہر کس و ناکس کو تھا) لیکن بہر صورت ٹیریسا کے عمل کی کوئی معقول توجیہ کرنا مشکل تھی اور ایک ہندوستانی مسلمان کے لیے اس کا یہ فعل انتہائی ذلت و رسوائی کا سبب تھا۔ عبداللہ یوسف علی کا تعلق ایک درمیانے طبقے کے ایک قابل احترام گجراتی مسلمان خاندان سے تھا جہاں خاندانی زندگی کی قدروں کی اہمیت ایک طے شدہ امر تھا۔

یہ خیال کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ وہ ایک مہذب اور ذمہ دار شوہر اور باپ کے علاوہ بھی کچھ اور ہو سکتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے بچپن کے مخصوص حالات نے ان کو قدرے انانیت پرست بنا دیا تھا۔ ٹیریسا کی جانب سے پہنچنے والا صدمہ وہ کبھی بھلا نہ سکے، اور یہ گہرا زخم اس وقت بھی نظر آ رہا تھا جب برسوں بعد ۱۹۳۴ء میں وہ قرآن مجید کی تفسیر کا دیباچہ لکھ رہے تھے۔ ان کے الفاظ قابل توجہ ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''ایک انسان کی زندگی میں بیرونی دنیا کے طوفانوں اور ہنگاموں سے کہیں زیادہ وہ طوفان تباہ کن ہوتے ہیں جو اس کی داخلی اور باطنی زندگی میں ہلچل پیدا کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک باطنی طوفان غم و اندوہ کی شدید ترین تلخیوں کے ساتھ میری زندگی میں آ چکا ہے جس نے میرے ہوش و حواس اڑا دیے تھے، عقل و فہم کو معطل کر دیا تھا اور مجھے زندگی مکمل طور پر بے معنی محسوس ہونے لگی تھی''۔

شادی کے ختم ہو جانے پر ان کا ردعمل شدت غضب اور عزت نفس کے مجروح ہونے تک محدود نہیں تھا۔ ان کی روح اور ذہن کو لگنے والے زخم کہیں زیادہ شدید تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ

Marfat.com

ان کے نزدیک یہ شادی اس اعتماد اور مشترک آرزوؤں کی علامت تھی جو مشرق اور مغرب کے درمیان پیدا ہونا چاہیے تھے۔ ٹیریسا کے ان کی جانب سے منہ پھیر کر ایک دوسرے آدمی کی طرف توجہ مبذول کرنے کے عمل میں گویا یہ بات بھی مضمر تھی کہ اس طرح سلطنت برطانیہ نے بھی رد کرنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ اگر ٹیریسا نے استقامت اور وفاداری کا مظاہرہ نہیں کیا تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ معاشرہ اور تہذیب، جو عبداللہ یوسف علی کے نزدیک ایک مثالی تہذیب تھی، فی الحقیقت اس کے اندر باطنی کمزوریاں اور خرابیاں موجود تھیں اور وہ اتنی مثالی نہ تھی جتنی بظاہر نظر آتی تھی۔ پس یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی کہ عبداللہ یوسف علی کو اس حادثۂ جانکاہ نے اس درجہ ذہنی تکلیف پہنچائی تھی کہ وہ تقریباً اعصابی انتشار کا شکار ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے علالت کی بنا پر طویل رخصت منظور کرائی اور ۱۹۰۸ء میں زیادہ تر وقت بغیر کام کے گزارا۔

ناجائز تعلقات (adultery) کے حوالے سے طلاق کے حصول کے مقدمے میں انتہائی تکلیف دہ تفاصیل بھی عدالت کے سامنے آئی تھیں جو مزید ذہنی اور روحانی اذیت کا سبب بنتیں۔ لیکن جب یہ خبر بھی آ گئی کہ ٹیریسا کے ہاں اس کے آشنا کا بچہ پیدا ہونے والا ہے تو عبداللہ یوسف علی کے پاس کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے ان مشکل ایام میں بھی اپنے ہوش وحواس کو قائم رکھا۔ اس کی ایک مثال یہ تھی کہ ۱۹۰۹ء میں انہوں نے یو۔ پی کی انڈسٹریل کانفرنس کی صدارت کی۔ اس سے اگلے سال ناگ پور میں ہونے والی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی ایسا ہی کردار ادا کیا۔

ٹیریسا کا غیر قانونی بچہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا، جس کے بعد عبداللہ یوسف علی طلاق کا مقدمہ دائر کرنے کے لیے لندن پہنچے۔ یہ کارروائی اپریل ۱۹۱۱ء میں ہوئی، جس میں فریق ثانی مدعا علیہ کا نام اوبڈ تھرون (Obed Throne) بتایا گیا۔ انہوں نے سینٹ البانز میں اپنے مکان

Marfat.com

میں قیام بھی نہیں کیا، حالانکہ ٹیریسا اب وہاں نہیں رہتی تھیں۔ یوسف علی کیوگرین میں واقع آئیوی ہوٹل میں ٹھہرے۔ طلاق کے مقدمے کی سماعت ہائی کورٹ کے فیملی ڈویژن میں جون کے مہینے میں ہوئی اور جنوری ۱۹۱۲ء میں جا کر عدالت کا قطعی اور آخری حکم جاری ہوا۔

چاروں بچوں کی عمریں اس وقت بمشکل ۵ سے ۱۰ سال کے درمیان ہوں گی۔ عبداللہ یوسف علی نے عدالت سے بچوں کو اُن کے حوالے کرنے کی استدعا کی۔ ان کو اس میں کامیابی تو ہو گئی، لیکن انہوں نے فوراً ہی بچوں کو ایک انگریز گورنس کے سپرد کیا اور ہندوستان روانہ ہو گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ بچے اپنے والد سے دور ہوتے چلے گئے۔ بچوں کے اس رویے کی وجہ سے انہوں نے آخر کار ۱۹۴۰ء میں اپنی جو وصیت لکھی اس میں سارے بچوں کو عاق کرنے کی ہدایت درج کی۔ انہوں نے بچوں کے بارے میں انتہائی تلخی کے احساس سے یہ الفاظ لکھے: ''باوجود اس کے کہ میں نے بچوں کے لیے بہت کچھ کیا، مجھے دکھ اس بات کا ہے انہوں نے ہمیشہ میری جانب بدگمانی اور عداوت کے رویے کا ہی مظاہرہ کیا۔ میری بار بار بے عزتی کی، اور دوسرے لوگوں سے میرے خلاف باتیں بھی کیں''۔ ٹیریسا نے دوسری شادی کر لی۔ لیکن وہ مسز تھرون کے بجائے مسز ایسٹل (Mrs Astell) ہو گئیں۔ عبداللہ یوسف علی ایک اعتبار سے خوش قسمت ثابت ہوئے کہ طلاق کا یہ مقدمہ پریس میں نہیں آیا اور کئی برس تک ایک راز ہی رہا جس کی بڑی احتیاط سے حفاظت کی گئی تھی، حد یہ ہے کہ اس خبر کی بھنک مسٹر میسٹن کے کانوں کو بھی نہ پڑی، اور نہ انڈیا آفس کے سٹاف کو اس کے بارے میں کئی سال تک کچھ علم ہوا۔

۱۹۱۲ء تک یہ سارا تکلیف دہ مرحلہ ختم ہو گیا اور مارچ کے مہینے میں آخر کار عبداللہ یوسف علی نے یو۔پی کے ضلع فتح پور میں مجسٹریٹ اور کلکٹر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اب میسٹن صوبہ یو۔پی کے لیفٹننٹ گورنر ہو چکے تھے اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے عمومی

Marfat.com

رویے نے اور خاص طور پر عبداللہ یوسف علی کے حوالے سے انہوں نے جو کچھ کیا اس سے ان کے کردار کے ایک تاریک پہلو کی نشان دہی ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوڑ توڑ کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ بے چارے عبداللہ یوسف علی کو ایک ایسے وقت یو۔ پی میں کام کرنا پڑ رہا تھا جب صوبے میں سیاسی ہنگامے اپنے عروج پہ تھے اور میسٹن کی حکومتی چالوں سے عبداللہ یوسف علی کو کسی قسم کی مدد نہیں مل رہی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں کان پور کے حالات بالکل ہی بے قابو ہو گئے۔ کان پور فتح پور سے بمشکل ۵۰ میل کے فاصلے پر تھا جہاں عبداللہ یوسف علی تعینات تھے۔

کان پور کی مسجد کا قضیہ اس وقت شروع ہوا جب میسٹن نے ایک سڑک کی تعمیر کے لیے مچھلی بازار کے علاقہ میں واقع شیعوں کی مسجد سے متصل وضو خانہ اور بیت الخلاء کے انہدام کے حق میں میونسپلٹی کے فیصلے کی حمایت کی۔ مسجد کے اس حصے کا یہ انہدام یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو کیا گیا، جب رمضان کا مہینہ تھا۔ فی الفور یہ مسئلہ زبردست قسم کی مقدمہ بازی کا سبب بن گیا۔ اور ہر مکتب فکر کے مذہبی لوگوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی۔ مولانا محمد علی جوہر نے مسلمانوں کو اپنے اخبار ''کامریڈ'' کے کالموں اور خدام کعبہ سوسائٹی کی مساعی کے ذریعے متحرک کیا۔ ۳ر اگست کی شام کو تقریباً بارہ ہزار مسلمان کان پور کی عیدگاہ میں مظاہرے کے لیے جمع ہو گئے اور مظاہرے کے بعد مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ پولیس نے فائرنگ کی جس سے ۱۶ افراد لقمۂ اجل بن گئے جن میں سے کئی لوگ مسجد کے اندر بھی شہید ہوئے۔ (۲۷) میسٹن نے ایک فوج داری قانون کے حوالے سے محمد علی جوہر اور مسلمانوں کے ایک اور بڑے رہنما اور دانش ور ابوالکلام آزاد کو کان پور آنے سے روک دیا اور ان کو کان پور میں آنے کی صورت میں گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ جب گرفتار شدگان کے خلاف مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی، جس میں شبلی نعمانی جیسے دانش ور بھی شامل تھے، تو گرفتار شدگان کے دفاع اور مقدمے کی پیروی کے لیے علامہ محمد اقبال لاہور سے تشریف

Marfat.com

لائے۔(۲۸)مسلمانوں نے محمد علی جوہر کو برطانیا روانہ کیا تا کہ وہ سیکرٹری آف سٹیٹ سے مل کر براہ راست اس واقعہ پر احتجاج کر سکیں۔

یو۔پی کی حکومت نے اپنی کسی بھی غلطی کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ الٹا مسلمانوں کے شکووں اور احتجاج کو سلطنت کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔ محمد علی جوہر نے اپنے اخبار کامریڈ میں ۱۲-۱۹۱۱ء میں طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے دوران میں جس طرح ترکی کے عثمانی خلفاء کی تائید وحمایت کی تھی جیمز میسٹن نے اس کو پین اسلامزم کے جن کو زندہ کرنے اور سہارا دینے کی کوشش قرار دیا۔ جیمز میسٹن کے مطابق ''میرے خیال میں اس ایجی ٹیشن کی حقیقی نوعیت تلاش کرنا کوئی زیادہ دشوار کام نہیں ہے۔ سیاسی حالات کے جو پریشان کن نتائج سامنے آئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک خاص قسم کے جوشیلے ہندوستانی مسلمان ہمارے لیے ایک مستقل قسم کا دردِ سر بن گئے ہیں۔ اس گروہ کے ساتھ وہ تنگ نظر اور جذباتی مذہبی رہنما بھی شامل ہو گئے ہیں جنہوں نے ترکوں کی شکست کو برطانیا اور عیسائیوں کے ہندوستان میں عروج کے خلاف اپنے دل میں چھپی ہوئی نفرت کی آگ کو ہوا دینے کے لیے استعمال کیا ہے''۔(۲۹)

محمد علی جوہر کے اس طرح خصوصی توجہ کا مرکز بن جانے سے ان کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ عبداللہ یوسف علی بڑی الجھنوں میں پڑ گئے۔ وہ ایک اعلیٰ اختیار رکھنے والے افسر اور اس صوبائی حکومت کا حصہ تھے جس پر ظلم اور سختی برتنے کا الزام تھا اور اس سے بڑھ کر قابلِ ملامت بات یہ تھی کہ وہ جیمز میسٹن کے بااعتماد اور وفادار ساتھی تھے۔

کان پور کی مسجد کا حادثہ ایک اہم سنگِ میل تھا جس نے مسلمانوں کو واضح طور پر دو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طرف ایسے مسلمان تھے جو جم کر مقابلہ کرنے کے حامی تھے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو خاموش رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم نے دونوں قسم کے

Marfat.com

مسلمانوں میں اس تقسیم اور تفریق کو مزید گہرا کر دیا۔ اس میں ایک جانب محمد علی جوہر تھے جو آئی سی ایس میں ناکام ہوئے اور دوسری طرف سول سروس کے انتہائی اعلیٰ مناصب پر فائز عبداللہ یوسف علی تھے۔ آخر کار یہ جھگڑا بہت زیادہ بڑھنے سے اس وقت رک گیا جب راجہ صاحب محمود آباد کی مفاہمتی مساعی کے نتیجے میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے خود اس قضیے میں مداخلت کی۔ (۳۰)

جیمز میسٹن نے آخر تک کسی قسم کی ندامت کا اظہار نہیں کیا اور وہ یو۔ پی میں اپنی گورنری کے آخری سال یعنی ۱۹۱۸ء تک مسلمانوں کی سرگرمیوں پر سخت نگرانی اور کنٹرول کی پالیسی اختیار کیے رہے۔ اس کے لیے ان کو مخبروں کا بڑا جال بھی بچھانا پڑا۔ (۳۱)

چند سالوں کے بعد عبداللہ یوسف علی نے اپنے ایک مضمون میں جس کا موضوع ''انیسویں صدی اور مابعد'' تھا مسجد کان پور کے واقعہ کا ایک سرسری حوالہ دیتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر بھی کیا، جس میں انتہائی محتاط الفاظ کے باوجود اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ اس وقت کے مسلمانوں کی عام رائے سے مختلف سوچ رکھتے تھے۔ (۳۲)

فروری ۱۹۱۴ء میں عبداللہ یوسف علی نے انڈین سول سروس سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن قواعد وضوابط کی رو سے پنشن کا حق دار قرار دیے جانے کے لیے ۲۰ سال کی ملازمت کا عرصہ پورا کرنا ضروری تھا۔ انہوں نے مسئلے کے حل کے لیے جیمز میسٹن سے مدد طلب کی۔ ان کی درخواست دہلی وائسرائے کے پاس اور پھر لندن سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کو منظوری کے لیے بھیجی گئی جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ برطانوی نظم حکومت ہندوستان کی حد تک کس درجہ مرکزیت کا حامل تھا۔ (۳۳) چالباز میسٹن اپنے مفادات کے تحت عبداللہ یوسف علی کی درخواست کو بہت خوشی سے منظور کروانے کے لیے رضامند ہو گئے۔ انہوں نے وائسرائے کی کونسل کے رکن کو جو داخلی امور کا ذمہ دار تھا ایک انکشافات سے پُر خط تحریر کیا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا:

Marfat.com

''میں یوسف علی کے بارے میں افسردہ ہوں۔ وہ انتہائی ذہین اور قابل انسان ہیں۔ ان کے خیالات بھی بہت اچھے ہیں۔ ان کا علمی و ادبی کام بھی بڑا وقیع اور اعلیٰ درجے کا ہے۔ لیکن وہ انتہائی زود رنج اور حساس طبع ہیں۔ ہندوستانیوں کے ساتھ ان کا رویہ اکثر درشت ہوتا ہے اور وہ ان کو اپنا ہمدرد تصور نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ اکثر غیر ارادی طور پر یورپین افراد کے خلاف بھی اسی رویے کا اظہار کر دیتے ہیں۔

اگر چہ میں ان کو اپنے خیالات کے اعتبار سے محض علمی اور کتابی قسم کا آدمی تصور کرتا تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ ایک چھوٹے ضلع کے منتظم کی حد تک وہ ایک انتہائی کامیاب افسر ثابت ہوئے۔ لیکن کسی بڑے ضلع میں تعیناتی کے بارے میں میں متردّد ہوں، خاص طور پر کسی ایسے ضلع میں تقرر کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا جہاں معاشرے میں تشدد پسندی کا عنصر پایا جاتا ہو۔ صاف الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت افسران کے مستقبل کے بارے میں فکر لاحق ہوگی۔

جن اسباب سے وہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے خواہش مند ہیں وہ معقول اور قوی ہیں۔ انہوں نے رازداری سے بڑی مایوسی اور پریشانی کے احساس کے ساتھ مجھے ان وجوہات کے بارے میں بتایا ہے۔ ان کی شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی تھی جس سے ان کے چار بچے ہیں۔ حالات خراب ہو گئے اور انہیں بیوی کو طلاق دینا پڑی۔ بچوں کو ان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اگر وہ اپنے بچوں کو ہندوستان لا کر تعلیم و تربیت کا انتظام

کرتے تو بچوں کو شدید مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے یہ دانش مندانہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست انگلستان ہی میں کریں۔ جو خاتون وہاں ان بچوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں ان کا حال ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان کا کوئی دوست یا عزیز انگلستان میں ایسا نہیں جن پر وہ بچوں کے معاملے میں اعتماد کر سکیں۔ چنانچہ وہ حقیقی ضرورت کی بنا پر جلد از جلد برطانیا میں سکونت اختیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی خود کر سکیں۔ ان کا وہاں بیرسٹری کی پریکٹس کرنے کا بھی ارادہ ہے اور مجھے اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ وہ وکالت میں انتہائی کامیاب ثابت ہوں گے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے بھی یافت کا معقول ذریعہ پیدا کر سکتے ہیں۔

ان حالات میں عوامی اور ذاتی مفادات دونوں کا لحاظ کرتے ہوئے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے بارے میں ترقیوں میں رکاوٹ کو دور کرنے کے لحاظ سے ایک انتہائی معقول جواز کی گنجائش موجود ہے۔ یہ ایک ایسا کیس ہے جس کو میں سرکاری ریکارڈ پر تو نہیں لا سکتا لیکن مجھے بہت مسرت ہو گی اگر آپ فیصلے کے وقت اس کو منظور کرانے میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکیں''۔ (۳۴)

اگرچہ میسٹن کا یہ نوٹ دفتر کے سرکاری ریکارڈ کا حصہ نہیں تھا لیکن عبداللہ یوسف علی کی شادی کے ختم ہونے کی خبریں لندن میں انڈیا آفس کے حلقوں میں تیزی سے پھیل گئیں۔ مثلاً سر میلکم سیٹان نے جو اسسٹنٹ انڈر سیکرٹری تھے ایک خط میں اپنے افسر بالا کو یہ تحریر کیا ''میں نے

Marfat.com

یوسف علی کا لیکچر سنا ہے۔اس کے علاوہ سر چارلس لائیل نے بھی مجھے اُن کے بارے کافی کچھ بتایا ہے۔وہ غیر معمولی ادبی اور علمی صلاحیت کے حامل ہیں اور میں تو یہ بھی کہوں گا کہ انتہائی دل آویز شخصیت کے بھی مالک ہیں۔شاید آپ انہیں جانتے بھی ہوں۔البتہ میں نے پہلے اُن کی گھریلو زندگی کی پریشانیوں اور الجھنوں کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا''۔(۳۵)

عبداللہ یوسف علی کے استعفے کی وجوہات کے علاوہ جو جیمز میسٹن کے خط میں موجود ہیں ایک اور بات جو اس خط کے مندرجات سے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ انڈین سول سروس میں موجود انگریز افسران ہندوستانی نژاد لوگوں کی اپنے درمیان موجودگی کو کس حد تک تکلیف دہ سمجھتے تھے۔میسٹن،عبداللہ یوسف علی کو رخصت کرنے میں اس لیے بھی خوش تھے کہ ان کے ہٹ جانے سے دوسروں کے ترقی پانے کے راستے کھل جائیں گے۔اور اس طرح اس شرمندگی اور ندامت سے بچنے کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی جو کسی ''مقامی'' شخص کے انگریزوں کا افسر بالا بن جانے کی صورت میں پیش آ سکتی تھی۔جیمز میسٹن کا استدلال انگریزوں کی عمومی سوچ کا مظہر تھا۔ وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے خود ۱۹۰۰ء میں انڈیا آفس کو کارروائی کے نوٹس بھیجتے ہوئے تحریر کیا تھا: ''ویڈربرن نے (جو پارلیمنٹ کے رکن اور ۱۸۸۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے) مجھے بہت مہذب انداز میں ابھی اگلے ہی روز تحریر کیا ہے اور دریافت کیا ہے کہ آخر ہم سول سروس کے اعلیٰ عہدوں کے لیے مقامی لوگوں کو ملازمت میں کیوں نہیں لیتے۔میں نے اپنے جواب میں ان کو بہت سادہ لفظوں میں وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ اس کے لیے مطلوبہ قابلیت وصلاحیت نہیں رکھتے ہیں، اور یہ بھی کہ ہمارے مستقل تجربے میں یہ بات آئی ہے کہ جب ان کی کوئی صاحب اختیار پوزیشن ہوتی ہے یا کوئی ہنگامی صورت حال درپیش ہوتی ہے تو وہ لوگ حواس باختہ اور پریشان ہو کر اکثر ذمہ داری سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔''(۳۶)

Marfat.com

عبداللہ یوسف علی کی نسل کے لوگوں نے مغربی تعلیم کی برتری کی غیر مشروط تعریف و توصیف کی تھی لیکن اس کے حصول کے بعد بھی ان کے تجربے میں یہ بات آئی کہ ان کی تعلیم و تربیت کے مساوی حیثیت اور ذمہ داری ان کو کبھی خوش دلی سے نہیں دی گئی۔

اپنا استعفیٰ بھیجنے کے بعد، اس پر فیصلے کا انتظار کیے بغیر اور یہ جانے بغیر کہ مدت ملازمت کے تناسب سے ان کے لیے کتنی پنشن منظور کی جائے گی، عبداللہ یوسف علی نے بچوں کی دیکھ بھال کی غرض سے ہندوستان سے لندن کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو برطانیا نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ عبداللہ یوسف علی اس وقت سیون اوکس میں کینٹ کاؤنٹی میں مقیم تھے۔ ۱۸ اگست کو انہوں نے انڈیا آفس کو خط لکھا: ''میں پوری طرح تیار ہوں اور مجھے خوشی ہو گی اگر جنگ کے سبب سے کوئی عارضی خدمت میرے سپرد کر دی جائے۔ کسی بھی کارآمد حیثیت میں میں رضا کارانہ کام کرنے کے لیے بھی تیار ہوں''۔ (۳۷) انہوں نے مقامی ویسٹ کینٹ کے رضا کاروں میں بھی جا کر اپنا نام درج کرا دیا۔ (۳۸) اس وقت کے بہت سے ہندوستانیوں کی طرح عبداللہ یوسف علی بھی سلطنت اور تاج برطانیا سے دلی وابستگی رکھتے تھے۔

یہ ایک طرح سے یک طرفہ محبت کا تعلق تھا جس کا کوئی صلہ نہیں تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت برطانیا کے نزدیک اپنے مفادات کا تحفظ زیادہ اہم تھا۔ یہ صحیح ہے کہ برطانیا کے بعض لوگ ایسے ضرور تھے جن کی خود اعتمادی اور رواداری کا رویہ ایسا تھا، جو لوگوں میں یقین و اعتماد پیدا کرتا تھا مثلاً سورت کے کلکٹر مسٹر لٹی جن کی دوستی عبداللہ یوسف علی کے خاندان سے تھی۔ یا پھر مسٹر جیمز میسٹن گورنر یو۔ پی جن کے لیے اُن کے ماتحت عبداللہ یوسف علی نے بہت کام کیا۔ لیکن یہ برطانیا کی حکومت کے کارپردازوں کا ایک سٹائل تھا۔ اگرچہ اُن کے ساتھ اہل برطانیا نے نرمی اور شفقت کا سلوک روا رکھا تھا لیکن پھر بھی عبداللہ یوسف علی 'مادر وطن' کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتے

تھے۔اس وقت مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی بھی لندن میں تھے اور بیک وقت سیاست دان اور سادھو بن کر میدان عمل میں آنے کی تگ ودو کر رہے تھے۔لیکن وہ بھی اپنی وفاداری کا تقاضا نبھاتے ہوئے ہندوستان کے لوگوں کو برطانوی سلطنت کی حمایت کرنے کے لیے آمادہ کر رہے تھے۔(۳۹)

ستمبر کے مہینے تک عبداللہ یوسف علی کو مالی مشکلات نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ان کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ کا مسئلہ ابھی پوری طرح طے نہیں ہوا تھا اور ان کو ابھی اپنی پنشن کی رقم بھی ملنا شروع نہیں ہوئی تھی۔لہٰذا انہوں نے انڈیا آفس کو درخواست دی کہ اس صورت حال میں ان کی مدد کی جائے اور کم از کم کچھ عارضی رقم فراہم کر دی جائے جبکہ پوری رقم معاملہ پوری طرح طے ہونے پر ادا کی جا سکتی ہے۔(۴۰)

لیکن بہر صورت انڈیا آفس نے جلد ہی ان کے واجبات کے بارے میں ایک فیصلہ کر دیا اور جیمز میسٹن کی سفارش قبول کرتے ہوئے مدت ملازمت کے تناسب سے پنشن جاری کر دی جو آٹھ سو پونڈ سالانہ بنی۔(۴۱) یہ ایک معقول آمدنی تھی اور اس طرح عبداللہ یوسف علی کا مستقبل مالی اعتبار سے محفوظ ہو گیا۔اس وقت ان کی عمر ۴۱ سال ہو گئی تھی اور وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اپنا وسائل کے اعتبار سے جائزہ لیں اور مستقبل کے نئے راستوں کا انتخاب کر سکیں۔

ترکی کی خلافت عثمانیہ ینگ ٹرکس کی نا اہل قیادت کے سبب جرمنی کی قیادت میں Central Powers کی طرف جنگ میں ملوث ہو گئی۔(۴۲) ترکی لیڈر شپ جرمنی کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔۱۲۔۱۹۱۱ء کی طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے دوران ہندوستان کے مسلمانوں نے طبی ساز وسامان کے ساتھ ترکی کی امداد کے لیے وفود بھیجے۔عورتوں نے اپنے زیورات بھی امدادی فنڈ میں دے دیے۔اقبال نے ایک جلسے میں پہلے پہل اپنی مشہور نظم "جواب شکوہ" پڑھی جو بلغاریہ کی مہم کے

لیے چندہ جمع کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ ایک اور جلسہ میں جو بادشاہی مسجد میں ہوا اقبال نے طرابلس کے شہیدوں پر اپنی نظم سے سامعین کو رلا دیا۔ محمد علی جوہر کے جذبات بھی عثمانیوں کی شکست پر اس درجہ شدید تھے کہ انہوں نے ایک بار خودکشی کرنے تک کا ارادہ کرلیا۔ ہندوستان کے مسلمان جذباتی طور پر خلافت عثمانی سے اس قدر شدید وابستگی رکھتے تھے کہ وہ اس کو واقعی اور حقیقی ''خلافت اسلامیہ'' سمجھتے تھے۔ اور یہ وابستگی اور تعلق اتنا گہرا تھا کہ وہ لوگ بھی اس بارے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے جو مغربی طرز زندگی اختیار کر چکے تھے، جس کی ایک مثال جسٹس امیر علی کی شخصیت تھی۔ جب برطانیا نے نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو عبداللہ یوسف علی وسیع محمڈن کمیونٹی کے ایک نمائندے کے طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سے پروپیگنڈے کی جنگ میں ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہوئے۔

Marfat.com

حواشی باب دوم

۱- IOL:V/12. ہسٹریز آف سروسز، یونا یٹڈ پروونسز

۲- میلکم ڈارلنگ، ''اپرینٹس ٹو پاور'' ۸-۱۹۰۷ء

۳- ملاحظہ ہو، یوسف علی کا صدارتی خطبہ۔ یونیورسٹی سیکشن، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس گولڈن جوبلی سیشن علی گڑھ ۲۷ مارچ ۱۹۳۷ء (YA 201)

۴- ملاحظہ ہو ''مولانا شبلی نعمانی۔ایک مطالعہ'' مصنفہ مفتون احمد۔ صفحہ ۱۰۳ جس میں شبلی نعمانی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: ''سرسید نے کئی بار مجھ سے کہا تین افراد کے علاوہ برطانیا سے تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو کسی جلسے میں خطاب کرنے کے قابل ہو یا لکھنا جانتا ہو''۔

۵- نکاح کے گواہوں میں ایلس میری شیلڈرز جو غالباً ٹیریسا کی ماں تھیں اور ڈبلیو۔اسکاٹ ایونس کا نام ملتا ہے۔شادی سے پہلے ٹیریسا اور ان کی ماں برن ماؤتھ ویسٹ کے علاقے، ویسٹ بورن پارک روڈ پر ایک فیشن ایبل علاقے میں سمندر کے قریب ہوٹلوں میں سے ایک ہوٹل ''پائن ہوم'' میں سکونت پذیر تھے۔

شادی کا اعلان مقامی اخبار ''برن ماؤتھ آبزرور میں نہیں کیا گیا تھا۔شادی کے دفتر میں دلہن کے والد کا نام آر.ک نوا شیلڈرز درج ہے اور پیشہ کے خانے میں صرف ''جنٹلمین'' لکھا ہے۔نام کے ساتھ شیلڈرز کا لاحقہ خاندان کا تعلق ''ہالینڈ'' سے ظاہر کرتا ہے۔

۶- ادریس (Edris) کی پیدائش کا اندراج، لندن کے جنرل رجسٹر آفس میں نہیں ہوا۔ اصغر بگوئے اور تیسرے بیٹے البان حیدر کے ناموں کا اندراج ۱۹۰۴ء میں ہوا ہے اور

اکتوبر سے دسمبر ۱۹۰۴ء کے رجسٹر میں موجود ہے۔ یہ تاریخیں ظاہر کرتی ہیں کہ کم از کم کچھ عرصے کے لیے ٹیریسا نے ہندوستان میں ضرور سکونت اختیار کی تھی۔

۷- اپنی کتاب ''دی اسپرٹ آف اسلام'' کے ایک ایڈیشن کے دیباچے میں سید امیر علی رقم طراز ہیں: ''میں اس موقع پر مسٹر محمد اقبال کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو کیمبرج میں حکومت ہند کے وظیفے پر ایک سکالر ہیں۔ انہوں نے بڑی احتیاط اور توجہ سے کتاب کے مسودے پر نظر ثانی کی، پروف پڑھے اور مضامین کی فہرست تیار کی''۔ اقبال اور عطیہ فیضی اور ان کے بھائی کی دوستی کے حوالے کے لیے ملاحظہ کیجیے درّانی کی کتاب ''اقبال یورپ میں'' صفحہ ۱۱۹ اور ۱۹۸، اور گاندھی کی تالیف ''ایٹ لائیوز'' صفحہ ۵۱۔ مس فیضی کی عبداللہ یوسف علی سے بھی واقفیت تھی۔ ملاحظہ کیجیے مندرجہ ذیل نوٹ نمبر ۹۔

۸- اس جنازہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حسین بی۔ طیب جی کی تصنیف ''بدرالدین طیب جی۔ اے بائیوگرافی'' صفحہ ۳۵۳۔ عبداللہ یوسف علی کی تقریر ''دی ٹائمز آف انڈیا'' کے ۸ ستمبر ۱۹۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

۹- ملاحظہ ہو: ''جرنل آف دی سوسائٹی آف آرٹس'' نمبر ۲۸۲۴، جلد LV ۴ جنوری ۱۹۰۷ء مقالہ بعنوان ''دی انڈین محمڈنز: دیئر پاسٹ، پریزنٹ اینڈ فیوچر''

یوسف علی کے لالٹین سے دکھائے گئے سلائیڈز میں جن مسلم شخصیتوں کی تصاویر شامل تھیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: نظام آف حیدرآباد، آغا خان، مرحومہ بیگم بھوپال، مس عطیہ فیضی، مرحوم بدرالدین طیب جی، اور سر سید احمد خاں۔

۱۰- ایضاً۔ اس کے بعد کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔

۱۱- وہابیت (Wahhabism) کی اصطلاح اٹھارہویں صدی میں نجد کے ایک مبلغ

Marfat.com

محمد بن عبدالوہاب کے نام سے وابستہ اور مستعار ہے۔ جنہوں نے نبی کریمؐ کے مستند اعمال کی طرف رجوع کرنے کی تحریک چلائی تھی۔ ہندوستان کے وہ مجددین اور مصلحین جن کا تعلق ۱۸ ویں صدی کے ہندوستان کے عظیم مصلح شاہ ولی اللہ سے تھا ''وہابی'' کہے جانے لگے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ بھی ایسے رسم ورواج کی مذمت کرتے تھے جو مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں داخل ہو گئے تھے۔ مثلاً پیروں کی حد سے بڑھی ہوئی عزت وتکریم کے مظاہر اور ان کے مقابر کی تعمیر۔ شاہ ولی اللہ کے دو فکری جانشینوں میں سید احمد بریلوی (۱۸۳۱-۱۷۸۶ء) اور شاہ اسماعیل (۱۸۳۱-۱۷۸۱ء) زیادہ معروف ہوئے اس لیے کہ انہوں نے شمال مغربی ہندوستان کے علاقے میں سکھوں کے خلاف جہاد کی غرض سے تحریک مجاہدین کو منظم کیا تھا۔ سید احمد کے انتقال کے بعد تحریک کا رخ برطانیا کی مخالفت کی طرف ہو گیا تھا۔

سر سید احمد خاں کا استدلال یہ تھا کہ ہندوستان کے یہ اولین وہابی حضرات سلطنت برطانیا کے وفادار تھے۔ ان کے الفاظ ہیں: ''جہادی لوگوں کے رہنما سید احمد تھے لیکن وہ کوئی مبلغ نہیں تھے۔ مولوی اسماعیل البتہ وہ شخص تھے جن کے وعظ ونصیحت مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیتے تھے۔ اپنی پوری تبلیغی مساعی کے دوران ان کی زبان سے کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کے جذبات انگریزوں کے خلاف بھڑکانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ انگریزوں کی عمل داری میں مسلمان ظلم کا شکار نہیں ہیں۔ اور چونکہ وہ حکومت کی رعایا ہیں اس لیے مذہبی اعتبار سے حکومت کے خلاف جہاد کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد حالات البتہ بدل گئے اور مایوس اور بددل افراد کا ایک گروہ شمال مغربی سرحدوں کی

Marfat.com

طرف فرار ہو گیا اور حکومت کے خلاف ایک مذہبی نوعیت کی جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ اس گروہ کو بمشکل ہی جہادی کمیونٹی کا نام دینا ممکن ہے''۔ ملاحظہ ہو: ''دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خاں'' مؤلفہ جی۔ ایف، آئی گراہم۔

۱۲- اپنی تقریر میں عبداللہ یوسف علی نے مسلم تاریخ میں خواتین کے کردار پر کافی توجہ صرف کی، اگرچہ اس تقریر میں معذرت خواہانہ الفاظ کا اضافہ بھی یہ کہتے ہوئے کر ڈالا: ''میں یہ سب کہتے ہوئے ان ناانصافیوں کا دفاع ہرگز نہیں کر رہا ہوں جنہوں نے ہمارے سماجی درو بست کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے اور جس کے نتیجے میں عورتوں سے زیادہ مردوں کو نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اب مسلمانوں کی نئی نسل میں ان ناانصافیوں کا شعور بیدار ہو رہا ہے''۔ ایضاً ''دی انڈین محمڈنز''۔

۱۳- ایضاً

۱۴- ''جرنل آف دی سوسائٹی آف آرٹس'' ۲۸ جون ۱۹۰۷ء

عبداللہ یوسف علی نے اس امر کا اہتمام کیا تھا کہ ان کا مقالہ اور اس سے متعلق بحث و گفتگو ایک پمفلٹ/کتابچہ کی صورت میں طبع ہو جائے۔ یہ کتابچہ میسرز پی۔ ایس کنگ اینڈ سنز ۲، گریٹ اسٹریٹ ویسٹ منسٹر نے شائع کیا تھا۔

۱۵- جارج برڈ ووڈ کے نام انتساب (کے الفاظ کا مفہوم کچھ یوں ہے):

وہ شخص جس کو اس کے باطن کی روشنی نے مشرق کی روح کا خاص ادراک بخشا ہے اور جس میں ہندوستان کے لازوال لوگوں کے فنون اور ادب کی زندگی نے ہمدردی کے دائمی اور پائیدار احساسات کا اضافہ کیا ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب اسے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کی بے انتہا کریمانہ شفقت اور عنایتوں کے اعتراف کے ساتھ جو اس

Marfat.com

مصنف کی ذات پر اس کی جانب سے کیے گئے''۔ یہ سطور عبداللہ یوسف علی کے والہانہ جذبات تشکر کی ایک مثال ہے جو وہ ان لوگوں کے لیے ظاہر کرتے تھے جن سے ان کی دوستی تھی۔

۱۶۔ ''لائف اینڈ لیبر'' صفحہ ۳۴۵۔ بعد کے اقتباسات صفحہ ۳۴۵ سے ۳۴۹ تک سے ماخوذ ہیں۔

۱۷۔ ''دی ٹائمز'' ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء ''جہاں تک تعلیم کا معاملہ ہے تو اگر یہ ناممکن ہو کہ مذہب کے بارے میں ایک متفقہ نقطۂ نظر اپنایا جا سکے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہندوستان اور دوسری ریاستوں کی طرح تعلیم کو سیکولر رہنے دیا جائے اور مذہب کا معاملہ تعلیم سے علیحدہ رکھا جائے''۔ اس طرح کا بیان جو ایک نامور مسلمان شخصیت کی طرف سے جاری کیا گیا ان لوگوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے مترادف تھا جو علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

۱۸۔ عبداللہ یوسف علی نے مورلیسن کے جواب میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا: ''یہ ایک متنازع موضوع ہے اس لیے میں نے اس پر بحث و گفتگو سے پرہیز کیا ہے''۔ ''دی انڈین محمڈنز'' ایضاً۔ برطانوی حکومت مسلم یونیورسٹی کے قیام کو تسلیم کرنے میں متردد تھی اور حکومت اور آزاد سوچ رکھنے والوں کے مابین ایک قسم کی مقابلہ آرائی جاری تھی۔ آزادانہ فکر کے حامل افراد میں محمد علی جوہر اور شبلی جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ حکومت یونیورسٹی کے معاملات میں ''ویٹو'' کے اختیارات ہی نہیں چاہتی تھی بلکہ اس کو یونیورسٹی کے ساتھ ''مسلم'' لگانے پر بھی اعتراض تھا۔ حکومت کے نزدیک صرف علی گڑھ یونیورسٹی کافی تھا۔ اس بحث و مباحثہ میں برطانوی نقطۂ نظر اور مفادات کے

Marfat.com

علم بردار راجہ صاحب آف محمود آباد تھے جو مسلم لیگ کی ایک با اثر شخصیت تھے۔ اس کشمکش کی تفصیلی روداد کے لیے دیکھیے: ''مولانا شبلی نعمانی۔ ایک مطالعہ'' مصنفہ مفتون احمد۔ صفحہ ۷۱۔ ۷۰

۱۹۔ اکبر حیدری کے علی گڑھ کے متعلق افکار و خیالات اور ان کی زندگی کے بارے میں معلومات کے بارے میں ملاحظہ کیجیے ''Eminent Mussulmans'' مطبوعہ مدراس ۱۹۲۲ء مصنفہ Natesen۔ علی گڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ بالآخر ۱۹۲۰ء میں مل گیا۔ اکبر حیدری اور عبداللہ یوسف علی دونوں ہی بعد میں یونیورسٹی کورٹ کے ارکان میں شامل ہوئے۔

۲۰۔ ''لائف اینڈ لیبر'' دیباچہ۔ اقتباس ایک الجھن کا سا اسلوب لیے آگے یوں چلتا ہے: ''اگر ایک چوتھی خصوصیت کا اضافہ کرنا ہو تو یوں کہا جائے گا کہ ایک کھلا ہوا، سوچنے والا دماغ اور شعور و ادراک کی صلاحیت ہی وہ چیز نہیں ہے جو ذاتی اور عوامی زندگی میں دور تک اثر انداز ہوتی ہو جس کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے بلکہ سماجی مسائل کے بارے میں بحث و مباحثہ کی صورت میں کوئی رائے بھی حرف آخر نہیں سمجھی جا سکتی۔''

۲۱۔ ''دی ٹائمز'' لندن میں مطبوعہ مراسلہ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۲۸ء

مورلے کا رویہ ان اقدام کا عکاس ہے جو جان بوجھ کر ہندوستان میں سیاسی ارتقا کے عمل کی رفتار کو روکنے کے لیے اٹھائے گئے تھے۔ جس میں لبرل ذہن رکھنے والے اصلاح پسند بھی شریک تھے۔ یہ اس معیار سے مختلف معیار تھا جو آسٹریلیا یا کینیڈا کے بارے میں اختیار کیا گیا تھا۔

۲۲۔ ارل آف کرومر یونانیات سے گہری دلچسپی رکھنے والے عالم تھے۔ اس میدان میں

Marfat.com

عبداللہ یوسف علی کی فضیلت غالباً ان دونوں کی رفاقت کا سبب رہی ہوگی۔ کرومر ہال سے یوسف علی کی وابستگی کا حوالہ ان کاغذات میں بھی ملتا ہے جو طلاق کے لیے ۱۹۱۱ء میں انہوں نے داخل کیے تھے۔

۲۳۔ جیمز میسٹن ''کردار'' کا جائزہ لیتے وقت بہت سخت ہو جاتے تھے اور کسی بھی درجے میں ذرا بھی نرمی یا رعایت کے روادار نہیں ہوتے تھے۔ وارث علی کے بارے میں ان کے مشاہدات و تاثرات بڑے چبھتے ہوئے اور گہرائی تک جانے والے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ''وہ ذہنی بیماری اور شدت احساس کا مارا ہوا انسان ہے۔ اس کے کان اس وقت کھڑے ہو جاتے ہیں جب اسے یہ خیال آئے کہ ہم اس کے بارے میں کچھ کرنے والے ہیں۔ وہ اپنی اس کیفیت اور اس کے تفصیلی تجزیے کے لیے گہری سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔ ایک بار مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کو ہندوستان میں روکنے کی کوشش کرنا بالکل بے کار ہوگا۔ میں نے اس کے والد کو خط لکھ کر اس بات کا اشارہ دیا تھا۔ بعد میں جب میں اگلے موسم خزاں میں اس کے والدین سے لندن میں ملا اور اس بارے میں تفصیل سے بات ہوئی تو میں نے آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ ایک بار مزید کوشش کر کے اس لڑکے کو ہندوستان میں روکا جائے۔ اس لیے کہ ہم سب ہی اسے پسند کرتے ہیں، جو بہت ذہین اور متعدد دوسری خوبیوں کا بھی مالک ہے''۔ ملاحظہ کیجیے Mss Eur 136/3 مکتوب مورخہ ۱۷ جون ۱۹۱۴ء

ایک اور جگہ مسٹن نے وارث کو ''کمزور سی لکڑی'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ وارث نے برک شائر میں واقع ایک عسکری روایات کے حامل پبلک سکول ''ولنگٹن کالج'' میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آئی سی ایس افسر کی حیثیت سے وارث نے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۹ء

تک خدمات انجام دیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد لندن ہی میں سکونت اختیار کر لی۔

۲۴- (IOL:V/12/232(1913 ہسٹریز آف سروسز یونائیٹڈ پروونسز

۲۵- ''دی ہولی قرآن: ٹیکسٹ، ٹرانسلیشن اینڈ کمنٹری'' (قرآن مجید، متن، ترجمہ اور تفسیر) تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء، اقتباس پہلے ایڈیشن کے دیباچے سے ماخوذ ہے۔

۲۶- طلاق کے بارے میں تفصیلات پبلک ریکارڈ آفس لندن کے سینئر رجسٹرار کی اجازت سے حاصل کی گئی ہیں۔

طلاق کی قانونی درخواست داخل کرتے وقت عبداللہ یوسف علی نے اپنا پورا نام ''عبداللہ ابن یوسف علی'' لکھا تھا۔ اس دستاویز میں ان ساری جگہوں کے پتوں کی تفصیل بھی درج ہے جہاں وہ دونوں میاں بیوی ماضی میں سکونت رکھ چکے تھے۔ جن میں ایک سینٹ البانز اور دوسرا کرومر ہاؤس، نارفوک کا پتا ہے اور ساتھ ہی ''دوسری کئی مختلف جگہوں'' کے الفاظ بھی درج ہیں۔ اس میں چاروں بچوں کے نام اور پیدائش کی تاریخیں بھی دی گئی ہیں۔ جس وقت یہ درخواست داخل کی گئی تھی ٹیریسا میری ''کروی'' سینٹ البانز میں مقیم نہیں تھیں بلکہ ان کا قیام Halesowen, Grove Park Road, Chiswick میں تھا۔ طلاق کی درخواست میں تمام ناگفتنی تفصیلات بھی درج ہیں، مثلاً ''مذکورہ ٹیریسا میری یوسف علی نے کئی مرتبہ Obed Thorne کے ساتھ غیر قانونی ازدواجی تعلق قائم کیا۔ اور یہ کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۰۹ء کو یا اس کے لگ بھگ کسی تاریخ کو مذکورہ ٹیریسا میری یوسف علی نے بریڈفورڈ کی کاؤنٹی میں واقع مارک پیٹ کے گرینج کاٹیج میں مذکورہ شخص اوبڈ تھورن کے ساتھ زنا کیا۔ پھر ۲۳ ستمبر ۱۹۱۰ء کو مذکورہ ٹیریسا میری یوسف علی نے ایک

Marfat.com

بچے کو جنم دیا جس کا یہ درخواست گزار باپ نہیں بلکہ اس بچے کا باپ مذکورہ شخص اوبڈ تھورن ہے''۔

۲۷- IOL:Meston Papers,Mrs.Eur F/136/3, ملاحظہ ہو، بالخصوص میسٹن کا سرکاری دفتری نوٹ نمبر 136/15 جو واقعہ کی مکمل تفصیل فراہم کرتا ہے۔

۲۸- ملاحظہ ہو: ''یادایام'' میاں امیرالدین صفحہ ۳۸

۲۹- IOL:Mss Eur F 136/15 یہ عناد اور نفرت میسٹن کی فری میسن کی رکنیت سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھی جا سکتی۔ ۱۹۲۰ء میں ان کو برک شائر کے رائل آرچ میسنز کے صوبائی گرینڈ چیپٹر کا گرینڈ سپرنٹنڈنٹ بنایا گیا۔ ملاحظہ ہو ڈکشنری آف نیشنل بائیو گرافی (۵۰۔۱۹۴۱ء) آکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۹ء۔ فری میسنوں نے عرصہ دراز سے عثمانی ترکوں کو کمزور کرنے کی سازشیں جاری رکھی ہوئی تھیں اور اسی سبب سے وہ پین اسلامزم کے بھی مخالف تھے۔ ایک میسنی جرنل مطبوعہ ۱۹۰۷ء میں یہ بات درج ہے۔'' یہ لوگ جو ینگ ٹرکس یا ریفارم پارٹی بنائے ہوئے ہیں اور جس میں شاہی خاندان کے بہت سے شہزادے بھی شامل ہیں Masons کے زیر اثر ہیں۔ لیکن سلطان عبدالحمید ہمیشہ کی طرح اب بھی فری میسنز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں یہ یقین ہے کہ سیاسی آزادی اور اصلاح کے نام پر کی جانی والی فری میسنز کی تمام کارروائیاں دراصل ان کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے ہیں''۔ (The Free Masons) ۲۹ جون ۱۹۰۷ء برٹش لائبریری کولنڈیل میں موجود ہے۔ میسٹن نے بعد کی زندگی میں لیگ آف نیشنز کی مالیاتی کمیٹی کی نگرانی میں بھی وقت گزارا۔ وہ رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز، چیٹہم ہاؤس (Chatham House) کے

Marfat.com

بانیوں میں سے تھے۔

۳۰۔ راجہ صاحب محمود آباد کی تجویز، جوانہوں نے وائسرائے کو پیش کی تھی، میں کہا گیا تھا کہ مسلمان اس بات کا اقرار کریں گے کہ وہ غلطی پر تھے اور اس غلطی کی معافی طلب کریں گے، جب کہ وائسرائے مسلمانوں کو منہدم شدہ وضو خانے کی جگہ پر ایک بالائی گزرگاہ بنانے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے، جس کے بالائی حصے کو مسجد کا ایک حصہ سمجھا جائے گا اور اس واقعہ کے حوالے سے سارے فسادی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ IOL: Meston Papers ایضاً

۳۱۔ ایک معروف مخبر فتح علی خاں نواب آف قزلباش تھے جو میسٹن کو مسلم لیگ کی درون خانہ اطلاعات فراہم کرتے تھے اور نواب رام پور پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے رہتے تھے جن کے دربار میں علی برادران کے اعزہ ملازم تھے۔ فتح علی خاں نے نواب رام پور کی ریاستی زندگی کی بہت دلچسپ جھلکیاں پیش کی ہیں۔ فتح علی کی تحریر سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو" دل چاہتا تھا کہ میرے پاس فرصت ہوتی اور میں ہز ہائنس (نواب رام پور) کے ہاں مزید قیام کرتا اور اپنی موجودگی میں کچھ ناپسندیدہ افراد کو اُن کے دربار سے نکلوا دیتا اور نواب صاحب کی ایک انتہائی غیر معمولی عادت سے ان کو چھٹکارا دلواتا جو یہ تھی کہ وہ رات کو بہت دیر تک جاگتے رہتے اور صبح کو دن چڑھے بہت دیر تک سوتے رہتے تھے۔ کسی قسم کی جسمانی ورزش نہیں کرتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے۔" فتح علی خاں کا مکتوب بنام میسٹن، مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۱۴ء IOL:Mss Eur F 136/5 مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری

Marfat.com

۳۲- ملاحظہ ہو ''انیسویں صدی اور مابعد'' مارچ ۱۹۸۶ء کان پور کی مسجد کے واقعہ کا حوالہ عبداللہ یوسف علی کے اس مضمون میں موجود ہے جو ہندوستان سے رخصت ہونے والے وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ ہارڈنگ لندن واپس جانے کے بعد دفتر خارجہ کے مستقل سیکرٹری مقرر ہو گئے تھے۔

۳۳- IOL:L/P&J/6/1261(1914)

۳۴- ایضاً IOL/ میسٹن کا مراسلہ بنام کریڈک (Craddock) فروری ۱۹۱۴ء

۳۵- IOL:L/P and J/6/1261(1914) سیٹن (Seton) کا مراسلہ ہولڈرنس (Holderness) کے نام ۲۷ اپریل ۱۹۱۴ء

۳۶- ملاحظہ کیجیے ''سلیکٹ ڈاکومینٹس آن دی ہسٹری آف انڈیا اینڈ پاکستان جلد IV ایڈیٹر: سی ایچ فلپس: لارڈ کرزن کا مراسلہ لارڈ ہیملٹن کے نام۔ ۲۳ اپریل ۱۹۰۰ء۔ ہندوستانیوں کو برطانوی راج کے ان حلقوں میں شامل کرنے کی اجازت دینے کے بارے میں شدید تردد پایا جاتا تھا جہاں اہم فیصلے کیے جانے ہوتے تھے۔ وائسرائے کی کونسل کے پہلے ہندوستانی ممبر سر ایس پی سنہا تھے جو عبداللہ یوسف علی کے آئی سی ایس میں شامل ہونے کے تیرہ (۱۳) سال بعد کونسل کے ممبر مقرر ہوئے تھے۔ سنہا کی موجودگی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ کونسل کے اجلاسوں میں بہت کم اہم کاغذات ارکان کو تقسیم کیے جانے لگے۔ محض اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں اس طرح ریاست کے رازوں کا افشا نہ ہو جائے اور اس طرح تمام کام تلپٹ ہو جائیں۔

۳۷- IOL L/P&J/6/1261(1914) عبداللہ یوسف علی کا مراسلہ سیٹن (Seton) کے نام۔ یہ مراسلہ بریڈ برن نامی جاگیر سے بھیجا گیا تھا۔ جو سیون

اوکس کے نزدیک ریور ہیڈ کے علاقے میں واقع تھی۔ کینٹ کے کے ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں ایک Bradbourne Hall تھا جو ولیم گور لمبارڈ کی ملکیت تھا، اور وہی اس میں سکونت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بریڈ برن ہاؤس بھی تھا جو جیکب ولیم ہلس کی ملکیت تھا۔ عبداللہ یوسف علی کا قیام ان دونوں میں سے کسی ایک میں رہا ہوگا۔

۳۸- ملاحظہ ہو دی ٹائمنر، لندن کا عبداللہ یوسف علی کے بارے میں تعزیتی نوٹ، مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۳ء۔ ''اس ملک میں اقامت اختیار کرنے کے بعد عبداللہ یوسف علی نے ۱۸-۱۹۱۴ کی جنگ کی مساعی کے حوالے سے بہت سے مفید کام کیے۔ جس میں ان کی فوجی بھرتی کے لیے اپیلیں اور دوسرا بہت سا پروپیگنڈا لٹریچر شامل تھا جو انہوں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تحریر کیا تھا۔ ویسٹ کنٹ کے رضا کاروں کی جماعت میں ایک غیر سرکاری فرد کی حیثیت سے اور انڈین سٹوڈنٹس کے پرزنرز آف وار فنڈ کے صدر کی حیثیت میں بھی انہوں نے خاصی محنت کی۔

۳۹- گاندھی جی نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے'' میں نے محسوس کیا کہ وہ ہندوستانی جو انگلستان میں مقیم ہیں ان کو جنگ میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے۔ انگریز طالب علموں نے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر فوجی خدمات کے لیے پیش کیا تھا۔ ہندوستانیوں کو بھی اس بارے میں پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ میں نے سوچا کہ اس وقت جب کہ انگلستان ضرورت مند ہے ہمیں موقع پرستی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اور یہ بات زیادہ مستحسن اور دور اندیشی پر مبنی ہوگی اگر ہم جنگ کے دوران اپنے مطالبات پر زور دینا ترک کر دیں۔ چنانچہ اپنی رائے کے مطابق میں نے ان لوگوں کو مدعو کیا جو رضا کاروں میں اپنا

Marfat.com

نام لکھوانا چاہتے ہوں۔ میں نے لارڈ کریو کو خط لکھا اور ان کو ان حقائق سے مطلع کرنے کے ساتھ یہ بتایا کہ ہم لوگوں کو ایمبولینس کے کام کے لیے تربیت دینے کے لیے تیار ہیں۔ ایم کے گاندھی "An Autobiography"۔

۴۰- IOL:/L/P&J/6/1261(1914) عبداللہ یوسف علی کا مراسلہ ہولڈرنس کے نام۔ مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۱۴ء۔ ''جناب عالی! میں آپ کے مراسلہ نمبر J&P ۱۳۲۵ مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۱۴ء کے لیے شکریہ ادا کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری ریٹائرمنٹ ۴ ستمبر ۱۹۱۴ء سے شروع ہو جائے گی۔ اس تاریخ میں میرے حساب میں جو رقم جنرل پراویڈنٹ فنڈ میں موجود ہوگی وہ مجھ کو قابل ادائیگی سمجھی جائے گی۔ میری درخواست ہے کہ اس تاریخ تک کی میری رقم مع سود مجھے ادا کر دی جائے۔ اگر رقم کے حساب کتاب کرنے میں زیادہ وقت لگنے کا امکان ہو تو میری درخواست یہ ہے کہ اندازاً کچھ رقم مجھے ادا کر دی جائے اور جو بقایاجات ہوں وہ حسابات کی تصدیق کے مکمل ہو جانے کے بعد شامل حساب کیے جائیں۔

۴۱- انڈیا آفس لائبریری IOL۔ ایضاً شعبہ پنشن اور گریجوئٹی، فنانس ڈپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کا میمورنڈم بنام سیکرٹری آف سٹیٹ۔ انڈیا۔ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۴ء۔ ''ہم لیفٹیننٹ گورنر کی اس رائے سے متفق ہیں کہ یہ معاملہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے اور ہم ان کی اس سفارش کی تائید کرتے ہیں کہ مسٹر عبداللہ یوسف علی کو ملازمت کے تناسب سے پنشن لے کر ریٹائر ہونے کی اجازت دی جائے، جس کی رقم تقریباً ۴۸۷ پونڈ سالانہ ہوگی''۔

۴۲- زیرک سلطان عبدالحمید ثانی کو ''ینگ ٹرکس'' نے اپریل ۱۹۰۹ء میں حکومت چھوڑ دینے

Marfat.com

پر مجبور کر دیا۔ اس کی روداد کا ایک حصہ - جو سر ایف۔ اے۔ ہرزل سیکرٹری پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ، انڈیا آفس نے تیار کی تھی - ترکی کے جنگ میں شامل ہونے کا پس منظر فراہم کرتا ہے۔ ''۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء کا فوجی انقلاب جس کے نتیجے میں ''ینگ ٹرکس'' کا حکومت پر قبضہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اصلاً اس کے مالی وسائل ہنگری کے اس ممتاز شخص ایم۔ ڈی۔ سزمیر اور جرمن یہودیوں کے ایک گروہ نے فراہم کیے تھے۔ اس کی کامیابی کے بعد ترکی کی نئی حکومت پر جرمن اثرات میں مستقلاً اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جس کی انتہا یہ تھی کہ لیمان وی سینڈرز پاشا کو سلطان کے دربار کا عسکری مشیر مقرر کیا گیا اور اس کو اتنے زیادہ اختیارات دے دیے گئے جتنے کبھی بھی کسی غیر ملکی شخص کو خلافت عثمانی کے تمام عرصے میں نہیں دیے گئے تھے۔ جرمن افسران نے اب یہ مشورہ دیا کہ یونانی آبادی کو ترکی کے بیش تر حصوں سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ کارروائی غیر ضروری عجلت سے کی گئی اور اس کے نتیجے میں کئی بار بڑی ناخوش گوار صورت حال بھی پیش آئی اس لیے کہ آبادی میں غصہ اور ناراضگی پیدا ہوئی۔ مئی ۱۹۱۴ء میں جرمنی کا جنگی جہاز گوبن دوسری بار قسطنطنیہ میں پہنچا۔ ایڈمرل شوشان نے جو بحیرہ روم میں جرمنی کے اسکواڈرن کے کمانڈر تھے اس جہاز پر اپنا پرچم لہرا رکھا تھا۔ انور پاشا (وزیر جنگ جن کی عمر صرف ۳۴ سال تھی) اور ایڈمرل کے مابین کئی خفیہ ملاقاتیں ہوئیں، جن میں سے بعض میں لیمان سینڈرز بھی موجود رہے۔ ۹/ اگست کو دو جنگی جہاز گوبن اور برلیلاو درہ دانیال میں داخل ہوئے اور ترکی کے سمندری علاقے میں عام خرید و فروخت کے بہانے موجود رہے''۔

ملاحظہ کیجیے IOL:MSSF 136/15

اس بحری چھیڑ چھاڑ کے جواب میں برطانیا نے ترکی کے ان دو بحری جہازوں پر اپنا قبضہ جمالیا جو اس وقت برطانیا کے شپ یارڈ میں تیار کیے جا رہے تھے۔ اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا گیا اور اس انتہائی بھونڈے طرز نے ترکی کی دشمنی کے جذبات میں عوامی سطح پر اضافہ کر دیا۔ بالخصوص اس لیے کہ ان جہازوں کی لاگت یا قیمت پانچ لاکھ پونڈ بنتی تھی۔ جس کا اکثر حصہ عوامی چندے اور تعاون سے ادا کیا گیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء تک ایڈمرل شوشان ترکی کے بحری بیڑے کی قیادت سمندری راستوں میں کر رہے تھے۔ اور برطانیا نے رسمی اعلان جنگ کی بھی ضرورت محسوس کیے بغیر درہ دانیال کے داخلے کے مقام پر واقع قلعوں پر بمباری کا آغاز کر دیا۔

باب سوم

تاج برطانیا کے لیے خدمات

جنگ عظیم کے اولین سالوں میں بہت بڑی بڑی عسکری مہمات منظم کی گئیں، لیکن ان کے نتائج لائیڈ جارج اور دوسرے ممتاز برطانوی سیاست دانوں کی توقع کے مطابق نہیں نکلے، بلکہ اس کے برعکس صورت حال میں ایک جمود اور ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا تھا جو شکست سے قریب تر تھا۔ بالخصوص یہ صورت حال اس وقت زیادہ نمایاں ہوئی جب اتحادیوں کو ترکی کے انتہائی بھرپور حملوں کے نتیجے میں گلی پولی سے پیچھے ہٹنا پڑا، جو ہزیمت ہی کی ایک صورت تھی۔

حالات کے اس طرح پلٹا کھانے سے دونوں فریقوں کو پروپیگنڈے کی اہمیت کا شدید احساس ہوا۔ اگر ایک طرف برطانیا نے یہ کہانی مشہور کی کہ شاہ قیصر بچوں کو کھا جاتا ہے تو جرمنوں نے اس پروپیگنڈے کے جواب میں یہ افواہ اڑائی کہ شاہ انگلستان فرار ہو گیا ہے، اور اس کو لکھنؤ یا دلی میں دیکھا گیا ہے۔ برطانیا کے لیے پروپیگنڈے کی یہ جنگ بہت اہم اس لیے تھی کہ اس کے ذریعے وہ غیر جانب دار ممالک کو اتحادیوں کے ساتھ مل جانے کی ترغیب دے سکتا تھا۔ اسی کے ذریعے وہ یونائٹڈ سٹیٹس آف امریکا کو ہم نوا بنانے میں کامیاب ہوا تھا، اور سویڈن کو بھی، جو جرمنی کے لیے گولہ بارود فراہم کرنے والا سب سے اہم ملک تھا، غیر جانب دار رکھنے میں کامیابی ہو سکی تھی۔ برطانیا کو یہ حکمت عملی اختیار کرنے کی شدید ضرورت اس لیے بھی تھی کہ بلقان کی ریاستوں کو مرکزی طاقتوں Central Powers کے ساتھ ملنے نہ دیا جائے۔

ترکی کے جنگ میں شامل ہو جانے کے بعد جنگ کی آگ پوری شدت سے اپنے ساتھ آنے والی تباہی لیے ہوئے بھڑک اٹھی۔ اس صورت حال میں ہندوستان کے مسلمانوں کی

Marfat.com

عثمانی خلیفہ سے ہمدردی کے لیے مناسب بنیادیں موجود تھیں۔حکومت ہند نے بڑی ہنرمندی سے ایسے طریقے اختیار کیے جس سے حالات قابو میں رہیں۔کسی کو جلاوطن کیا اور کسی کو گرفتار۔فوج میں موجود ہندوستانی سپاہیوں کو اس بات کی بار بار یقین دہانی کرائی گئی کہ عرب کے مقدس مقامات ہر قسم کے حملے کی زد سے محفوظ رہیں گے۔(۱) ممتاز مسلمان نوابوں مثلاً نظام آف حیدر آباد کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ ترکی کے خلاف برطانیا کی کارروائی کی حمایت میں کھل کر اعلانات کریں۔کہا گیا کہ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ برطانوی حکومت کی وفاداری میں ذرہ برابر بھی کمی نہ ہونے دیں، اور بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹیں، کسی کی چالوں میں آکر دھوکا نہ کھائیں، کہ برطانیا کی حکومت کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کر بیٹھیں۔(۲) جنگ کے دوران بہت بڑی تعداد میں ہندوستانی فوجی سپاہیوں کو مختلف محاذوں پر متعین کیا گیا تھا۔ایسے وقت میں جب کہ فتح کے امکانات کم ہوتے نظر آرہے تھے، ہندوستانی سپاہیوں میں کسی قسم کی عدم وفاداری کے آثار یا نئے سپاہیوں کی بھرتی کی رفتار کا کم ہوجانا برطانیا کی حکومت کے لیے موت کا پروانہ ہوتا۔یہ وہ پس منظر تھا جس میں عبداللہ یوسف علی نے ''دی ٹائمز'' کے ایڈیٹر کے نام ۱۴ نومبر ۱۹۱۴ء میں ایک خط لکھا جس میں بین السطور انہوں نے ان حالات میں اپنے لیے ایک کردار بھی تجویز کر ڈالا۔وہ لکھتے ہیں:

''مقبول عام افواہوں کی شکل میں جو بے بنیاد متعصبانہ اور ہوائی قسم کے خیالات اس وقت پھیلائے گئے ہیں ان سے ہندوستان اور سلطنت برطانیا سے اخلاص رکھنے والا کوئی بھی شخص بے اعتنائی نہیں برت سکتا۔حکمت عملی کی چالوں کی مانند جو بھی کسی خبر کو پہلے پھیلا دیتا ہے وہ میدان مار لیتا ہے۔کیا لندن میں ہمارا پریس بیورو کسی ایسے شخص کی مدد سے جو دیسی ہندوستان کے مزاج کو سمجھتا ہو یہ نہیں کر سکتا کہ روزانہ خبروں کے بلیٹن تیار کرے جو وائسرائے کو بھیجے جائیں تاکہ وہاں ان کو تمام اہم مقامی زبانوں میں منتقل کر کے ہر تھانہ اور تحصیل میں نوٹس بورڈ پر چسپاں کیا جاسکے،

اوراخباروں کو بھی پہنچایا جا سکے۔ جہاں تک ہندوستان کے روشن خیال لوگوں کا تعلق ہے ان کی طرف سے تو کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن کیا یہ امر قابل توجہ نہیں ہے کہ عوام کو خبروں اور اطلاعات کی جو پیاس ہے اور ان کے جو احساسات ہیں ان کی تسکین کا بھی بندوبست کیا جائے اور ہندوستان کے وہ سپاہی جن کا خون میدان جنگ کے محاذوں پر گر رہا ہے ان کی بھی تسلی کے لیے اطلاعات کا نظام بنایا جائے''۔

عبداللہ یوسف علی نے ایک ہی ہفتہ بعد ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء کو کیکسٹن ہال میں تقریر کرتے ہوئے ایک بار پھر بڑی دیدہ دلیری سے اپنی وفاداریوں کا اعلان کیا۔کوئی اور اس موقع پر شاید اس بات سے مرعوب ہو سکتا تھا کہ جلسے کی صدارت ہندوستانی فوج کے سابق کمانڈر ان چیف کر رہے تھے، لیکن عبداللہ یوسف علی قطعاً کسی جھجک اور تامل کے بغیر اپنی قوت گفتار اور زبان پر قدرت اور اظہار کی صلاحیت کے بل بوتے پر سامعین جلسہ کو یہ ضرور سمجھانے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے کہ پروپیگنڈے کا فن کیا ہوتا ہے۔ جلسے کی کارروائی اور عبداللہ یوسف علی کی تقریر کا کچھ حصہ ملاحظہ کیجیے:

چیئر مین: (جنرل سر او مور کریغ، وی۔سی (Gen.Sir O'Moore Creagh, VC) ''خواتین و حضرات! میں آج اس شام میں آپ کا تعارف مسٹر عبداللہ یوسف علی سے کرانا چاہتا ہوں۔انہوں نے کیمبرج میں بہت کامیاب اور شاندار کیریر کا مظاہرہ کیا ہے، اور اس طرح انڈین سول سروس میں بھی انہوں نے بہت کامیاب اور ممتاز حیثیت سے کام کیا ہے۔ حال ہی میں انہوں نے سروس سے استعفیٰ دیا ہے۔ آج وہ اپنا مقالہ ''ہندوستان۔ پرچم کے دفاع کے لیے'' پیش کریں گے۔

عبداللہ یوسف علی: ''جناب چیئر مین، معزز خواتین و حضرات!

''جب مجھ سے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے لیے ایک مقالہ پیش کرنے کو کہا گیا تو پہلے میرا خیال ایک سادہ، آسان اور کارآمد سا مقالہ پیش کرنے کا ہوا۔ لیکن جب میں نے قلم اٹھایا اور مضمون کے موضوع نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے ایک ایسا مقالہ لکھنا چاہیے جو اس اہم موقع کا تقاضا پورا کرتا ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے مجھے آپ سے اس اسلوب اور سٹائل کے لیے معذرت کرنا پڑ رہی ہے جس کو مقالے میں اختیار کیا گیا ہے۔ میرا انداز بیان کچھ جذباتی سا ہو گیا ہے۔ مسئلہ کے جذباتی پہلوؤں سے ہی زیادہ بحث کرنا ہے اور کام کے عملی پہلو صرف ضرورت ہی کی حد تک اس میں زیر بحث آئے ہیں۔

''ہندوستان کا برطانیا کے پرچم کو سربلند رکھنے کے لیے جمع ہو کر متحدہ کوشش کرنے کا عمل اس قدر شاندار یکجہتی کا مظہر ہے کہ انڈیا اور انگلینڈ دونوں ہی کو اس تاریخ ساز کامیابی کے مفہوم کا پورا ادراک ہونا چاہیے۔ پرچم کے سایہ تلے اور اس کے ساتھ اس طرح جمع ہونے کا مطلب آخر کیا ہے؟ ایک سادہ سے ہندوستانی سپاہی کے الفاظ میں اس کا مطلب یوں ہو گا: ''سلطنت نے اپنے دفاع کے لیے اپنی ساری رعایا سے اپیل کی ہے۔ اگر خطرہ ہندوستان میں ہوتا تو برطانیا کے سپاہی وہاں جا کر دفاع کرتے۔ لیکن اس وقت خطرہ یورپ میں پیش آیا ہے۔ تو ہم یہاں اس کا دفاع کرنے آئے ہیں''۔ آگے چل کر انہوں نے ہندوستان کے اس نئے شاندار جذبے کو بڑے حقیقت پسندانہ مفہوم میں ایک فارمولے کی شکل میں یوں پیش کر دیا۔ انہوں نے اثنائے خطاب میں کہا: ''بلاشبہ ہم ہندوستانی ہیں لیکن ساتھ ہی ہم برطانوی بھی ہیں''۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ دلوں کو چھو لینے والی اپیل جو اس ہستی نے کی ہے جس کو اپنی سلطنت کے ہر حصے کا بخوبی علم ہے، جس کا چہرۂ مبارک دیکھنے کے لیے بمبئی، دہلی اور کلکتہ میں لاکھوں لوگ فرط مسرت سے ابھی تین سال پہلے ہی اُمڈ پڑے تھے۔ ہندوستان اس ہستی کو سلام کرتا ہے، اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ ہندوستان کے سپوت، بادشاہ، پرچم، سلطنت اور ملک کے لیے اپنی جانوں کا

Marfat.com

نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔

''اور وہ کیا چیز ہے جس نے ہندوستان اور سلطنت کے مابین رشتے کو اتنا زندہ، توانا اور بالا دست قوت بنا دیا ہے؟ وہ ہندوستان کے شہنشاہ معظم کی وہی پروقار شخصیت ہے جس نے فیصلہ کیا تھا کہ ملکہ معظمہ کے معیت میں اپنی تاج پوشی کے لیے ہندوستان کے قلب دہلی کو منتخب کیا جائے، اور اس طرح اس تاریخی شہر دہلی میں ایک بار پھر زندگی اور توانائی کی لہریں ابھرنے لگیں، جس کی بازگشت تاریخ کے دریچوں سے اب بھی اس شہر میں آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

''شاہ معظم اپنے عوام سے مخاطب ہوتے ہیں، شاہ اپنے لوگوں کے درمیان میں موجود ہیں۔ وہ اس وقت بھی مسکرا رہے ہیں اور اعتماد کا اظہار کر رہے ہیں، جب عقل خطرے سے آگاہ کر رہی ہے اور صاحب عقل لوگ سابقہ نظیروں کا حوالہ دے کر انتباہ کر رہے ہیں۔ شاہ معظم جن کی شان اور وقار ان کے روزمرہ کے سادہ معمولات سے عبارت ہے، جس بادشاہ نے دربار کی تکلیف دہ کارروائیوں کو انتہائی نرم الفاظ، باوقار مسکراہٹوں اور فیاضی کے عمل سے ختم کر دیا۔ ہاں یہی وہ تاثر تھا جس نے ہندوستان کے دلوں کو مسخر کر لیا۔

''اے بہادر سپاہیو! گورکھا ہو یا سکھ، مسلمان ہو یا راجپوت یا برہمن، لڑو اور لڑتے رہو۔ ہندوستان کے نام کو سربلند کرنے کے لیے لڑو اور اپنے خون سے ہندوستان کو عظیم بنا دو۔ تمہارے لیے فائدے بے شمار ہیں۔ تمہارے ساتھی برطانیا کی فوج میں موجود ہیں، جن کی رفاقت اور رہنمائی تمہارا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ انہوں نے انہی میدانوں میں صدیوں سے جنگ آزمائی کی ہے اور فتح یاب ہوئے ہیں۔ وہ غنیم کی کثرت تعداد کے مقابلے میں اتنے ہی پامردی دکھانے والے اور مستقل مزاج ہیں جتنے جرأت منداس وقت ہوتے ہیں جب شجاعت و مردانگی دکھاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے اندر بھی کسی نہ کسی شکل میں وہی غیر مرئی

Marfat.com

روحانی جذبہ ہے جو تمہاری خصوصیت ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس کا اظہار وہ کچھ مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ ان کی شجاعت اور بہادری کی صورتیں جو انتہائی مشکل حالات اور خطروں کے سامنے آتی ہیں تمہاری آنکھیں کھول دیں گی، اور تم کو اپنے آباواجداد کی وہ شان دار صفات اور خوبیاں یاد آ جائیں گی جو ان کی داستانوں میں محفوظ ملتی ہیں۔

''شاہ معظم نے تم کو بتا دیا ہے کہ انہوں نے تلوار ایک سچے مقصد کے لیے اٹھائی ہے۔ اور وہ اس وقت تک اس تلوار کو نیام میں نہیں ڈالیں گے جب تک وہ مقصد پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اس کارنامے اور کامیابی میں تمہارا حصہ بھی لازماً ہونا چاہیے۔

''جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا اس مضمون کو پیش کرنے میں میرا مقصد، جیسا کہ باہمت اور توانا سیکرٹری ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن نے بھی کہا ہے، یہی تھا کہ بگل بجا دیا جائے۔ مجھے اس ملک میں فوجی بھرتی کے لیے بعض اجتماعات میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اور کم وبیش ہر جگہ عزت وتکریم اور توجہ حاصل ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک دائرے میں موجود جذبۂ عمل دوسرے دائرے میں بھی جوشِ عمل پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے میں نے یہ سوچا کہ ہندوستانی زاویۂ نگاہ سے بھی کسی کو آزادی سے پورے جذبے اور شاعرانہ انداز میں اپنی بات کہنا چاہیے۔ یاد رکھیے کہ روزمرہ کا کام تو ہم ہمیشہ ہی کرتے رہتے ہیں لیکن شاعری کبھی کبھار کرتے ہیں۔''(۳)

امکان ہے کہ برطانیا میں جنگ کے زمانے کی فضا اور ماحول نے جذبات میں بڑی شدت پیدا کر دی ہوگی۔ لیکن جو گھن گرج ان الفاظ میں ملتی ہے وہ ایک ایسی شخصیت کے وقار کے منافی نظر آتی ہے جو بڑا متحمل مزاج اور ذہنی وفکری اعتبار سے منظّم سول سرونٹ رہ چکا تھا۔ عبداللہ یوسف علی کی اس جوشیلی اور جارحیت آمیز لفاظی نے جلسے کے ممتاز سامعین پر یہ تأثر ضرور چھوڑا ہو گا کہ یہ شخص برطانیا اور اتحادیوں کے لیے ہندوستان کی جانب سے بہترین پروپیگنڈے باز ثابت

ہو سکتا ہے، اور ان کے ذہنوں میں اس حوالے سے ان کی قدر و قیمت میں کوئی شک باقی نہ رہا ہو گا۔ گویا ان کی جانب سے لارڈ کچنر کی اس اپیل کا مکمل جواب تھا جو لندن کے تمام باسیوں کو ہر گوشے میں پوسٹروں کی شکل میں آواز دے رہی تھی: ''آپ کے ملک کو آپ کی ضرورت ہے''۔

عبداللہ یوسف علی نے جارج پنجم کے لیے جس مدح و ثنا کا اظہار کیا ہے اس کو دیکھ کر ''فنا'' کا تصور ذہن میں آتا ہے، جس میں کسی بالاتر ہستی کے ساتھ مل جانے اور وابستگی اور وصال کے آخری مدارج کے حصول کے لیے انسان اپنی ذات کو ختم کر دینے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ یہاں شاہ معظم کے لیے چہرۂ مبارک کی جو نادر تشبیہ استعمال کی گئی ہے وہ اس کا مظہر ہے۔ جیسا کہ بادشاہ کے ایک سوانح نگار نے لکھا بھی ہے کہ ''اپنی تمام حقیقت پسندی، عقل مندی اور فراست کے علی الرغم جارج پنجم بادشاہت سے وابستہ پر اسراریت اور بادشاہ اور خدا کی جانب سے مقرر کردہ ذمہ داریوں کے احساس سے محفوظ نہ تھا''۔ گویا بادشاہ اور عوام کے مابین ایک ناقابل تشریح روحانی تعلق موجود تھا۔ (۴)

بادشاہ کی اس قسم کی توقعات نے اس کی رعایا میں سے کم از کم ایک شخص کے دل میں وہ احساس بیدار کر دیا تھا۔ عبداللہ یوسف علی کا جذبۂ فدویت اور وفاداری بالکل رائیگاں بہر حال نہیں گیا۔ جب جارج پنجم نے ۱۹۱۷ء میں آرڈر آف دی برٹش ایمپائر کے اعزازات عطا کیے تو اس کی ابتدائی اور افتتاحی فہرست میں عبداللہ یوسف علی کا نام کمانڈر آف دی برٹش ایمپائر (سی بی ای) کی حیثیت سے نمایاں تھا۔

عبداللہ یوسف علی کے اس ایمان محکم میں جو ان کی جانب سے سلطنت کی وفاداری کے باب میں ۱۹۱۴ء کے موسم سرما میں ظاہر ہوا تھا، لندن میں مقیم بیش تر دوسرے ہندوستانی مسلمان شامل نہیں تھے۔ ووکنگ سے شائع ہونے والے مسلمانوں کے دو وفا شعار رسالوں''

Marfat.com

اسلامک ریویو'' اور ''مسلم انڈیا'' نے جنگ کی محض مشروط طور پر حمایت کا اعلان کیا تھا۔ یعنی جب تک جنگ کی نوعیت سیکولر اور مذہب سے غیر متعلق رہتی ہے اور خلافت یا حجاز وغیرہ کے بارے کوئی دخل اندازی نہیں ہوتی تمام مسلمانوں کو اپنی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو گا، اور وہ اس سلطنت کے پرچم کے دفاع کے لیے جنگ میں بھی شرکت کریں گے جس کے سایہ تلے وہ رہتے رہے ہیں اور جس نے انہیں تحفظ فراہم کیا ہے۔ (۵) کچھ ممتاز مسلمانوں نے ایک درمیان کی راہ اختیار کی تھی۔ جس میں سب سے زیادہ قابل ذکر اقبال اور جناح تھے۔ ثانی الذکر تو پہلے ہی برطانیہ کے جسد سیاسی میں ایک پھانس بن کر چبھ رہا تھا، اس لیے کہ اس نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستان سے فوج میں بھرتی کا سلسلہ صرف اس صورت میں جاری رکھا جانا چاہیے جب ہندوستانیوں پر کمیشنڈ افسروں کی حیثیت سے فوج میں شمولیت پر پابندی اٹھالی جاتی ہے۔ عبداللہ یوسف علی کی رائے مختلف تھی اور وجہ اس کی صاف ظاہر ہے کہ یہ تھی کہ ان کی وفاداری بالکل غیر مشروط تھی۔ محمد علی جوہر جو کان پور کی مسجد کے واقعہ کے سلسلے میں عبداللہ یوسف علی کے مقابل کیمپ میں تھے، مئی ۱۹۱۵ء سے اپنے بھائی کے ساتھ زیر حراست تھے۔ ان پر بادشاہ کے دشمنوں کا ساتھ دینے اور ان سے ہمدردی رکھنے اور کھلے عام اس کا اظہار کرنے کا الزام تھا۔ (۶)

عبداللہ یوسف علی کو تاج برطانیہ کے لیے جذبۂ وفاداری نے اس وقت کے اعتبار سے بالکل ٹھیک مقام دلا دیا تھا۔ انہوں نے جنگ کے دوران کسی بھی قسم کے مفید کام اور خدمت کے لیے جو پیش کش کی تھی وہ زیادہ دنوں تک عدم توجہی کا شکار نہیں رہی۔ ۱۹۱۵ء میں ان کی بعض ادبی اور تحریری کاوشوں سے اس دوران میں ان کی کارگزاریوں کا اشارہ ملتا ہے۔ جون کے مہینے میں انہوں نے ''دی ٹائمز'' میں ایک مراسلہ شائع کرایا جس میں یہ اشارہ دیا گیا کہ اس وقت برطانیہ کی بہت سی ضروریات ہندوستان پوری کر سکتا ہے، مثلاً صرف گولیاں ہی نہیں بلکہ سپاہیوں کی یونیفارم، تھیلے اور چمڑے کا سامان وغیرہ جس کی اس وقت شدید ضرورت ہے۔ ملکی کارخانے اپنے اوقات

کار سے زیادہ کام رہے ہیں اور بہت سے غیر جانب دار ملکوں کو بھی مال کی سپلائی کے آرڈر دیے جا رہے ہیں۔ کیا ہندوستان کو یہ پیغام پہنچانا ضروری ہے کہ ٹیکسٹائل کی مصنوعات، چمڑے کے سامان اور کینوس کے حوالے سے ہندوستان فوری مدد مہیا کر سکتا ہے۔ ہندوستانی صنعتیں سلطنت برطانیا کے حکم کی منتظر ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کی فوجیں جنگ کی ابتدا میں مدد کے لیے مستعد تھیں۔ یہ خط نمبر ۶ رینو اسکوائر لنکز اِن سے لکھا گیا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں عبداللہ یوسف علی امپیریل انسٹی ٹیوٹ کے لیے سپلائی کے کام میں پوری طرح شامل ہو چکے تھے، اور ان کمیٹیوں کے چیئر مین کی حیثیت سے مصروف تھے جو ربڑ کے سامان اور غذائی تیل وغیرہ کے بندوبست کے لیے بنائی گئی تھیں۔[۷] ان کا ایک مضمون جو مؤقر جریدہ The Contemporary Review میں شائع ہوا جس کا عنوان ہی ''جنگ میں ہندوستان کی خدمات'' تھا۔ اس مضمون میں جنگ سے متعلق بعض دوسری ضروری کارروائیوں کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ بالخصوص ان فلاحی کاموں کا ذکر ہے جو ہندوستان کے سپاہیوں کو محاذ جنگ پر مدد پہنچانے کے لیے انجام دیے گئے۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا: ''یہاں قلبی احساس تشکر کے چند الفاظ ان کاموں کے لیے بھی کہنا ضروری ہیں جو اس ملک میں زخمی یا بیمار ہندوستانی سپاہیوں کے لیے انجام دیے گئے اور اس طریقہ کار کی تعریف بھی کی جانی چاہیے جو ان کی مقامی ضروریات پورا کرنے کے لیے اختیار کیا گیا۔ ان معاملات میں جس طرح ہندوستانی سپاہیوں کی عادتوں اور معمولات کا خیال رکھا گیا وہ ان تجربہ کار منتظمین کی صلاحیت اور مہارت کے لیے قابل تحسین ہے۔ محاذ سے فوجیوں کے خطوط اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہاں انگریز اور ہندوستانی سپاہیوں نے مکمل تعاون اور بھائی چارے کا مظاہرہ کیا، جو ایک قابل ذکر بات ہے۔ برطانوی سپاہیوں کی کئی بٹالین انڈین کور کے ساتھ ایک ہی بریگیڈ میں شامل رہیں۔ اور اس طرح مقامی انگریزوں کو دفاعی فوج کے ساتھ بھی رکھا گیا۔ میں ایسے کئی برطانوی فوجیوں سے ملا ہوں جو مختصر مدت کی چھٹی پر محاذ سے گھر آئے تھے اور اب واپس جاتے

ہوئے اپنے ہندوستان کے فوجی ساتھیوں کے لیے گھڑیوں، بجلی کی ٹارچ اور دوسری چھوٹی موٹی زیب وزینت کی اشیا کے تحفے لے جارہے تھے۔

عبداللہ یوسف علی نے اس مضمون میں ایک خاص فوجی کا بھی ذکر کیا ہے جو فائرنگ اور گولہ باری کے طوفان میں جب کہ ہر طرف زہریلی گیس پھیلی ہوئی تھی اعلیٰ ترین بہادری کا ثبوت دے کر اپنی پلاٹون کی قیادت کرتے ہوئے آٹھ برطانوی اور ہندوستانی زخمی افسروں کو صحیح سلامت بچالایا۔ اس فوجی کو ''وکٹوریہ کراس'' عطا ہوا۔ برائٹن کے اس ہسپتال میں جہاں زخمیوں کو علاج کے لیے رکھا گیا تھا اس پرشکوہ جرأت وشجاعت کے خاموش پیکر کو دیکھ کر جو تاثر ملتا ہے وہ ہر شخص کا سر ہندوستانی ہونے کے حوالے سے فخر سے بلند کردیتا ہے۔ (۸)

برطانوی حکام برطانیا کے ہسپتالوں میں زیر علاج زخمی ہندوستانی سپاہیوں پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ ہندوستان واپسی پر کہیں ان کی باتوں اور واقعات کے بیان سے سپاہیوں کی مزید بھرتی پر منفی اثر نہ پڑے۔ ان کی ڈاک سنسر کرنے کے علاوہ اس بات کی بھی کوشش رہتی تھی کہ غیر متعلقہ اور ناقابل بھروسا ہندوستانیوں کو ان سے ملنے نہ دیا جائے۔ برطانیا کے دفتر جنگ کی ایک ہدایت تھی کہ سابقہ آئی۔ سی۔ ایس افسران ہی سب سے مناسب اور بہتر لوگ ہیں جن کو زخمی ہندوستانی سپاہیوں سے ملتے رہنا چاہیے۔ (۹)

اس پس منظر میں یہ بات بڑی مناسب لگتی ہے کہ جب ۱۹۵۳ء میں عبداللہ یوسف علی کی برطانیا میں تدفین ہوئی تو ان کی قبر کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی وہ ان صاف ستھری ترتیب سے بنی ہوئی قبروں کے بالکل قریب تھی جن میں پہلی جنگ عظیم کے دوران مرنے والے ہندوستانی سپاہی دفن تھے اور جن کے سنگ مزار کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مرنے کے بعد بھی پریڈ پر تھے، بالکل اسی طرح جیسے وہ زندگی میں نظر آتے ہوں گے۔

Marfat.com

کیکسٹن ہال والی تقریر کی طرح ''کنٹمپر یری ریویو'' کا مضمون بھی جارحانہ اور نعرہ بازی کے اسلوب میں لکھا گیا تھا، لیکن تھوڑی سی روحانی کیفیت بھی اس میں شامل تھی۔ انہوں نے لکھا: ''اس جنگ نے ہمیں جغرافیے کی اتنی زیادہ معلومات فراہم کی ہیں جو ہم نے کالج وسکول میں کبھی حاصل نہیں کی تھیں۔ اس نے ہمارے لیے علم ونظر کے اور بھی کئی دروازے وا کر دیے ہیں۔ اس نے ہمیں اپنے آپ کو دریافت کرنا اور دوسروں کی داخلی خوبیاں پرکھنا سکھایا ہے۔ یہ بات صرف اس وقت ممکن ہوتی ہے جب کسی بحران سے سابقہ پیش آتا ہے''۔ خندقوں کے اندر کی زندگی نے شاعری کی وہ نئی صنف پیدا کی جس کو ''جنگ عظیم کی شاعری'' کہتے ہیں۔ مگر عبداللہ یوسف علی صرف زبانی وکلامی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ کسی طرح بھی اصل محاذ کے خطرات اور ہیجان انگیزی کے قریب نہیں گئے بلکہ انہیں شاید یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مکڑی کبھی کبھی خود اپنے بنائے ہوئے جالے میں پھنس جاتی ہے۔

ابھی عبداللہ یوسف علی نے دوبارہ شادی نہیں کی تھی۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا الیان اب تیرہ سال کا ہو گیا تھا اور اکلوتی بیٹی لیلیٰ ٹیریسا دس برس کی تھی۔ سلطنت برطانیا سے جذباتی وابستگی اور اس کے لیے مصروف کار رہنے کے عمل کو ان کے ذاتی کوائف اور احوال سے مطلق علیحدہ بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ تین سال تک اپنے بچوں کی زندگی سے دور رہے تھے، اور اب ۱۹۱۴ء میں جب وہ واپس پہنچے تو یقیناً ان کے بال بچے اس کی تلافی کے لیے ان سے آئندہ وابستگی برقرار رکھنے کی ضمانت طلب کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ عجب نہیں کہ جذبۂ حب الوطنی اور سلطنت برطانیا سے وفاداری اور اس کام میں ان کا انہماک دراصل اپنے بچوں کی نگاہ میں اپنی ان کوتاہیوں کے لیے عذر تراشی کی ایک شکل ہو۔ ممکن ہے کہ زیادہ عمیق احساسات کا بھی اس رویے میں کوئی دخل رہا ہو، مثلاً بادشاہ ایک ایسے باپ کی مانند تھا جو اپنے بچوں سے دور ضرور تھا مگر نرم اور شفیق تھا اور اپنے بچوں یا سلطنت کی رعایا سے وفاداری اور اطاعت وفرماں برداری کا طلب گار بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ عبداللہ یوسف علی بھی اپنے بچوں

Marfat.com

سے اسی قسم کی محبت اور اطاعت کے خواہش مند ہوں جو بچوں کا فرض بنتا ہے اور جو خود انہوں نے جارج پنجم کے لیے اپنی طرف سے پیش کی تھی۔

انہوں نے اپنے بچوں کی خاطر آئی۔سی۔ایس سے استعفیٰ دیا تھا۔لیکن اس کا امکان کم تھا کہ وہ ان کی خاطر اپنی عوامی زندگی کی مصروفیات کو بھی ترک کر دیں۔بچے اب اتنے بڑے بھی ہو گئے تھے کہ بورڈنگ سکول میں داخل کیے جا سکتے تھے۔شائد وہ یہ بھی چاہتے ہوں گے کہ ان کے بچے بھی ان کی طرح مستقل مزاجی سے محنت و مشقت کریں اور منزل کے حصول کے لیے جدوجہد کی عادت ڈالیں جیسا کہ خود انہوں نے اپنے بچپن میں کر کے دکھایا تھا۔

اس وقت ان کے دوستوں کے حلقے میں سر فریڈرک للی، سورت شہر کے سابق کلکٹر اور سری لنکا کے ایک تاریخ داں ای-ڈبلیو۔پریرا شامل تھے۔(۱۰) لندن میں اس وقت ایک بڑی مسلم کمیونٹی تھی جس کے اجتماعات بڑی باقاعدگی سے دو مقامات پر ہوا کرتے تھے۔ایک جگہ نوٹنگ ہل گیٹ کے نزدیک ایک مرکز تھا اور دوسرا مقام ووکنگ کی شاہ جہاں مسجد تھی۔۱۹۱۷ء میں عبداللہ یوسف علی کو ایک جلسے کی صدارت کے لیے دعوت دی گئی جس میں مارماڈیوک پکتھال نے خطاب کرنا تھا۔اس وقت تک انہوں نے باقاعدہ اپنے قبول اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا۔ان کی تقریر کا موضوع ''حیات طیبہ'' تھا۔اپنی صدارتی تقریر میں عبداللہ یوسف علی نے سامعین کو دعوت دی کہ پورے خلوص اور سنجیدگی سے نبی کریمؐ کی زندگی کے عطا کردہ نمونے پر غور و فکر کریں اور یہ سوچیں کہ مسلمان خوش قسمت ہیں کہ ان کو ورثے میں ایسی تعلیمات کی دولت ملی ہے''۔(۱۱)

اسی دوران عبداللہ یوسف علی نے فنس بری سرکس کے قریب نئے قائم ہونے والے ''سکول آف اورینٹل سٹڈیز'' میں ملازمت کر لی۔اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت، مذاہب اور زبانوں پر لیکچر دینے کا سلسلہ شروع کیا، اور ساتھ ہی ساتھ لنکنز ان کے نیو اسکوائر میں اپنا وکالت کا

دفتر بھی برقرار رکھا۔

۸ مارچ ۱۹۱۷ء کے ''دی ٹائمز'' کی اشاعت میں ان کے ایک لیکچر کی رپورٹ چھپی جسے انہوں نے ہندوستانی زبان کی اہمیت پر اس سلسلے کے پانچویں تعارفی خطبے کے بطور دیا تھا۔ یہ لیکچر بڑی بنیادی اور مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لیے کہ انہی دنوں حیدرآباد (دکن) میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک چل رہی تھی جس میں ذریعۂ تعلیم اور وسیلۂ تدریس اردو ہو۔ اس ادارے میں ایک اور اہم شخصیت سر ٹامس آرنلڈ بھی پڑھا رہے تھے جو ''دی پریچنگ آف اسلام'' کے مصنف اور ''انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' کے ایک ایڈیٹر بھی تھے۔ عبداللہ یوسف علی نے بھی اس انسائیکلوپیڈیا کے لیے بعد میں کئی چیزیں تحریر کی تھیں۔

مئی ۱۹۱۷ء میں برطانوی حکومت نے محکمہ اطلاعات قائم کیا جس میں ایک شعبہ پروپیگنڈے کے لیے اور دوسرا سراغ رسانی کے لیے رکھا گیا تھا۔[۱۲] اس زمانے کے ذہین ترین اہل علم جو مسلم دنیا کو سمجھتے تھے اس محکمے میں لائے گئے تھے، مثلاً مؤرخ آرنلڈ ٹوائن بی، محکمہ سراغ رسانی کے ایک شعبہ ''ای'' کے سربراہ تھے جس کا مقصد ترکی اور مشرق وسطی کے لیے مخالفانہ پروپیگنڈے کا مواد فراہم کرنا تھا۔ ٹائن بی نے پہلے ہی ایسے ''بلیک پروپیگنڈے'' کا ایک نمونہ ایک پمفلٹ کی صورت میں تیار کیا تھا جس میں ''آرمینیا'' کے لوگوں پر توڑے گئے مظالم کی داستان رقم کی گئی تھی۔

اس ''بیورو آف انٹیلی جنس'' کا ایک شعبہ ''ڈی'' تھا جس کا سربراہ ایلن لیپر تھا۔ تین انتہائی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کی حامل بلقان ریاستیں، بلغاریا، رومانیا اور سربیا اس شعبے کی ذمہ داری تھیں۔ برطانیا کی اس وقت دلچسپی اس میں تھی کہ سربین قوم پرستی کے جذبات کو بھڑکایا جائے۔ اس طرح ایک طاقت ور Slav ریاست، جرمنی کے عرب علاقوں کی طرف پیش قدمی

میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔ اور ساتھ ہی وہ درۂ دانیال کی تباہ کن مہم میں اتحادیوں کے لیے کسی حد تک مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔ ان دنوں اخبار ''دی ٹائمز'' میں بار بار دہرایا جانے والا نعرہ یہ تھا کہ ''سربیا کے ہاتھ میں مشرق کا دروازہ ہے۔ ہمیں پوری قوت سے اس کی مدد کرنی چاہیے''۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علی کو ان دنوں ''سربیا'' کے معاملے میں خصوصی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ جس کی بنیاد ہمدردی کے جذبات تھے۔ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے ایک مضمون شائع کیا جس کا موضوع ''مسترووک اور سربیا کا فن مجسمہ سازی'' (Mestrovic & Serbian Sculpture) تھا۔ بظاہر یہ مضمون Ivan Mestrovic کے بارے میں تھا جو سربیا کا مجسمہ ساز تھا اور جس کے فن کی نمائش ان دنوں لندن میں جاری تھی لیکن درحقیقت یہ سربین قوم پرستی کے حق میں ترانہ مدح وستائش تھا۔ یہ مقالہ ایک کتابچہ کی صورت میں طبع ہوا اور اس کو ''اتحادیوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی فتوحات اور باہمی مفاہمت کے جذبے کے نام'' منسوب کیا گیا۔ کتابچے کا موضوع اور اسلوب یہ رائے قائم کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے کہ اس کام کو کرنے کی ذمہ داری عبداللہ یوسف علی کو محکمۂ اطلاعات کے سیکشن ''ڈی'' نے دی تھی۔ جس کے سربراہ لیپر نے خود بھی اسی طرح کا ایک پمفلٹ ''رومانیا'' پر لکھا تھا۔ جس کا عنوان ''رومانیا کے معاملے میں انصاف کا تقاضا'' تھا اور جو ۱۹۱۷ء ہی میں طبع ہوا تھا۔ سربیا کے حکام اپنے ہمدردوں کے لیے شکرگزاری کے جذبات رکھتے تھے اور سربیا کے پرنس کنسورٹ نے برطانیا کے لوگوں کو ۱۹۱۹ء میں جو پچاس اعزازات تقسیم کیے ان میں سے ایک "Order of St Sava IV" عبداللہ یوسف علی کے حصے میں آیا تھا۔ (۱۳)

سربیا کے فنون مجسمہ سازی پر یوسف علی کے مضمون کا ایک حصہ ملاحظہ ہو جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سربیا کی قوم پرستی کو فروغ دینے کے برطانوی منصوبے کے عبداللہ یوسف علی کتنے پرجوش حامی تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آیون مستر ووک کے فن میں پوری طرح وہ قومی شعور موجود ہے جو مذہب کے مقام سے بھی بڑھ گیا ہے۔ یہ شعوران خوابوں کی تعبیر کر سکتا ہے جن کا تعلق ماضی اور مستقبل دونوں سے ہے۔۱۹ویں صدی میں بلقان کی ریاستوں نے آہستہ آہستہ جو خودمختاری حاصل کی تو یہ خواب پھر سے دیکھے جانے لگے۔ان خوابوں کی وجہ سے قومیتوں میں تنازع تو ضرور ہوگا۔لیکن یہ فن کاروں کا کام ہے کہ وہ ان خوابوں کی ایسی نئی تعبیر مہیا کریں، ایسے نئے معانی تلاش کریں اوران میں سے خوں آشامی کے ہر جذبے کو نکال کر ان کی تطہیر کریں اور اس طرح اپنے فن کی سحر کاری سے ان میں وہ طاقت بھر دیں جو کم زوروں اور آشفتہ حالوں کو ظلم و جبر سے نجات دلاتی ہے۔مستر ووک اور ان کے فن مجسمہ سازی کا یہی مفہوم اور یہی پیغام ہے۔ان کا فن خاص طور پر نہ مذہبی نوعیت کا ہے اور نہ ذاتی داخلی قسم کا۔یہ بنیادی طور پر قومیت کا مظہر ہے۔بحیثیت ایک وحدت اور کل سربیائی قوم کی شان اور عظمت کے تصورات سے اس فن کے اعلیٰ مقاصد مربوط ومنسلک دکھائی دیتے ہیں۔ہم اوپر یہ دیکھ چکے ہیں کہ اس فن کے ہیرواوران کے تصورات آج کی بلقان کی تحریک سے وابستہ ہیں اوران پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ان کے فن کی لندن میں ہونے والی اس نمائش نے انگریز قوم کے افراد کو یہ سمجھنے میں مدد دی ہے کہ جنوبی سلاو قوم کا شدید اور قومی جذبۂ حب الوطنی کیا مفہوم رکھتا ہے۔روڈن کی نمائش کے بعد اس نمائش نے اتحادی اقوام کے مابین فن کے ذریعے بڑی اعلیٰ سطح کی فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کی راہ ہموار کی ہے۔فن میں ایسی ہی طاقت ہوتی ہے۔اگر ایک طرف وہ قومی خصوصیات کی اہمیت واضح کرتا ہے تو دوسری طرف وہ زندگی کے تاریک گوشوں کو بھی منور کرتا ہے اور اس عمل کے ذریعے مختلف اقوام کو ایک دوسرے سے قریب لاتا ہے''۔

عبداللہ یوسف علی نے سربیا کی مسلم آبادی کو یہ کہہ کر یک سر نظرانداز کر دیا کہ ''نصف ملین کے قریب خالص سربیائی نسل کے محمڈنز بوسنیا میں موجود مذہبی بغاوت کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔فطری طور پر اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ موجودہ نظام کے خلاف احتجاج کرتے

ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب وہ رومن چرچ کا ایک جز تھے تو وہ اس وقت اس سے علیحدہ ہو کر مینی کین (Manichean) اور اس طرح کے کسی دوسرے غیر معقول اور غیر روایتی افکار سے تعلق جوڑ بیٹھے تھے"۔

"انجمن اسلام"، بمبئی کے مسلمان بانیوں کو اس بات پر کسی طرح بھی یقین نہیں آ سکتا تھا کہ ان کے ہاں سے پڑھ کر اور تربیت پا کر نکلا ہوا ایک ممتاز شخص یہ بھی لکھ سکتا ہے کہ "سربیا کی آزادی، سلطنت عثمانیہ کے متواتر حملوں سے جن کا سلسلہ آخر کار ۱۳۸۹ میں کوسووو (Kasovo) کے معرکے پر منتج ہوا، ختم ہو گئی"۔

عبداللہ یوسف علی نے عثمانیوں سے ہمدردی کے اظہار پر آمادگی ظاہر نہ کر کے ان اقدار کی نفی کر دی جو بمبئی کے سربرآوردہ مسلمانوں نے وضع کی تھیں۔ "انجمن اسلام" نے ۱۸۷۰ء کی دہائی اور پھر اس کے بعد ماضی قریب یعنی ۱۹۰۶ء میں ترکی کے لیے رقوم جمع کی تھیں اور جب انجمن سکول کے بانی بدرالدین طیب جی کا لندن میں انتقال ہوا تو ان کے جنازے میں ترک قونصل نے بھی شرکت کی تھی۔ آغا خاں سوم (آغا سلطان محمد شاہ سوئم) جیسے سلطنت برطانیا کے کٹر حامی اور وفادار جن سے اپنے اصولوں اور عقائد کے حوالے سے غیر جانب دار رہنے کی توقع کی جا سکتی تھی، روایتی بین الاسلامی روابط اور تعلقات کا احترام کرتے رہے۔

یہ ایک سیدھا سادا علمی وفکری غداری کا عمل تھا، وہ بھی ایک ایسے شخص کا جو حقائق سے اچھی طرح واقف تھا[۱۴] عبداللہ یوسف علی نے بڑا کرم فرمایا کہ انہوں نے دوبارہ کبھی سربیا کے آرٹ اور سیاست پر کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔

۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۸ء کی مدت کے درمیان ان کی بہت سی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برطانیا کے سامراجی رویوں اور انداز نظر میں تبدیلیوں کی توقع رکھتے تھے۔ جنوری ۱۹۱۶ء میں انہوں

نے کہا: ''میں نے انگلستان میں بہت سے عوامی جلسوں سے خطاب کیا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برطانیا کی جمہوریت اور برطانوی عوام ہندوستان کی ضرورتوں اور خواہشات کو سمجھنے اور اس کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے نہ صرف رضا مند ہیں بلکہ مضطرب بھی نظر آتے ہیں۔ (۱۵)

ان کو یہ توقع تھی کہ برطانیا ہندوستان کی جنگی خدمات اور قربانیوں کا اعتراف کرے گا اور ہندوستان کو بھی وہی حیثیت دینے کے لیے آمادہ ہو جائے گا جو اس نے آسٹریلیا اور کینیڈا کو دے دی ہے۔ عبداللہ یوسف علی ہر موقع پر اس امر کے متلاشی رہتے تھے کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ ہندوستان خود مختاری کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ ایسا ہی ایک موقع اس وقت میسر آیا جب ۱۹۱۷ء میں امپیریل وار کانفرنس میں تین اہم ہندوستانی نمائندے - مہاراجہ بیکانیر، سنہا اور میسٹن - موجود تھے۔ کانفرنس کے اختتام پر عبداللہ یوسف علی نے کہا: ''اب جب کہ امپیریل وار کانفرنس ختم ہو گئی اس کی کارگزاری اور کام پر نظر ثانی کرنا ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دے گا کہ آج ہندوستان سلطنت برطانیا میں کس درجے اور مقام پر ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ ہندوستان کے نمائندے کانفرنس میں محض مبصر اور مشیر نہیں تھے بلکہ انہیں مکمل رکن کی حیثیت حاصل تھی، بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے ڈومینین کے نمائندوں کو تھی۔ ہز مجسٹی شاہ معظم اور ہز مجسٹی ملکہ عالیہ نے شاہی خاندانی رکھ رکھاؤ کے مطابق ونڈسر کے محل میں ان کو مدعو کر کے اعزاز بخشا۔ ہندوستان کے نمائندوں کو اس امر پر مبارک باد دی جانی چاہیے کہ انہوں نے کانفرنس میں ہندوستان کے مسائل کو بہت خوبی سے پیش کیا''۔ (۱۶)

دسمبر ۱۹۱۷ء میں عبداللہ یوسف علی کو سلطنت کے لیے گراں قدر خدمات دینے پر سی۔ بی۔ ای کا اعزاز عطا ہوا، جس کے وہ فی الحقیقت سزاوار بھی تھے۔ ''ہوز ہو'' "Who's"

Marfat.com

"Who" کے اگلے ایڈیشن میں ان کا نام آیا اور تیں سطروں کا تعارف کرایا گیا۔ یہ وہ اعزاز تھا جس کو چند ہی دوسرے ہندوستانی حاصل کر پائے تھے۔ اس تعارف میں ان کی برطانوی خاتون سے شادی اور چار بچوں کا تو کوئی ذکر نہیں تھا لیکن دوسری تفصیلات جن میں ان کا نیشنل لبرل کلب کا ممبر ہونا اور دیگر مشاغل، مثلاً لمبی چہل قدمی، گھڑ سواری، سیر و سیاحت اور شطرنج وغیرہ سے دلچسپی کا احوال مکمل طور سے دیا گیا تھا۔ (۱۷)

جس مہینے ان کو یہ اعزازات دیے گئے اسی زمانے میں صیہونیوں (Zionists) نے لندن کے اوپیرا ہاؤس میں ایک شاندار تقریب Allenby کے یروشلم کو فتح کرنے کی خوشی میں منعقد کی۔ ہر برٹ سیموئیل کو، جو ایک لبرل سیاست دان تھا، جنگ کے بعد فلسطین میں پہلا برطانوی ہائی کمشنر مقرر کیا گیا تھا۔ سموئیل نے اس موقع پر مجمع سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ آج خوب دل کھول کر خوشی منائیے اس لیے کہ برطانوی فوجیوں کی فلسطین میں کامیابیوں نے یہودیوں کی روایتی دعا ''اگلے سال یروشلم میں'' کو ایک نئی معنوی جہت دے دی ہے۔ فلسطین میں لڑنے والی فوجیں زیادہ ہوشیار ثابت ہوئیں۔ اس طرح کہ انہوں نے گیلی پولی (Gallipoli)، سوم (Somme) اور قط العمارہ (Kut-el-Amara) میں لڑنے والی ہندوستانی فوجوں کے مقابلے میں کم نقصانات اٹھائے اور کم قربانی دی لیکن اس کے باوجود سب کچھ حاصل کر لیا۔

عبداللہ یوسف علی کا سلطنت برطانیا کے لیے جوش و جذبہ اب پورے شباب پر تھا۔ فروری ۱۹۱۸ء میں ''اوورسیز جرنل'' نے ایک مضمون شائع کیا جسے اس نام کا ایک کلب ''پیٹریاٹک کلب آف برٹش اوورسیز'' شائع کرتا تھا۔ اس مضمون میں اس امر کی گواہی ان الفاظ میں دی گئی تھی:

''سلطنت برطانیا سے ہندوستان کو بے حد و حساب قیمتی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ۱۸ویں صدی میں مسلسل خانہ جنگیوں میں مبتلا رہنے والے ہندوستان کو برطانیا نے اپنے اخلاقی اور

Marfat.com

مادی وسائل کو ترقی دینے اور بروئے کار لانے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ایک عظیم اور لبرل سلطنت کا حصہ بن جانے کے بعد ہندوستان کو نئے عظیم افکار اور عملی عالمی تحریکوں سے براہ راست قریبی رابطہ قائم کرنے کا موقع ملا ہے۔اس کی معاشرتی تنظیم دور قدیم کی ناکارہ اور فرسودہ بنیادوں سے بتدریج ہٹ کر ایک نئی جمہوری بنیاد کی جانب پیش قدمی کر رہی ہے۔ہندوستان کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں آزادی کی محبت اور تنظیم و ترتیب کی عملی توقیر نے، جو انیگلو سیکسن معاشرے کا امتیاز ہیں، جان نہ ڈال دی ہو۔......اس وقت جب ہم سلطنت برطانیا کا ذکر کرتے ہیں تو ہم ایک عظیم اور مختلف اجزا سے مرکب اور مربوط سیاسی تنظیم یا ادارے کی بات کرتے ہیں جس میں اس کا ہر جزا اپنے حقوق اور مراعات بھی رکھتا ہے اور فرائض بھی جانتا ہے اور یہ رشتہ بزورِ قوت قائم نہیں ہے بلکہ اس کو فہم وادراک کی بنیاد پر بننے والی وسیع رائے عامہ کی تائید و توثیق بھی حاصل ہے۔جس کی پشت پر یہ خواہش بھی ہے کہ آزادی کے تصورات کو دیانت داری سے اظہار کا موقع ملے اور ساتھ ہی ذمہ دارانہ رویے اور منظم ترقی کی راہیں بھی کھلیں جو برطانوی تاریخ کا انسانیت کی ترقی میں اصل حصہ ہے۔

جنگ کے زمانے نے عبداللہ یوسف علی کو یہ مہلت فراہم کی تھی کہ وہ شاہ معظم کے لیے اپنے فدویانہ جذبے اور قلبی وابستگی کو ایک عقلی و فکری عقیدے کی شکل دے سکیں۔جو پمفلٹ انہوں نے سربیا کے فن مجسمہ سازی پر لکھا تھا اس میں انہوں نے قوموں کے مابین قریبی روابط اور مفاہمت کو فروغ دینے پر زور دیا تھا۔ان کا عقیدہ تھا کہ کوئی بھی تہذیب اور ثقافت علیحدگی اور تنہائی میں زندہ نہیں رہ سکتی اور ہندوستان کی ترقی کا انحصار سلطنت سے بالعموم اور برطانیا سے بالخصوص رابطہ اور تعلق برقرار رکھنے میں ہے۔زمانہ جنگ میں عبداللہ یوسف علی کی سب سے اہم مہم جوئی اسکینڈے نیویا کا ایک پر خطر سفر تھا جو دفتر خارجہ اور نو تشکیل شدہ وزارت اطلاعات کی خواہش پر عمل میں آیا تھا۔آئرلینڈ، مصر اور ہندوستان کے کچھ لوگوں نے سویڈن میں برطانیا دشمن پروپیگنڈے کا ایک مرکز

Marfat.com

قائم کیا تھا۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں برطانیہ کے سفیر نے دفتر خارجہ کو ایک برقیہ ارسال کیا۔ اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں اس پروپیگنڈے کے اثر سے سویڈن کی غیر جانب دار حیثیت متاثر نہ ہونے لگے، برطانوی سفیر نے دفتر خارجہ سے درخواست کی کہ ایک دوست اور ہمدرد قسم کے خالص ہندوستانی شخص کو سویڈن بھیجا جائے جو ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کے موضوع پر لیکچر دے سکے۔ (۱۸) سیاسی اور جغرافیائی حکمت عملی کے اعتبار سے سویڈن کی بڑی اہمیت تھی۔ اگر سویڈن کے رویے میں کوئی ایسی تبدیلی آ جاتی جو جرمنی کی موافقت کی جانب ہوتو برطانیہ کو اسلحے کی فراہمی میں رکاوٹ پڑ سکتی تھی۔ دفتر خارجہ نے انڈیا آفس سے مشورہ کیا، جس نے اپنے مزاج اور پالیسی کے مطابق کسی یورپین کو لیکچروں کے لیے بھیجنے کو قابل ترجیح قرار دیا اور جواب میں یہ لکھا: ''سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا اس بات سے تو اتفاق کرتے ہیں کہ لیکچروں کا ایک جوابی سلسلہ یا مہم انتہائی مفید ہوگی بلکہ مطبوعہ تحریروں کی بھی ضرورت اور افادیت ہو سکتی ہے، تاہم ہماری رائے میں سٹاک ہوم کے مرکز سے جاری دشمن کے پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کے لیے مسٹر ڈبلیو-آرچر بہت مناسب رہیں گے جو اسکینڈے نیویا کے ایک معروف سکالر ہیں اور جنہوں نے حال ہی میں ہندوستان پر ایک کتاب بھی تحریر کی ہے۔ انہیں حال ہی میں اس مقصد کے لیے ملازمت میں لیا گیا ہے کہ سنٹر سے شائع ہونے والی بعض چیزوں سے نمٹنے کا کام سنبھالیں۔ وہ سٹاک ہوم کے سامعین کے لیے کسی ہندوستانی کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ہندوستانی پر ہی اصرار رہتا ہے تو سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا مسٹر عبداللہ یوسف علی کا نام تجویز کریں گے جو ''لندن سکول آف اورینٹل سٹڈیز'' میں لیکچرار ہیں اور سابقہ ریٹائرڈ آئی۔سی۔ایس افسر ہیں۔ اس کے علاوہ مسٹر این-سی-سین سے (N.C,Sen) جو نمبر ۲۱ کرامویل روڈ پر سکونت رکھتے ہیں اس معاملے میں رابطہ کیا جا سکتا ہے''۔ وزارت اطلاعات نے جو اس معاملے میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی تھی عبداللہ یوسف علی کو ترجیح دی اس لیے کہ ایک خالص ہندوستانی کو بھیجنا ضروری تھا۔

اگر یہ شرط نہ ہوتی تو پھر مسٹر آرچر کے حق میں معاملہ طے کر دیا جانا تھا۔ (۱۹)

اس اثنا میں ایک عقل مند نے دفتر خارجہ کی فائل پر یہ لکھا کہ یہ مسئلہ جنگ کے خاتمے سے پہلے طے ہو جانا بہتر ہوگا۔ یوسف علی کو جان ہوز سے اس معاملے پر گفت وشنید کرنا تھی جو انڈیا آفس میں افسر تھا۔ ۴ مارچ کو یوسف علی کو ایک انتہائی نفیس اور مہذب قسم کا دعوت نامہ دفتر خارجہ کے افسر اسٹیفن گیزلی کی جانب سے سکول آف اورینٹل سٹڈیز کے پتے پر وصول ہوا۔ اس کا مضمون کچھ یوں تھا: ''ہمیں بہت مسرت ہوگی اگر اس کام کو سرانجام دینے کی ذمہ داری قبول کرنے کی کوئی راہ نکال سکیں۔ اور اگر اس کا کوئی امکان ہے تو کیا میں آپ کو دوران ہفتہ کسی بھی دن 30-11 سے 1 بجے یا پھر سہ پہر کو ساڑھے چار سے ساڑھے چھ بجے کے درمیان تشریف لا کر مجھ سے ملنے کی زحمت دے سکتا ہوں۔'' دفتر کے اعلیٰ سرکاری اہل کاروں نے آخر کار عبداللہ یوسف علی کے حق میں فیصلہ کر دیا، بالخصوص اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ ولیم آرچر جو اسکنڈے نیویا کے امور سے متعلق کام وزارت اطلاعات میں نمٹا رہے ہیں فارغ نہیں کیے جا سکتے۔ ملاقات کے دوران عبداللہ یوسف علی نے معاوضے کی ادائیگی کا سوال اٹھایا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے حال ہی میں ایک مکان خریدا ہے۔ غالباً ان کا اشارہ چیزوک (Chiswick) سے بیڈفورڈ پارک (Bedford Park) منتقل ہونے کی جانب تھا۔ نئی قیام گاہ بھی ویسٹ لندن ہی میں تھی۔

عبداللہ یوسف علی کی خدمات حاصل کر لینے کے بعد دفتر خارجہ نے بذریعہ برقی تار ڈنمارک اور ناروے میں اپنے سفارت خانوں سے مراسلت شروع کر دی کہ آیا وہ ان ملکوں میں بھی انڈیا کے حوالے سے لیکچروں کا سلسلہ رکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کارروائی میں کئی ہفتے لگ گئے جس کے دوران میں عبداللہ یوسف علی کو کچھ نہیں بتایا گیا اور وہ اس سلسلے میں بالکل تاریکی میں رہے۔ آخر کار ۲۳ مارچ کو انہوں نے وزارت اطلاعات کو خط لکھا اور دریافت کیا کہ دورے کا

پروگرام باقی ہے یا ملتوی کر دیا گیا ہے۔اب ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اوراپریل کے اوائل میں انہیں ایڈ مرلٹی نامی چھوٹے جہاز میں کوپن ہیگن کے سفر کے لیے تیاری کرنے کو کہا گیا۔روانگی سے پہلے عبداللہ یوسف علی نے ایک خصوصی بریفنگ یا معلوماتی میٹنگ منعقد کرنے کی درخواست کی جس کے جواب میں گیزلی ہٹ نے اپنے مخصوص نا قابل تقلید اسلوب میں یوسف علی کو یہ لکھا:

''ڈیر مسٹر یوسف علی!

انڈیا آفس کے مسٹر ہوز (Hose) نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اسکینڈے نیویا جانے سے قبل انڈیا آفس میں کسی ذمہ دار شخص سے اس ملک میں پروپیگنڈے کے متعلق بعض سوالوں پر بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔اگر آپ کسی دن بھی صبح ۱۱ بجے کے لگ بھگ یہاں آ کر مجھ سے ملاقات کر سکیں تو میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کو جو کچھ بھی درکار ہے وہ آپ کو بتادوں، یا پھر ممکن ہوا تو کسی ایسے شخص سے ملاقات کرادوں جو فی الحقیقت اس موضوع پر ایک ماہر کی حیثیت رکھتا ہو''۔(۲۰)

وزارت اطلاعات عبداللہ یوسف علی کی پیشہ ورانہ صلاحیت ومہارت کے مقابلے میں بہت پیچھے تھی۔ایک سول سرونٹ مسٹر ہربرٹ اونیل (Mr Herbert O' Neill) جو وزارت میں اسکینڈے نیویا سے متعلق امور کا ذمہ دار تھا، اس نے کوپن ہیگن میں برطانوی مندوب کو ایک نوٹ بھیجا جس میں مندرجہ ذیل ہدایات اور مشورے دیے گئے تھے:

''میرے خیال میں یہ مناسب ہوگا کہ وہ ایک خاص حد تک سفارت خانہ سے ضرورت کی رقم لیتے رہیں لیکن یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کی سکونت کا انتظام کسی ہوٹل میں کر دیا جائے۔آپ کو یہ تو معلوم ہوگا ہی کہ وہ ہندوستانی ہیں۔مجھے نہیں معلوم کہ ڈنمارک میں رنگ ونسل کا کوئی مسئلہ ہے یا نہیں!لیکن مجھے بھروسا ہے کہ ان کی دیکھ بھال اور تواضع کے لیے مناسب انتظامات کیے جا سکتے

Marfat.com

ہیں۔ وہ بہت دلکش شخصیت کے مالک ہیں اور ہمارے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ خود ہماری مدد کرنے کے شدت سے خواہاں ہیں"(۲۱)

اگلے دن فارن آفس (دفتر خارجہ) نے علیحدہ سے ایک دوسرا ٹیلی گرام اپنے سفارت خانے کو ارسال کیا جس میں وہ غلطیاں دور کر دی گئی تھیں جو بہت واضح تھیں۔ کوپن ہیگن کا سفر توقع کے برخلاف بہتر ثابت نہ ہو سکا۔ عبداللہ یوسف علی کی لالٹین والی سلائیڈز وقت پر تیار نہ ہو سکیں اور ان کو سلائیڈز ساتھ لیے بغیر سفر پر روانہ ہونا پڑا۔ بعد میں جس چھوٹے جہاز میں وہ سلائیڈز روانہ کی گئی تھیں وہ راستے میں (حملے کی زد میں آ کر) ڈبو دیا گیا۔ عبداللہ یوسف علی کے سفر کا راستہ بھی جنگی علاقے کے بالکل قریب سے گزرتا تھا اور اس راستے سے دور نہیں تھا جس سے لارڈ کچنر اپنے بدقسمت روسی مشن پر گزرے تھے۔ اپنے سفر کے دوران عبداللہ یوسف علی نے کوپن ہیگن، سٹاک ہوم، اپسالا، لونڈ کر یچپیا کے علاوہ بھی کئی مقامات پر سامعین سے خطاب کیا۔ ان کا ایک خطبہ "ہندوستان کے ثقافتی خدوخال" (Features of Indian Culture) ڈینش زبان میں ترجمہ ہوا اور اسے ایک کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا۔(۲۲)

یہ بات خلاف توقع نہ تھی کہ ان کے پروپیگنڈے والے لیکچروں کے دوران میں کئی بار ان کا تند و تیز مکالمہ قوم پرست ہندوستانی گروپ کے لوگوں سے بھی ہوا جو برطانیا کے دشمن تھے۔ عبداللہ یوسف علی نے سویڈن کے اخبارات کے نام ایک چھپا ہوا بیان جاری کیا جس میں ایک ایسے ہی برطانیا مخالف گروپ انڈین نیشنل کمیٹی کا ذکر تھا۔ اس میں انہوں نے کہا کہ اس میں صرف دو انارکسٹ شامل ہیں جو ہندوستان کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہندوستان کے حالات سے کوئی براہ راست واقفیت نہیں رکھتے۔(۲۳)

سویڈن کے اخبار "Aftontidning" کی ۹ مئی ۱۹۱۸ء کی اشاعت میں انڈین

Marfat.com

نیشنل کمیٹی کا ایک بھرپور جواب شائع ہوا جو بڑی ہنرمندی سے لکھا گیا تھا اور اس میں عبداللہ یوسف علی پر خوب صورتی سے سب وشتم کے تیر برسائے گئے تھے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''آپ کے ۸ تاریخ کے شمارے میں انتہائی سنسنی خیز عنوان ''انڈین نیشنل کمیٹی۔ حقائق کا پردہ چاک'' کے تحت ایک ہندوستانی مسٹر عبداللہ یوسف علی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ ہر غیر جانب دار قاری اس بات سے اتفاق کرے گا کہ مضمون میں ہمارا پردہ چاک نہیں ہوا بلکہ خود مسٹر عبداللہ یوسف علی کے بارے میں حقائق کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ اپنے آرٹیکل کی اشاعت سے ایک دن پہلے ہی وہ سٹاک ہوم سے چلے گئے۔ اب اسے ہماری غلطی نہیں سمجھا جانا چاہیے کہ ہمارا جواب ذاتی طور پر ان تک نہیں پہنچ سکا۔

''سویڈن کے عوام کو آپ کے اخبار سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مسٹر عبداللہ یوسف علی ایک محبّ وطن سیاسی شخصیت ہیں، اپنی تقریروں اور لیکچروں میں وہ تأثر دیتے رہے ہیں کہ انہیں انڈین نیشنل کانگریس یا آل انڈیا مسلم لیگ نے ہندوستان کی جانب سے بولنے اور بات کہنے کی ذمہ داری تفویض کی ہے۔ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ وہ یہ ثابت کریں کہ وہ اپنے آپ کو سیاست دان کہنے کا جواز رکھتے ہیں! اور یہ بھی بتائیں کہ آیا ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت یا تنظیم نے ان کو سویڈن آنے اور سویڈن کے عوام کے سامنے یہ غلط بیانی کرنے کی اجازت دی ہے کہ بیرونی تسلط کے زیرسایہ ہندوستان خوش وخرم ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ وہ بتائیں کہ ہندوستان کی کوئی ایک بھی سیاسی جماعت یا سیاسی شخصیت ایسی ہے جو ان خیالات سے اتفاق کرتی ہے؟ ہمیں یوسف علی کے لیے محبّ وطن کی اصطلاح سے بھی اختلاف ہے اور ہم پوری شدت سے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں کہ ایک ایسے شخص کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی جائے جس نے ساری زندگی ہندوستان میں بیرونی سامراجی حکومت کے مفادات کے تحفظ اور فروغ کے لیے کام کیا ہو۔

Marfat.com

''مسٹر یوسف علی کا کہنا ہے کہ میں نے متعلقہ لوگوں سے مسلسل رابطہ برقرار رکھنے کے لیے مشقت برداشت کی ہے' یہ سراسر غلط ہے۔ اگر انہیں ہم سے ملنے کی خواہش ہوتی تو برطانیا کے سفارتی مندوب سے ان کو ہمارے پتے مل سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے خود ان سے متعارف ہونے کے لیے پہلا قدم بڑھایا۔ ہم یہ توقع کر رہے تھے کہ ان کے دل میں حب الوطنی کے حوالے سے ذاتی عزت نفس کا کچھ جذبہ بیدار کر سکیں گے لیکن ہم کو افسوس ہے کہ ہم اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مختصر گفتگو کے بعد ہمیں صرف یہ اندازہ ہو سکا کہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم سے ہماری تنظیم کے بارے میں کچھ معلومات وغیرہ حاصل کر لیں۔ طبعی طور پر یہ کام وہ اپنی حکومت کے مفاد میں کر رہے تھے۔ مسٹر عبداللہ یوسف علی نے از راہ نوازش ہم کو اپنے وطن میں واپس آ کر مقامی فکر وفلسفہ اور ادب کے انسانیت نواز اثرات میں زندگی گزارنے کی دعوت بھی دی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو اصول وہ ہم کو سمجھا رہے ہیں ان پر خود کیوں نہیں عمل پیرا ہوتے ہیں؟ اگر ہمارا (ہندوستانی) فکر وفلسفہ عبداللہ یوسف علی کے کہنے کے مطابق ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ اپنی آزادی کے حصول کے لیے ہم طاقت کا استعمال ہرگز نہ کریں تو پھر وہ خود انگلستان کو ہندوستان سے سپاہیوں کو بھرتی کرنے اور فرانس میں قتل عام کرانے کے لیے کیوں استعمال کرتے ہیں؟'' (۲۴)

نفرت وعداوت کے جذبات دونوں طرف تھے۔ لندن واپسی کے بعد عبداللہ یوسف علی نے برطانوی پریس میں اس دشمن کے بارے میں خاصی تفصیل سے لکھا جس سے ان کا سابقہ اسکینڈے نیویا میں پڑا۔ (۲۵) انڈین نیشنل کمیٹی کے لوگوں کو ساری اطلاعات پہنچ چکی تھیں جس سے پتا چلتا ہے کہ عبداللہ یوسف علی کے پروپیگنڈے کے کام نے لوگوں کو متوجہ ضرور کیا تھا۔ سویڈن کے اخبار میں ان کے مسلم لیگ سے جس تعلق کا مختصر اور سرسری ساذکر تھا وہ لندن میں ان کے لیکچروں کے سلسلے سے تھا۔ اگر چہ ان حالات میں انہوں نے اس تعلق کو زیادہ واضح، مفصل

Marfat.com

اور نمایاں انداز میں بیان کیا تھا۔(۲۶) اس وقت کے حالات میں، یہ بات بھی ان کے مزاج کے مطابق تھی کہ وہ نیشنل کمیٹی کے ممبروں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر کے حکام بالا تک منتقل کر دیتے۔ عبداللہ یوسف علی کے نزدیک اصل دشمن صرف جرمنی یا ترکی نہیں تھے بلکہ وہ انقلابی تنظیمیں بھی تھیں جو ہندوستان اور سلطنت برطانیہ کے باہمی ربط و تعلق کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔

گیسلی (Gaselee) کی کوشش تھی کہ عبداللہ یوسف علی کے اسکینڈے نیویا کے مشن کی سرکاری توثیق اور تعریف ہندوستان کے سابق وائسرائے ہارڈنگ، جو اب دفتر خارجہ میں مستقل سیکرٹری کے منصب پر فائز تھے، کی جانب سے لکھے گئے ایک تعریفی خط میں کی جائے۔ غالباً اس سبب سے کہ اس معاملے میں حکومت کے تین محکمے شریک تھے۔ اس کوشش کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر کار گیسلی نے مسئلے کو وزارت اطلاعات میں موجود اونیل سے رابطہ کر کے دوبارہ اس وقت اٹھایا جب اس نے ''دی ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ'' میں ان کے ڈنمارک کے لیکچروں پر ایک تبصرہ پڑھا۔ لیکن اس وقت تک وہ فائل جس کا اس موضوع سے تعلق تھا گم ہو چکی تھی۔ (۲۷)

مختلف محکموں کے درمیان ہونے والی خط و کتابت جنگ کے تعطل پر ۱۱/ نومبر ۱۹۱۸ء کو عارضی صلح کے دن (Armistice Day) کے اعلامیے میں دب کر رہ گئی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد شکریے کے رسمی خطوط لکھنے جیسی خوش گوار کارروائیاں اتنی اہم اور فوری توجہ کی مستحق نہیں رہیں۔ چنانچہ ''عظیم محمڈن کمیونٹی کا نمائندہ'' جس نے سلطنت کے لیے اپنی زندگی اور نیک نامی سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا جلد ہی بھلا دیا گیا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ یوسف علی نے اس کا کچھ زیادہ برا نہیں مانا۔ ان کو جو وابستگی اتحادی طاقتوں کے مقاصد سے تھی اس کی بنیاد ان کا نظریہ اور آئیڈیل تھا، مالی منفعت نہ تھی۔ ان کی محنت کا تعلق ایک جامع فکری عقیدے اور اتحادی طاقتوں پر اعتماد کی وجہ سے تھا۔ ان کے خیال میں اتحادیوں کی کامیابی سے ایک نیا عالمی نظام جنم لے سکتا تھا۔ ان کے

Marfat.com

بقول ''جنگ عظیم، سامراجیت، عسکریت پسندی اور نسلی برتری اور حاکمیت جیسے تصورات کو ختم کر کے رکھ دے گی''(۲۸)

اتحادیوں نے شکست خوردہ مرکزی طاقتوں (Central Powers) کے علاقوں میں مقبوضات قائم کرنے کے جو منصوبے ظاہر کیے ان سے مسلم دنیا میں تردد اور پریشانی کا نیا احساس پیدا ہوا۔ ایسی سکیم بھی سامنے آئی کہ قسطنطنیہ کو عثمانی ترکی سے علیحدہ کر دیا جائے۔ مسلمانوں کو یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ان کو اب آواز بلند کرنی پڑے گی۔ اگر آج ''اسلام کا شہر'' ترکی سے الگ کر دیا جاتا ہے تو پھر خلافت کا مستقبل بطور ایک ادارے کے کیا رہ جائے گا! عبداللہ یوسف علی کو بھی یقیناً کسی درجے میں عارضی ہی سہی لیکن مایوسی کا احساس اس وقت ہوا ہو گا جب انہوں نے اتحادی طاقتوں کے منصوبوں میں سامراجی مقاصد کے حصول کی جھلک نمایاں دیکھی ہو گی۔

انہوں نے بڑے محتاط الفاظ میں نومبر ۱۹۱۸ء میں ''دی ٹائمز'' کو ایک مراسلہ لکھا جس میں اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے برطانوی حکومت کو قدرے سرزنش بھی کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے لکھا:

''وہ جن کے ہاتھوں میں برطانیا کی حکمت عملی کا رخ متعین کرنا ہے وہ اپنی ذمہ داریوں کو سخت آزمائش اور خطرے سے دوچار کر دیں گے اگر انہوں نے مستقبل کا نقشہ تیار کرتے ہوئے ہندوستانی اور برطانوی حفاظت میں شامل دوسرے ملکوں مثلاً مصر، افغانستان اور برٹش ملایا میں رہائش پذیر مسلمانوں کے مفادات اور جذبات کو نظر انداز کر دیا'' اس خط میں ایک مشورہ بھی شامل تھا۔

''کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ حکومت کے اندرونی نظم و نسق میں ایک دو ایسے مسلمانوں کو بھی شامل کیا جائے جو صاحب حیثیت، تجربہ کار، آزاد اور غیر جانب دار نقطۂ نظر رکھتے ہوں جن کا

Marfat.com

رابطہ بھی مسلم حلقوں سے ہو اور جوان مسلمانوں کے مفادات کے بارے میں مشورہ دے سکیں جنہوں نے وفاداری اور استقلال کے ساتھ سلطنت اور اتحادی طاقتوں کا انتہائی مشکل چار سالوں میں ساتھ دیا ہے، جو ابھی ابھی ختم ہوئے ہیں''(۲۹)

ان کا یہ نرم الفاظ میں بیان اس بحران پر پردہ ڈال رہا تھا جس کے نتیجے میں تحریک خلافت کی شکل میں عوامی رائے متحرک اور منظّم ہو رہی تھی، تاکہ جزیرۃ العرب میں عثمانی خلافت کی طاقت اور اقتدار کا تحفظ کیا جاسکے۔(۳۰)

عبداللہ یوسف علی نے خلافت اور سلطنت برطانیا سے وفاداریوں کے مابین جو تنازع پیدا ہوتا تھا اس کے بارے میں اپنے ذہن کو کسی بڑی الجھن میں نہیں ڈالا تھا۔ انہوں نے دوبارہ سکول آف اورینٹل سٹڈیز میں اپنی تدریسی ذمہ داریوں کو ادا کرنا شروع کر دیا۔ لیکن تدریس اور تعلیم و تعلّم کا یہ عمل جنگ کے زمانے کی پرآشوب سرگرمیوں کے بعد بڑا معمولی سا عام دنیاوی کام تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے اپنی خدمات عوامی زندگی میں شرکت کے لیے پہلے ہی پیش کی ہوئی تھیں۔ اب ان کی پذیرائی بہت اونچی سطح پر ہونے والی تھی۔

برطانوی حکام کو ایسے معتدل خیالات کے حامل مسلمانوں کے ایک گروہ کی ضرورت تھی جو نہ صرف برطانیا مخالف قوم پرستوں کا مقابلہ کر سکے بلکہ خلافت عثمانیہ کے عرب صوبوں کو سلطنت سے علیحدہ کرنے کے لیے رائے عامہ بھی تیار کرے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اتفاق تھا یا کوئی منصوبہ بندی تھی کہ برطانیا میں سکونت پذیر مسلمانوں کے ایک گروپ نے برطانوی حکومت کو یہ یقین دہانی کرانے کا بیڑہ اٹھایا کہ وہ جزیرۃ العرب کی تقسیم کے مسئلے پر کوئی ہنگامہ نہ ہونے دیں گے بشرطیکہ دوسرے کچھ تحفظات فراہم کیے جاسکیں۔ مکان نمبر ۴۱، سلون اسٹریٹ، لندن کے پتے سے ان لوگوں نے ایک خط ۱۹۱۹ء کے سال نو کے دن برطانیا کے خارجہ سیکرٹری کو ارسال کیا۔ اس کا

آغاز ان الفاظ سے ہوتا تھا۔ ''ہم دستخط کنندگان ذیل جو ہز مجسٹی، شاہ معظم کی محمڈن رعایا سے تعلق رکھتے ہیں، بڑے احترام وعقیدت سے یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں اور ہز مجسٹی کی حکومت کے سامنے اس رائے کو پیش کرنے کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہم نے اخبارات میں بعض غیر ذمہ دار حلقوں کی جانب سے پیش کی گئی اس تجویز پر سخت تشویش محسوس کی ہے جس کا تعلق قسطنطنیہ کے مستقبل سے ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ قسطنطنیہ کو ان کے موجودہ قابضین سے واپس لے لیا جائے''۔

خط کا اسلوب اُس مخصوص طرز کا مظہر تھا جو ہندوستان کے ان لوگوں کی نمائندگی کرتا تھا جو سلطنت کے وفادار تھے۔ دستخط کنندگان میں سید امیر علی، آغا خاں اور پک تھال کے نام شامل تھے۔ عبداللہ یوسف علی کا نام ان لوگوں میں شامل نہیں تھا۔ (۳۱) عثمانی خلافت کے ماتحت عرب صوبوں کے بارے ان مؤدب درخواست دہندگان نے کسی بھی رائے کے اظہار کی کوئی خواہش نہیں کی تھی۔

جیسے کہ اسی اشارے کا انتظار ہو، چار دن بعد، وزیر اعظم لائیڈ جارج نے پارلیمنٹ سے خطاب میں مسلمانوں کو گویا یقین دہانی کرائی کہ عثمانی ترکی سے قسطنطنیہ یا ایشیائے کوچک کے علاقے نہیں چھینے جائیں گے لیکن عربوں کو یہ حق البتہ ضرور دیا جائے گا کہ ان کی جداگانہ قومی حیثیت اور حالات کا اعتراف کیا جائے اور اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ وہ مختلف ہیں۔ امن کانفرنسیں، جن میں فاتح اتحادی قوتوں کو جرمنی، ترکی اور دوسری شکست خوردہ مرکزی طاقتوں کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا، ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۳ء تک جاری رہیں اور ان میں مسلم دنیا کا نیا نقشہ ترتیب دیا گیا۔ جو چار بڑے اس کانفرنس میں شریک تھے ان کے نام یہ ہیں: لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیا، ووڈرو ولسن صدر امریکا، جارج کلیمانسو صدر فرانس اور اورلینڈو وِیٹو نیو (Orlando

Marfat.com

(Vittonio وزیراعظم اٹلی۔

دوسرے اتحادیوں کے مقابلے میں مذاکرات میں اپنی حیثیت کو تقویت دینے کے لیے برطانیا نے نہ صرف خودمختار نوآبادیات، جیسے آسٹریلیا وغیرہ، کی جانب سے ووٹ دینے کا حق لے لیا تھا بلکہ ان نوآبادیات اور مقبوضات کی جانب سے ووٹ ڈالنے کی حیثیت کو تسلیم کرالیا تھا، جہاں ''ہوم رول'' یا داخلی خودمختاری موجود تھی جیسے ہندوستان۔ اس طرح برطانیا کے مجموعی طور پر کانفرنس میں سترہ نمائندے ہو گئے تھے جبکہ دوسری طاقتوں کے نمائندوں کی تعداد چار یا پانچ سے متجاوز نہیں تھی۔ ہندوستان کے نمائندے اس بار بھی وہی تھے جو ۱۹۱۷ء کی امپیریل وار کانفرنس میں شریک ہوئے تھے یعنی سر جیمس میسٹن (جو بعد میں لارڈ ہو گئے) سر ایس پی سنہا (وہ بھی بعد میں لارڈ سنہا ہوئے) اور مہاراجہ بیکانیر۔ باوجود اس حقیقت کے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکی کے ساتھ معاملات طے کرنے کی شرائط میں خصوصی دلچسپی تھی، یا پھر شاید اسی وجہ سے، مسلمانوں کا کوئی نمائندہ اس کانفرنس میں شریک نہیں کیا گیا۔ ہندوستان کے وفد کی کارکردگی کانفرنس میں بالخصوص کئی اعتبار سے بے وزن رہی۔ مہاراجا بیکانیر نے البتہ فرانس کے صدر جارج کلیمانسو کو ہندوستان تشریف لانے اور فروری ۱۹۱۹ء میں چیتوں کا شکار کھیلنے کی دعوت دے ڈالی۔ ہندوستان کے وفد کی غیر نمائندہ حیثیت نے ایک طرف اور دوسری جانب پورے ہندوستان میں بڑھتی ہوئی اس شدید بے چینی اور اضطراب نے جو عثمانی ترک اور عرب علاقوں کے بارے میں اتحادی منصوبوں نے پیدا کر دیا تھا سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا اور ہندوستانی وفد کے سربراہ ایڈون مانٹیگیو (Edwin Montegu) کو پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے انہوں نے چند کام کیے اور انڈیا آفس کے انتہائی معتدل قسم کے مسلم رابطوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں ان کا وہ مراسلہ ملاحظہ ہو جو انہوں نے مدراس کے گورنر لارڈ ولینگٹن کو لکھا اور جس میں مئی ۱۹۱۹ء میں پیرس میں ہونے والے ڈرامے کا کچھ احوال مذکور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

Marfat.com

''میں یہ مراسلہ آپ کو پیرس سے لکھ رہا ہوں جہاں میں پرائم منسٹر کی فوری طلبی پر پہنچا ہوں تا کہ ترکی سے معاہدے کے متعلق ہندوستان کے مسلمانوں کا نقطۂ نظر کانفرنس میں پیش کر سکوں۔ مہاراجا بیکانیر، سنہا اور مجھے گزشتہ سنیچر کو چار بڑوں کی خدمت میں پیش ہو کر نقطۂ نظر واضح کرنے کا موقع ضرور ملا اور چونکہ یہ مناسب تھا کہ ہمارے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے کچھ نمائندے بھی ہوں اس لیے میں آغا خان، میری کونسل کے ممبر آفتاب احمد خاں اور عبداللہ یوسف علی کو ساتھ لے گیا تھا۔ ہم نے اپنا مقدمہ پیش کیا اور اتنا ضرور ہوا کہ ہمیں پوری توجہ سے سنا گیا۔ نتیجہ کیا نکلتا ہے اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں معلوم۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک ہندوستانی وفد کا تعلق ہے ہم نے ساری اہم طاقتوں کے سامنے ہندوستان کے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی''۔

عبداللہ یوسف علی نے خود اپنے طور پر ''دی ٹائمز'' میں حکومت کو ایک یا دو مسلمان مشیر مقرر کرنے کا جو مشورہ دیا تھا وہ یقیناً بے توجہی کی نظر نہیں ہوا تھا۔ پیرس کی امن کانفرنس میں شرکت کے لیے ان کا انتخاب گویا تاج برطانیا کی خدمت میں ان کے شان دار طویل کیریر کا نقطۂ عروج تھا۔

ایک ایسے شخص کے لیے جس کا تعلق عوامی طبقے سے ہو اور جو ہندوستان کی اشرافیہ سے نسلی تعلق بھی نہ رکھتا ہو یہ ایک بڑی ہی شان دار کامیابی تھی کہ وہ آخر کار اس مقام تک پہنچ جائے جہاں سے عالمی امور کو نیا رخ دیا جا رہا تھا۔ یہ جگہ پیرس کا پیلیس آف ورسلیز تھی جس کے وسیع و عریض شان دار کمروں میں ہر طرف شیشے اور آئینے لگے ہوئے تھے اور جس کے اردگرد وہ کشادہ باغات تھے جس میں موسم بہار کا سبزہ نظروں کو تازگی کا احساس عطا کرتا تھا۔ ایک عام سے پولیس انسپکٹر کے بیٹے کے لیے یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ یہاں اس کی ملاقاتیں دنیا کی مشہور و معروف اور بڑی ہستیوں سے بھی ہوئیں اور غالباً شریف حسین کے بیٹے پرنس فیصل سے راہ و رسم

بھی قائم ہوئی جو عرب وفد کا قائد تھا۔ (۳۳)

پیرس کی امن کانفرنس کا یہ پہلا مرحلہ جون ۱۹۱۹ء میں معاہدہ وارسلیز پر دستخطوں کے بعد ختم ہوگیا۔ اس معاہدے کا بنیادی تعلق اگرچہ جرمنی کے مسئلے سے تھا لیکن اسی معاہدے کے نتیجے میں لیگ آف نیشنز قائم کی گئی۔ پیرس کانفرنس کی عام فضا کچھ ایسی بن گئی تھی جس میں مفتوح اقوام کو مزید شدت سے سزا دینا مقصود دکھائی دیتا تھا، لہٰذا جرمنی پر مالی تاوان ادا کرنے کا بڑا ظالمانہ بوجھ لاد دیا گیا۔ کمیٹیوں کے پس منظر میں ہونے والا بیش تر کام اور کارگزاری گنتی کے چند برطانوی سول سرونٹس کر رہے تھے۔ جس میں نمایاں شخص ماریس ہینکی (Maurice Hankey) تھا جو امپریل ڈیفنس کمیٹی کا سیکرٹری تھا۔ اس کے علاوہ دفتر خارجہ کے بیورو آف انٹیلی جنس کے افراد تھے جن میں لیپر، ٹوائن بی اور زمرن بھی شامل تھے۔

لیگ آف نیشنز ان اندرون خانہ سازشی مذاکرات اور بظاہر بلند آہنگ اعلانات اور مقاصد کے ساتھ وجود میں آئی اور اس نے فتح مند اقوام کو جرمنی اور عثمانی خلافت کے علاقوں پر اپنی گرفت قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے ایک قانونی جواز فراہم کر دیا۔

اگر تاج برطانیہ کی سلطنت کے وفادار حجاز اور عثمانی خلافت کے ماتحت عرب علاقوں کے بارے میں کسی قسم کی رائے کا اظہار کرنے کے لیے تیار نہیں تھے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ علی برادران اور خلافت تحریک کے دوسرے لوگوں کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ان کے نزدیک شریف حسین ایک باغی تھا جس نے برطانیہ کے تعاون اور مدد سے ان علاقوں میں اپنی بادشاہت قائم کر لی تھی جہاں سلطان ترکی محض مقدس مقامات کے خادم کی حیثیت سے حکومت کرنے پر مطمئن اور قانع تھے۔ (۳۴)

مسلم دنیا کے لیے اس وقت بہت کچھ داؤ پر لگ گیا تھا کیونکہ خلیفہ کا مکۂ مکرمہ اور مدینۂ منورہ

Marfat.com

پر مذہبی اختیار اس کے اقتدار سے مکمل طور پر وابستہ تھا۔ اتحاد کا ایک غیر معمولی مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب ہندوستان کے طول وعرض میں خلافت کمیٹیاں بن گئیں اور اس کا نقطۂ عروج اس وقت سامنے آیا جب نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ایک کانفرنس کے بعد آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم ہوئی۔ اس کانفرنس میں یہ اعلان کیا گیا کہ مسلمانوں کا یہ دینی فریضہ ہے کہ اگر خلافت کی جگہ کوئی ناجائز انتظام تھوپا جاتا ہے تو حکومت کے ساتھ ہر قسم کا تعاون فی الفور منقطع کر لیا جائے۔

مولانا محمد علی جوہر تحریک خلافت کے غیر متنازع ہیرو تھے۔ پیرس کی امن کانفرنس کا منظر نامہ محمد علی جوہر اور عبداللہ یوسف علی دونوں کے درمیان محاذ آرائی کے لیے بالکل تیار تھا۔

جرمنی کے بارے میں تصفیہ کی شرائط نے ہندوستان کے خلافت عثمانیہ سے ہمدردی رکھنے والوں کے لیے امید کی کوئی روشنی پیدا نہیں کی لیکن ہندوستان واپس آ کر وائسرائے چیمسفورڈ نے پیرس کی امن کانفرنس میں مسلمان نمائندوں کی موجودگی کے حوالے سے ممتاز لوگوں پر مشتمل خلافت تحریک کے وفد کو مطمئن کرنے اور ان کی تشفی کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ وفد جنوری ۱۹۲۰ء میں دہلی میں وائسرائے سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ وائسرائے نے وفد کے ارکان سے کہا:

''حاضرین کرام! میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ہندوستان کے وفد نے ترکی کی جانب سے اور اس کی حمایت میں ہر قسم کے مناسب دلائل کانفرنس میں لوگوں کے سامنے پیش کیے۔ کانفرنس میں وفد کی پوری بات مئی کے وسط میں سنی گئی۔ میری حکومت کی طرف سے باقاعدہ اٹھائے گئے نکات کے نتیجے میں اور بعد ازاں سیکرٹری آف سٹیٹ کی مساعی کے نتیجے میں اس بار وفد میں تین انتہائی سربرآوردہ ہندوستانی مسلمان بھی شامل کیے گئے تھے جن کے نام تھے ہز ہائنس آغا خاں، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور مسٹر یوسف علی''۔ (۳۵)

تحریک خلافت کے لوگ اس صورت حال سے قطعی مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے فی

Marfat.com

الفور محمد علی جوہر، مولانا سید سلیمان ندوی اور سید حسین کو یورپ روانہ کر دیا، تا کہ خلافت عثمانی کے اقتدار کے تحفظ کے لیے اپنا مقدمہ مضبوطی سے پیش کر سکیں۔ یہ وفد فروری ۱۹۲۰ء میں لندن پہنچا۔ یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب وہاں ترکی کے لیے نیا شرائط نامہ لکھا جا رہا تھا۔

محمد علی جوہر نے پورے جوش و جذبے سے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا اور اپنی مہم اس طرح چلائی جس کے نتیجے میں انہیں مانٹیگو کی تنقید اور سرزنش کا سامنا کرنا پڑا۔ ''محمد علی کے مطالبات کی شدت پسندی نے ہم کو اس مرحلے پر شدید نقصان پہنچایا ہے''۔ (۳۶) سیکیورٹی سروسز کی جانب سے وفد کی نقل و حرکت کی مکمل نگرانی کی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ لنچ پر ہونے والی ملاقاتوں کو بھی نگرانی سے مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ عبداللہ یوسف علی سے ملاقات کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے اگرچہ بعد میں انہوں نے خلافت کے دور سے اپنے تعلق کا دعویٰ کیا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ''جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں نے تحریکِ خلافت کو نئی زندگی دینے میں حصہ لیا ہے''۔ (۳۷)

جوہر نے جیمز میسٹن کے لیے ۱۹۱۳ء میں کان پور کی مسجد کی شہادت کے موقع پر مسائل پیدا کیے تھے اور اب وہ ایک کھوٹے سکے کی مانند دوبارہ نمودار ہو گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں مانٹیگو کو یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ تحریک خلافت کی شدت پسندی کی وجہ سے حکومت کے وہ منصوبے تاخیر اور تعویق کا شکار نہ ہو جائیں جو وہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کے لیے بنا رہی ہے۔ عبداللہ یوسف علی کے بارے میں زیادہ امکان اس بات کا نظر آتا ہے کہ انہوں نے یہ کوشش کی ہو گی کہ وہ کسی انقلابی سے رابطے میں نہ آ جائیں۔ (۳۸)

۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو تحریک خلافت کے وفد کی ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ پر لائیڈ جارج سے ملاقات ہوئی۔ محمد علی جوہر اور سید حسین نے پوری قوت سے جزیرۂ عرب کی تقسیم کے خلاف دلائل دیے:

Marfat.com

''مناسب اختیار اور اقتدار کے ساتھ خلافت کو محفوظ اور برقرار رکھنے کے اصل دعوے اور مطالبے کے علاوہ مسلمان یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے عقیدے کے مقامی مرکز و محور کی حیثیت سے جزیرۃ العرب پر کوئی آنچ نہیں آنی چاہیے اور یہ پورے کا پورا مسلمانوں کے کنٹرول میں رہنا چاہیے۔ ان کا یہ مطالبہ پیغمبرؐ کی اس ہدایت کے مطابق ہے جو انہوں نے انتقال سے پہلے مسلمانوں کو دی تھیں۔ جزیرۃ العرب میں شام، فلسطین اور عراق اور جزیرہ نمائے عرب بھی شامل ہے۔ مسلمان اس علاقے پر غیر مسلموں کے کنٹرول کو کسی طرح اور کسی بھی شکل میں قبول نہیں کریں گے خواہ اس کی شکل کسی عارضی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو۔'' (۳۹)

یہ ایک سعی لاحاصل تھی۔ وزیر اعظم لائیڈ جارج اپنے دل میں ترکوں کے لیے بہت گہری ناپسندیدگی محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس ملاقات میں بہت دیر تک اور بڑی تفصیل سے آرمینیا کے مسئلے کے ذکر کے ساتھ یہ کہا کہ جنگ میں فاتح اقوام مفتوح قوموں کے ساتھ اپنی مرضی کا معاملہ کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے پہلے وائسرائے اور سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا نے دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستان کے نمائندوں کی رائے لی گئی ہے لائیڈ جارج نے بھی اپنے بیان میں یہی مفہوم دہرایا: ''جب ہم پیرس میں تھے تو ہم نے بڑی احتیاط سے مسلمان نمائندوں کی رائے لینا ضروری خیال کیا تھا، جو اسی مقصد کے لیے ہندوستان سے آئے تھے۔ سب سے پہلے دو انتہائی فاضل ہندوستانیوں نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کی جو خود تو مسلمان نہ تھے لیکن انہیں اپنے مسلمان ہم وطنوں کے ساتھ مناسب سلوک کی ضرورت کا بہت زیادہ احساس تھا۔ بعد میں مسلمانوں کے وفود کا بھی انتظام کیا گیا۔ جن میں سے بعض برطانیا میں رہتے تھے اور دوسرے خاص اس مقصد کے لیے ہندوستان سے آئے تھے۔ میری درخواست پر سپریم کونسل نے ان کی عرضداشت کو پوری طرح سنا تھا''۔ (۴۰)

وہ دو فاضل ہندوستانی لارڈ سنہا اور گھن گرج کا انداز رکھنے والے مہاراجا آف بیکانیر تھے۔ یہ دونوں ہندو تھے۔ جبکہ ان کے مسلمان ساتھیوں میں وہ تین مسلمان نمائندے تھے جن کو مانٹیگیو سکریٹری آف سٹیٹ فار انڈیا نے پیرس کی امن کانفرنس میں وفد کے مشیروں کی حیثیت سے شامل کیا تھا۔ وہ تین اصحاب آغا خان، یوسف علی اور آفتاب احمد خاں تھے۔

جب پیرس میں امن کانفرنس کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو وہاں فضا مسلمانوں اور ترکوں کے پوری طرح خلاف تھی۔ قسطنطنیہ اور باسفورس کا ساحلی علاقہ اتحادیوں نے مارچ میں اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ مئی ۱۹۲۰ء میں ہونے والے Treaty of Sevres میں خلافت عثمانیہ کے صوبوں کو ختم کرنے کی اصولی اجازت حاصل کر لی گئی تھی۔ ترکی سے کہا گیا تھا کہ وہ سمرنا اور تھریس یونان کے حوالے کر دے اور آبنائے باسفورس بین الاقوامی کنٹرول میں دے دے۔ ترکی کی حکومت کے مالی معاملات کی کڑی نگرانی پر اتفاق ہو گیا تھا اور یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ آرمینیا اور کردستان کی دو خودمختار ریاستیں قائم کی جائیں۔

برطانیا کو فلسطین اور عراق پر عارضی مینڈیٹ حاصل ہو گیا تھا۔ اس فیصلے کو لیگ آف نیشنز کی حمایت حاصل تھی۔ سر ہربرٹ سیموئیل کو فوری طور پر فلسطین میں برطانیا کا ہائی کمشنر مقرر کر دیا گیا۔ اس وقت کے ایک مشہور صحافی نے لکھا: 'اگر آپ کو لیگ آف نیشنز کی جانب سے مینڈیٹ مل جاتا ہے تو کسی علاقے کو اپنے مقبوضات میں شامل کرنے کے لیے آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح برطانیا کو میسوپوٹامیہ (عراق)، فرانس کو شام، اٹلی کو ادالیہ، لیگ آف نیشنز کی فیاضی سے سب کو اپنا اپنا ''حصہ اور حق'' مل گیا'۔ (۴۱)

اگرچہ معاہدہ سیورز کے بعض فیصلے بعد میں تبدیل کیے گئے جس کی وجہ مصطفیٰ کمال پاشا کی عسکری مہموں کی کامیابیاں تھیں، ہندوستان کے مسلمان برطانیا کی اس سرد مہری سے سخت

Marfat.com

اشتعال و غضب کے جذبات کا شکار تھے جو اس نے ان کے دینی احساسات کو نظر انداز کر کے ظاہر کی تھی۔ لیگ آف نیشنز کو تو دھوکا دہی کا مترادف لفظ سمجھا جانے لگا تھا۔ یہ وہ ناراضگی کا احساس تھا جس نے جدوجہد آزادی کو ایک نیا موڑ عطا کیا جس میں تشدد کا عنصر بھی اب شامل ہوتا جا رہا تھا۔ تحریک خلافت نے دستوری اصلاحات کو پس پشت ڈال کر ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ انہوں نے اپنی قوت اور توانائی کو گاندھی جی اور کانگریس پارٹی کے ساتھ شامل کر دیا اس لیے کہ اب ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن برطانیا ہے۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک بہت طاقت ور اتحاد نے جنم لیا جس کی زندگی اگر چہ تھوڑی رہی، مگر اثرات دیر پا ہوئے۔ اس اتحاد نے ہڑتالوں اور ہندوستان کے لوگوں کو ٹیکس نہ دینے کی تحریک دی۔ ابتدا میں گاندھی جی حکومت سے بھڑ جانے اور اس کو نیچا دکھانے کی اس تحریک کو لے کر آگے بڑھنے کے معاملے میں خاصے متردد تھے لیکن تحریک خلافت کے لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بزور ان کو اس راہ پر آگے چلنے کے لیے مجبور کر دیا۔ (۴۲) بجائے اس کے کہ کچھ ایسے اقدام کیے جاتے جس کے ذریعے شدت سے بڑھتی ہوئی اس بحرانی کیفیت میں کچھ کمی آتی اور سیاسی اصلاحات کے کام کی رفتار میں اضافہ کیا جاتا برطانیا نے ہندوستان میں زمانۂ امن میں بھی اس مارشل لا کی توسیع کر دی جو اصلاً زمانۂ جنگ کے لیے نافذ کیا گیا تھا۔ (۴۳) ہندوستان کے لوگوں نے جنگ کے زمانے میں جو قربانیاں دیں اس کے بدلے میں برطانیا کا یہ رویہ سامراجی رعونت کا روایتی مظاہرہ تھا۔

ادھر خود برطانیا کی صورت حال بھی جنگ کے بعد خاصی تبدیل ہوئی تھی۔ واضح طور پر صنعتی بے چینی نظر آتی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ جو فوجی محاذ کی سخت آزمائشوں کے بعد وطن واپس آ رہے تھے وہ اشرافیہ کے مخصوص مفادات کے حامل معاشرے کی جگہ ایسی سوسائٹی کے طلب گار تھے جس میں سب کو معقول حصہ مل سکے۔ جنگ کے زمانے میں جو صنعتی تیزی آئی تھی اسے برقرار رکھنا

ضروری ہو گیا تھا، لیکن اس کے لیے ہندوستانی خام مال اور مارکیٹ کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ بالکل اس طرح جیسے فوجی مفادات کے تقاضوں نے جزیرۃ العرب کے بارے میں برطانیہ کے فیصلوں پر اثر ڈالا تھا، ہندوستان کے بارے میں کیے ہوئے داخلی مختاری اور ہوم رول کے وعدے بھی متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ وعدے جنگ کے دوران وقت کے تقاضوں کے پیش نظر اور حالات کی گرما گرمی میں کر لیے گئے تھے۔ بہر صورت لبرل پارٹی جس کو عبداللہ یوسف علی جیسے بہت سے ہندوستانیوں کی تائید اس لیے حاصل تھی کہ وہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کی علم بردار تھی اس کی قوت اور اثرات تیزی سے کم ہو رہے تھے۔ ہندوستان کا جنگ میں جو حصہ تھا اور جو کوششیں ہندوستانیوں نے جنگ کے لیے کی تھیں ان کی برطانیہ میں مناسب تشہیر نہیں ہوئی، نہ ان کو پوری طرح سمجھا گیا اور نہ ہی ان کی قدر و قیمت کو جانا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی عبداللہ یوسف علی کی یہ امید برقرار تھی کہ برطانیہ کی جمہوریت اور برطانیہ کے عوام ہندوستان کے ساتھ انصاف ضرور کریں گے۔ (۴۴)

اس وقت پورا ہندوستان جلیانوالہ باغ کے قتل عام جیسے حادثے کی وجہ سے تڑپ رہا تھا جس میں وہ ہندوستانی جنہوں نے مارشل لا کے خلاف احتجاج کیا تھا فوجیوں کے ہاتھوں بے دریغ مارے گئے تھے۔ انہی دنوں عبداللہ یوسف علی اس تخت طاؤس کے مسئلے میں الجھے ہوئے تھے جس کے بارے میں یہ خبر اڑ گئی تھی کہ وہ استنبول (قسطنطنیہ) میں موجود ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''جنگ کے بعد ہندوستان کو جو نئی حیثیت ملی ہے اس کے لیے یہ دہلی اور ہندوستان کے لیے کیا ہی انمول تحفہ ہوگا''۔ (۴۵) ہاشمی خاندان کی بغاوت، سیورز کا معاہدہ (Treat of Sevres) اور مسلسل جاری رہنے والے مارشل لا نے ان کی نسل کے مسلمانوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ واقعات انہیں ہوش میں لے آئے تھے۔ لیکن عبداللہ یوسف علی ابھی تک برطانیہ کے بارے میں اپنے اعتماد پر جمے ہوئے تھے۔

Marfat.com

۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو برطانیا میں مقیم مسلمانوں اور ان کے ہمدردوں کے ایک گروپ نے ایک عرض داشت لیگ آف نیشنز کو پیش کی، جس میں ترکی کے معاہدے پر نظر ثانی کی درخواست کی گئی تھی۔ یوسف علی اس عرض داشت کے پیش کرنے والوں کے ساتھ فریق نہیں تھے۔ (۴۶) اس کا ایک سبب ممکن ہے یہ ہو کہ وہ لندن میں موجود ہی نہیں تھے بلکہ دسمبر میں بمبئی پہنچ گئے تھے جہاں Wilson's Anglo- Muhammadan Law نامی کتاب کی ترتیب کو آخری شکل دے رہے تھے۔ (۴۷) انہیں کچھ ہی دنوں بعد حیدر آباد دکن میں ایک نئے منصب کی ذمہ داریاں سنبھالنا تھیں۔ عبداللہ یوسف علی نے ۱۹۲۵ء تک 'معاہدہ سیورز' پر مہر سکوت نہیں توڑی۔ یہ اس وقت ہوا جب ہندوستان کی تاریخ پر ایک کتاب میں اس معاہدے کی ان ذلت آمیز شرائط کا سرسری ساذکر آیا جو ترکوں پر تھوپ دی گئی تھیں۔ (۴۸)

۱۹۲۰ء میں ۴۷ سال کی عمر میں ہندوستان واپسی کے اسباب غالباً ذاتی نوعیت کے ہوں گے۔ اسی سال کے اوائل میں انہوں نے گرٹروڈ این مابی (Gertrude Anne Mawbey) سے شادی کی تھی جو ٹامس مابی (Thomas Mawbey) نامی ڈربی کے مجسٹریٹ اور کتابوں کے ناشر کی بیٹی تھیں۔ بدقسمتی سے ان کی سابقہ بیوی سے جو بچے تھے یوسف علی سے ان کی ناراضگی بتدریج بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بالخصوص بلوائے کا رویہ، جواب تقریباً ۲۰ سال کا ہو چکا تھا، باپ کے ساتھ بہت نا روا تھا۔ اپنی وصیت میں انہوں نے اس کو ترکہ سے محروم کرنے کا فیصلہ ثبت کر دیا اور لکھا: ''درحقیقت میرا بیٹا بلوائے اپنی حرکتوں میں اتنا آگے جا چکا ہے کہ وہ مجھے گالیاں دینے، توہین کرنے اور بدنام کرنے سے بھی نہیں چوکتا، اور میرے اوپر وقتاً فوقتاً الزام تراشی کرتا رہتا ہے۔ ہندوستان آنے سے عبداللہ یوسف علی کم از کم اپنی نوبیاہتا نوجوان بیوی کو اس ناخوش گوار صورت حال سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کا اسلامی نام معصومہ رکھا جو ان کی پہلی بیوی کی بے وفائی کے پس منظر میں نہایت معنی خیز تھا۔ گزشتہ

Marfat.com

پانچ سال ان کی پبلک زندگی میں جرأت وشجاعت کے مظاہرے اور پرائیویٹ ذاتی زندگی میں ذہنی مصائب و آلام برداشت کرنے سے عبارت تھے۔ اب ان کی زندگی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہی تھی جس میں ذاتی سکون وقناعت کے زیادہ مواقع بھی تھے اور آئندہ دو دہائیوں تک تخلیقی، علمی اور ادبی کام کا ایک بڑا ذخیرہ بھی سامنے آنا تھا۔

Marfat.com

حواشی باب سوم

۱- وائسرائے ہارڈنگ نے اس امر کی یقین دہانی کرائی تھی کہ ''عرب کے مقدس مقامات، عراق میں موجود مقابر اور زیارات اور جدہ کی بندرگاہ برطانوی بحری یا بری افواج کے حملوں یا کسی بھی قسم کی زیادتی سے محفوظ رہیں گی بشرطیکہ ہندوستان کے حجاج اور زائرین کو، جو ان مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے سفر کرتے تھے، کوئی دشواری اور رکاوٹ پیش نہ آئے''۔ وائسرائے کی اس یقین دہانی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو قدرے اطمینان ہو گیا اور فوج میں بھرتی کی رفتار میں اضافہ ہوا۔ ملاحظہ ہو: Niemeijer کی ''خلافت موومنٹ ان انڈیا'' صفحہ ۸۰

۲- زبیدہ یزدانی کی ''دی سیونتھ نظام: دی فالن ایمپائر'' صفحہ ۱۰۳۔ نظام پر بڑی شدت سے انتہائی بااختیار پولیٹیکل ریذیڈنٹ سر اسٹوارٹ ویزر کا دباؤ تھا کہ وہ ۱۹۱۴ء میں منشور کو جاری کر دے۔

۳- ایشیاٹک ریویو، جلد ۶، ۱۹۱۵ء صفحہ ۳۳-۲۶

۴- ہیرالڈ نکلسن کی ''کنگ جارج پنجم'' صفحہ ۸۶

۵- ملاحظہ ہو القدوائی کا آرٹیکل ''اسلامک ریویو اینڈ مسلم انڈیا'' جلد III شمارہ 1 جنوری ۱۹۱۵ء۔ اس شمارے میں ۳۰ دسمبر ۱۹۱۴ء کو منعقدہ اس اجلاس کی روداد بھی شائع ہوئی تھی جو جریدے کے مدیر مولوی صدرالدین اور ووکنگ مسجد کے امام کے مابین ہوئی اور یہ لائحہ عمل تجویز ہوا کہ ''یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان کو مسلمان سے لڑا دیا گیا ہے لیکن اسلام ہمیں ایفائے عہد کی بھی تعلیم دیتا ہے اس لیے ہم ہز مجسٹی کنگ کی

Marfat.com

خدمت میں وفادار رہنے کا عزم کرتے ہیں جن کی ہم سب ہی رعایا ہیں''۔

۶- PRO:FO 371-4231(1919-20) علی برادران کے نزدیک ان کا واحد جرم صرف یہ تھا کہ ''وہ اپنے مسلمان بھائیوں سے آزادیٔ اظہار کا حق استعمال کرتے ہوئے ہمدردی اور اخوت کے جذبے کو فروغ دینا چاہتے تھے اور اپنے رسولؐ کے خلیفہ کے ساتھ وفاداری کا اظہار کر رہے تھے جو اصولاً تمام مسلمانوں کے حاکم اعلیٰ ہیں''۔

۷- یوسف علی کے نام کا اندراج ملاحظہ ہو۔ منوہر: ''مسلمز ان انڈیا۔ اے بائیوگرافیکل ڈکشنری'' نومبر ۱۹۷۹ء

۸- کنٹمپریری ریویو (Contemporary Review) جلد CVIII، ۱۹۱۵ صفحہ ۴۴۶-۴۵۶

یہ ایک تاریخی اہمیت کا مقالہ ہے جس میں ۱۹۱۶ء تک ہندوستان کی اس قربانی کی تفصیل ملتی ہے جو اس نے فوجی اور مالی طور پر اتحادیوں کے مقاصد کے حصول کے لیے دی۔ اس میں وہ دولاکھ فوجی سپاہی شامل تھے جو بعد میں بڑھ کر ایک ملین (دس لاکھ) ہو گئے۔ ان میں سے بہت سوں کا انجام اور خاتمہ میدان جنگ کی ان قتل گاہوں میں پہنچ کر ہوا جو سوم (Somme) اور قط الامارہ (Kut-el-Amara) کے محاذوں پر واقع تھیں۔ اس کے علاوہ تقریباً پچاس ملین پونڈ اسٹرلنگ کے مساوی رقم بھی صرف اپریل ۱۹۱۵ء تک ہندوستان کی طرف سے جنگ کے اخراجات کی مد میں ادا کی گئی۔

۹- IOL:L/MIL/7/1734.7. اس فائل کا موضوع یورپ میں لڑنے والے ہندوستانی سپاہیوں کی ڈاک کی سنسر شپ ہے۔ اس میں ان لوگوں کے خطوط کے اقتباسات اور خلاصے شامل کیے گئے ہیں۔ یہ سرکاری خلاصے جن کو سنسر نے تیار کیا تھا،

Marfat.com

انڈیا آفس میں بھیجے گئے اور ساتھ ہی دفتر جنگ اور دفتر خارجہ کے علاوہ اس کی ایک کاپی شاہی دفاتر میں بھی ارسال کی گئی۔ان خطوط کے ذریعے ان سپاہیوں کی وفاداری کے پیمانے کی جانچ پڑتال ہوتی تھی اور ان رپورٹوں کی بنیاد پر مسائل اور مشکلات پیدا کرنے والوں کی صفائی کی جاتی تھی۔ان میں سے کچھ خطوط بڑے جذباتی ہیں اور ہندوستانی سپاہیوں کے اس تحیّر کی بڑی واضح تصویر کشی کرتے ہیں جو انہوں نے میدانِ جنگ میں محسوس کیا۔

۱۰- ۱۹۳۶ء میں ای-ڈبلیو-پریرا کا ایک پراسرار حوالہ ان الفاظ میں ملتا ہے: ''مجھے مسٹر علی سے ۱۹۱۵ء کے دشوار اور مایوس کن دنوں میں بہت خاص قسم کی معاونت فراہم ہوئی تھی'' اور اسی حوالے سے انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ''انہوں نے خاموشی کی جو قسم کھا رکھی تھی وہ توڑنا پڑی'' ان کا یہ تبصرہ سری لنکا کے پریس میں رپورٹ ہوا جس میں اس سال وہاں منعقد ہونے والی آل سیلون مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں عبداللہ یوسف علی کے دورے اور شرکت کی روداد بھی چھپی تھی۔ملاحظہ ہو ''ٹائمز آف سیلون'' ۱۵ ستمبر ۱۹۳۶ء (YA 128) اس کے علاوہ اسی تاریخ کا ''سیلون ڈیلی نیوز'' (YA 130)

۱۱- ''دی اسلامک ریویو'' ووکنگ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۶ء جلد ۵ شمارہ ۲، ۳ فروری-مارچ ۱۹۱۷ء عبداللہ یوسف علی نے عید میلاد النبیؐ کے ایک جلسے کی صدارت کی تھی جو سیسل ہوٹل میں ۶ جنوری ۱۹۱۷ء کو ہوا تھا۔

۱۲- ۱۹۱۷ء جب محکمہ اطلاعات قائم ہوا تو یہ براہ راست وزیر اعظم کو جواب دہ تھا اور انہی کو رپورٹ کرتا تھا۔۱۹۱۸ء میں اس کے پروپیگنڈا سیکشن کو جو ولنگٹن ہاؤس لندن واقع تھا، وزارت اطلاعات میں ضم کر دیا گیا۔یوسف علی کا اس وزارت سے اگلا رابطہ دوسری

Marfat.com

جنگ عظیم کے دوران ہوا۔ بیورو آف انٹیلی جنس، جس کو عام طور پر پولیٹکل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کہا جاتا تھا، دفتر خارجہ کے ماتحت آ گیا۔

۱۳- PRO:FO 372/1322(1919) اس میں سینٹ ساوا ایوارڈ کی تفصیل ملتی ہے۔ مسٹروک اینڈ سربین سکلپچر (Mestrovic & Serbian Sculpture) نامی کتابچہ Vigo Cabinet نامی ایک ادبی اور فنی سیریز کا حصہ تھا۔

۱۴- صرف بارہ سال بعد جب عبداللہ یوسف علی کے تصورات میں تبدیلی آ گئی تھی تو انہوں نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ ''محمڈن'' کی اصطلاح انتہائی غیر مناسب ہے۔ عثمانیوں کے انتظام وانصرام کے متعلق ان کی معلومات کی شہادت ان کے اس مضمون سے ملتی ہے جو ''لائف اینڈ لیبر آف دی پیپل آف انڈیا'' کے عنوان سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا ''ملتوں کی داخلی خودمختاری کا نظام ترکی سلطنت کے مضبوط نظم ونسق کے لیے بہت مفید ومعاون ثابت ہوا ہے کیونکہ سلطنت کی رعایا مختلف النسل لوگوں پر مشتمل تھی۔ عثمانی خلافت جو اگرچہ بے حد قابل احترام اور قابل تعریف اداروں پر مشتمل تھی لیکن اس میں دو کمزوریاں موجود تھیں جو اس کی ناکامی کا سبب بن گئیں۔ ایک یہ کہ انتظامی مشنری بے حد کمزور تھی اور کام کرنے کے طریقے بہت ڈھیلے ڈھالے تھے۔ دوسری کمزوری اس نظام میں یہ تھی کہ دباؤ گھٹانے کا انتظام نہیں تھا اور معاشرتی ترقی کو آسان بنانے کے لیے ضروری وسائل مہیا نہیں تھے جن کے ذریعے ایک قدیم تہذیبی روایت اور نظم میں نئے خیالات اور تصورات شامل ہو سکیں۔ صفحہ ۳۴۸

Marfat.com

۱۵- ''دی ہندوستان ریویو' جنوری ۱۹۱۶ء ''ہمارا قریبی مستقبل'' ۹۷

۱۶- ''دی ہندوستان ریویو' اگست ۱۹۱۷ء ''دی امپیریل وار کانفرنس'' ۱۹۱۷ء

۱۷- ''ہواز ہو ۱۹۱۸ء'' اس میں یوسف علی کا سکونت کا پتا یوں درج ہے: نمبر ۱۶ نیو اسکوائر' لنکز ان' اور ۲۵۔ سٹن کورٹ، چزوک

۱۸- PRO:FO 395/190(1918) اس دستاویز میں یوسف علی کے اسکینڈ ے نیویا کے ۱۹۱۸ء کے سفر کی تفصیلات ملتی ہیں۔

۱۹- ایضاً، فائل پر نوٹ تحریر کردہ ایچ سی اونیل وزارت اطلاعات مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۱۸ء

۲۰- ایضاً، گیسلی (Gaselee) کا یوسف علی کے نام خط ۱۵ اپریل ۱۹۱۸ء کو لکھا گیا ہے۔ اس وقت یوسف علی کے گھر کا پتا چیل ووڈ -۳/ بیڈفورڈ روڈ، بیڈفورڈ پارک، لندن ڈبلیو ۴ تھا۔

۲۱- ایضاً، ایچ سی اونیل کا مراسلہ ایل-سی- مارٹن کے نام۔ جو برطانوی مندوب، کوپن ہیگن کے پتے پر ۵ر اپریل ۱۹۱۸ء کو روانہ کیا گیا۔

۲۲- یوسف علی کے ڈینش زبان میں تحریر کردہ کتابچے کا نام ''ہندوستانی ثقافت کی خصوصیات'' تھا جسے ڈنمارک کی زبان میں ڈیوڈ گرنبام نے ایل سی، مارٹن کی معاونت سے منتقل کیا تھا۔ اس کتابچے پر ٹائمز کے لٹریری سپلیمنٹ میں ۵ ستمبر ۱۹۱۸ء کو تبصرہ شائع ہوا تھا۔

۲۳- رائٹرز کی رپورٹ بعنوان ''بوگس انڈین کمیٹی'' ملاحظہ ہو: دی ٹائمز ۱ا مئی ۱۹۱۸ء

۲۴- Aftontidning: FO 395/190 کے لیے جو مراسلہ بھیجا گیا تھا اس پر انڈین نیشنل کمیٹی کی طرف سے وریندر ناتھ چٹوپادھیا کے دستخط ثبت تھے۔ جو

Marfat.com

اقتباسات یہاں دیے گئے ہیں وہ دفتر خارجہ کی فائل میں موجود ترجمہ سے ماخوذ ہیں۔ مطبوعہ خط کے ترجمے کی مکمل نقل یوسف علی کو ۱۴/ جولائی ۱۹۱۸ء کو دفتر خارجہ کی جانب سے ارسال کی گئی تھی، جس کے جواب میں انہوں نے دریافت کیا تھا کہ یہ خط سویڈن کے اخبار میں پورا چھپا تھا یا اس کے اجزا شائع کیے گئے تھے۔

۲۵- ''دی ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ'' ۱۹ ستمبر ۱۹۱۸ء

۲۶- عبداللہ یوسف علی کو مسلم لیگ کی لندن شاخ میں ۱۷-۱۹۱۵ء کے عرصے کے دوران کچھ لیکچرز دینے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس حوالے سے عبداللہ یوسف علی نے دسمبر ۱۹۲۵ء میں ''آل انڈیا تنظیم کانفرنس'' میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں نے (اس وقت) ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑوں کا ایسا گلہ قرار دیا تھا جس کا کوئی چرواہا نہ ہو۔ وہاں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو چاہتے تھے کہ میں ان کو رہنما تسلیم کروں۔ جب میں نے ایسا نہیں کہا تو ظاہر ہے کہ وہ ناراض ہو گئے تھے''۔

مسلم لیگ کی لندن شاخ کا قیام اپریل یا مئی ۱۹۰۸ء میں ہوا جس کا دفتر نمبر ۴۲، کوئین این چیمبرز، ویسٹ منسٹر میں قائم کیا گیا تھا۔ بہت سی وجوہات سے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ یوسف علی مسلم لیگ کے کاموں میں اتنا گہرا اور واضح انہماک نہیں رکھتے تھے جیسا کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے سامعین تسلیم کر لیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ عبداللہ یوسف علی کا تعلق بمبئی کے مسلمانوں کے اس دانش ور گروپ سے تھا جو بدرالدین طیب جی کے پیش کردہ ہندو مسلم اتحاد اور تعاون کے نقطۂ نظر کے حامل اور وارث تھے جبکہ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے جو خصوصی حقوق طلب کر رہی تھی وہ انتہائی ناپسندیدہ بات سمجھی جاتی تھی۔

Marfat.com

دوسری وجہ یہ تھی کہ یوسف علی کے روابط برطانیا کی لبرل پارٹی کے سیاست دانوں سے تھے جس کی مثال لارڈ مورلے سے ان کی دوستی تھی، جبکہ لندن کی مسلم لیگ کے بانی جسٹس امیر علی، برطانیا کی قدامت پسند سیاسی جماعت کنزرویٹو پارٹی سے وابستہ تھے۔ گویا امیر علی اور عبداللہ یوسف علی برطانیا کے نظم و نسق (اسٹبلشمنٹ) کے دو مختلف حلقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ وہ دونوں دو مختلف کلبوں کے ممبر تھے۔ یعنی ایک ریفارم کلب کا ممبر تھا تو دوسرا ''نیشنل لبرل کا''۔ اوپر کے اقتباس میں جن اصحاب کی بدمزگی کا ذکر ہے اس کا اشارہ بہت ممکن ہے کہ امیر علی کی جانب ہو۔ مزید ملاحظہ ہو: کے۔ کے۔ عزیز ''برطانیا اور مسلم انڈیا'' صفحہ ۷۱ اور سید امیر علی کی یادداشتیں اور دوسری تحریریں صفحہ ۷۵-۷۴

۲۷۔ ایضا، ملاحظہ ہو FO 395/190 اونیل نے اپنا گول مول اور غیر واضح قسم کا وضاحتی نوٹ دفتر خارجہ میں ۱۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو یعنی جنگ کے اختتام کے اعلان سے صرف ایک یوم قبل داخل کیا تھا جو ان الفاظ پر مشتمل تھا:

مسٹر گیسلی

''مجھے افسوس ہے کہ میں اعتراف کر رہا ہوں کہ آپ نے جو کہا ہے وہی صحیح ہے۔ وہ فائلیں گم ہو گئی ہیں یا مجھے اسی طرح کی اطلاع فراہم کی گئی ہے۔ لیکن میں اس کو اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا۔ فی الحقیقت اگر قانونی اعتبار سے میں جھجک کا شکار نہ ہوتا تو یہ ضرور کہتا کہ وہ فائلیں آخری مرتبہ آپ کو اس لیے ارسال کی گئی تھیں کہ ان کو آگے انڈیا آفس بھیج دیا جائے۔ میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کرتا لیکن یہ کہانی ان واقعات کی ایک مثال ہے جو قدرت اس لیے کبھی کبھار فراہم کر دیتی ہے کہ وہ لوگ جو اپنے آپ

کو بہت لائق و فائق سمجھتے ہیں ان کو ذرا سار سوا کر دے۔ میرا اشارہ اپنی ہی طرف ہے لیکن کیا اب ہم ان فائلوں کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتے؟

اگر یوسف علی کی فائل فی الحقیقت گم ہوگئی تھی تو اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی کی بات یہ ہوئی کہ گیسلی آگے چل کر دفتر خارجہ میں 'دستاویزات' کے سرکاری محافظ کے منصب پر فائز ہوئے۔

۲۸- ملاحظہ ہو دیباچہ ''انڈیا اینڈ یورپ'' مطبوعہ ۱۹۲۵ء: 1925 تک یوسف علی کا آئیڈیلزم (مثالیت پسندی) نرم پڑ چکا تھا۔ اس اقتباس میں آگے چل کر وہ کہتے ہیں: ''ہماری آئندہ نسلیں ایک سے تین پشتوں کے بعد اس امر کے بارے میں ہم سے زیادہ بہتر فیصلہ کر سکیں گی''۔

۲۹- مراسلہ بابت قسطنطنیہ دی ٹائمز ۲۹ نومبر ۱۹۱۸ء

۳۰- اس پورے بیان میں لفظ ''Caliphate'' اس ادارے کے لیے استعمال ہوا ہے جس کا مرکز خلافت عثمانیہ ترکی میں تھا اور خلافت کا لفظ ہندوستانی مسلمانوں کی اس تحریک کے لیے ہے جس کی قیادت ہندوستان میں علی برادران کر رہے تھے۔ اگرچہ سلطان عبدالحمید ثانی ۱۹۰۹ء میں معزول کر دیے گئے تھے مگر خلافت کا ادارہ ۱۹۲۴ء تک قائم رکھا گیا تھا۔

۳۱- وہ اپیل جو ٹائمز میں شائع ہوئی تھی جس میں مندرجہ ذیل مضمون بھی شامل تھا: ''وہ مسلمان جنہوں نے سلطنت (برطانیا) کے دفاع کے لیے اپنا خون دیا ہے یا دوسرے مادی وسائل سے مدد کی ہے اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ وہ یہ امید رکھیں کہ ترکی کے معاملے میں قومی وحدت اور آزادی اور استقلال کا وہی اصول برقرار رہے گا جس طرح

Marfat.com

کہ یورپ کی دوسری تمام اقوام کے معاملے میں اس کو نافذ کیا گیا ہے۔کوئی بھی دوسرا راستہ اختیار کیا گیا تو اس کے اثرات تکلیف دہ ہوں گے کہ وہ بلند مقاصد اور اصول جن کے نام پر مسلم دنیا کی عظیم اکثریت کی وفاداریاں، تعاون اور وابستگی حاصل کی گئی تھی ترکی کے معاملے میں ان کو صرف اس لیے نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ترکی ایک مسلم ریاست ہے۔ہمیں پورا یقین ہے کہ کسی قسم کے مذہبی یا نسلی تعصب کو مسلم اقوام کے اس اعتماد کو مجروح کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا جو انہیں اب تک اتحادیوں پر بھروسے کی شکل میں موجود ہے۔مزید یہ بھی کہ اس تاریخی لمحے میں موجود عالمی مسائل کو عدل و مساوات کے اصولوں کے علاوہ قومی وحدت اور قومی حکمرانی کے ان ضابطوں کے مطابق حل کیا جائے گا جو برطانوی وزیر اعظم اور امریکی صدر نے پیش کیے ہیں۔ہم بڑے ادب و احترام سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ پورا علاقہ جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ ہے ترک قوم کے ہاتھوں میں ہی چھوڑ دیا جانا چاہیے۔البتہ ترکی کے دوسرے علاقوں کے بابت ہم فی الحال رائے دینا نہیں چاہتے۔

ملاحظہ ہو"دی انڈین خلافت موومنٹ ۲۳-۱۹۱۵ء" کے-کے عزیز صفحہ ۲۸-۲۶۔میں شامل مسلم رعایا کے بعض لوگوں کی جانب سے برطانیا کے سیکریٹری خارجہ کے نام مراسلہ

۳۲- IOL:Mss Eur D5 23/16 مانٹیگو پیپرز۔اس مراسلے پر ۲۱ رمئی ۱۹۱۹ء کی تاریخ درج ہے۔مانٹیگو کو ہندوستان کے اصلاح پسند سیکرٹری آف سٹیٹ کی حیثیت سے یاد رکھا گیا ہے۔وہ برطانوی پارلیمنٹ کے یہودی عقائد کے حامل لبرل ارکان کے حلقے کے ایک ممتاز رکن تھے۔یہ لوگ برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج سے سیاسی اور تجارتی دونوں قسم کے قریبی روابط رکھتے تھے۔ان لوگوں میں ہربرٹ سموئیل اور

Marfat.com

Rufus Isaacs شامل تھے جو بالترتیب دورانِ جنگ امریکا میں سفیر اور ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کے وائسرائے بھی رہے تھے۔ سموئیل اور آئزیکس کے برخلاف مانٹیگیو فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے خیال سے متفق نہیں تھے اور کابینہ میں انہوں نے ترکوں کے لیے بہتر شرائط کے حصول کے لیے بہت لڑائی بھی لڑی تھی۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں مانٹیگیو نے استعفیٰ دے دیا اور اس سے اگلے سال ان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے وائسرائے چیمسفورڈ کو ۲۵/جون ۱۹۱۹ء کو ایک مراسلہ لکھا تھا جس میں ان کی مایوسی اور پریشانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جہاں تک ترکی کا تعلق ہے میں بے تکان لڑ رہا ہوں بالفور (Balfour) میرا اصل اور خطرناک دشمن ہے جبکہ ملنر (Milner) میرا واحد سہارا ہے۔ آغا خان بہت مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ مجھے ابھی یہ یقین تو نہیں ہے کہ ہم ناکام ہو گئے ہیں لیکن اب زیادہ تر انحصار امریکی رویّے پر ہے''۔ ملاحظہ ہو مخطوطہ نمبر IOL: Mss Eur D 523/3 تجارت کے حوالے سے ۱۹۱۲ء میں ہونے والے ایک بڑے سکینڈل کی تفصیلات کے لیے جن میں لائیڈ جارج، سموئیل اور آئزیکس تینوں شامل تھے۔ فرانسس ڈونالڈسن کی تالیف: دی مارکونی سکینڈل ملاحظہ ہو۔

۴۴۔ فیصل مئی ۱۹۱۹ء میں شام کے بادشاہ بنے لیکن انہیں فرانسیسیوں نے صرف پانچ ماہ بعد ہٹا دیا۔ انہوں نے پہلے لندن میں پناہ حاصل کی اور بعد میں برطانیا کی مدد سے ۱۹۲۱ء میں عراق کے بادشاہ بن گئے۔ یوسف علی نے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۷ء کو 'دی ٹائمز' لندن میں فیصل کی وفات پر ایک تعزیتی نوٹ لکھا تھا۔ انہوں نے لکھا:

''ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس کا بغداد میں شاہ فیصل نے بطور مہمان استقبال کیا

Marfat.com

اور جوان کی سادگی، سپاہیانہ انداز اور کریمانہ اخلاق سے انتہائی متاثر ہوا تھا کیا آپ مجھے ان کی یاد میں مختصر اً خراج عقیدت پیش کرنے کی اجازت دیں گے؟

ان کی کامیابی کا راز ان کے حقائق کے ادراک اور بدلتے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو بدل لینے کی صلاحیت میں مضمر تھا۔ ان کے محل میں بدو عربوں کا ہجوم رہتا تھا جو ان سے ملنے آتے تھے اور ان سے روایتی بدوؤں کے معیار کی جمہوری مساوات کی امیدیں وابستہ رکھتے تھے۔ وہ ان کے معقول مطالبات پورے کرنے سے کبھی انکار نہیں کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ شہری آبادی کے اعتماد پر بھی پورا اترتے تھے۔ اہل تشیع بھی جو جنوبی عراق کی آبادی کا غالب حصہ تھے ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ ان کو برطانیہ سے تعلق پر ایک دانش مندانہ یقین تھا۔ تعلیم سے ان کی دلچسپی گہری تھی۔ میں ان سہولتوں کے لیے ان کا شکر گزار ہوں جو انہوں نے مجھے اپنے نئے اور ابھرتے ہوئے تعلیمی نظام کے مطالعے کے لیے فراہم کی تھیں۔ انہیں اس تعلیمی نظام کو سمجھنے کا بڑا اشتیاق تھا جو برطانیہ نے ہندوستان میں نافذ کیا تھا۔ اور جب میں نے اس نظام کے بعض منفی پہلوؤں کی جانب نشان دہی کی تب تو ان کی دلچسپی بے حد جذباتی حدوں کو چھونے لگی تھی۔ ان کے ذہن میں عراق میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال اپنی انتہائی ابتدائی شکل میں موجود تھا اور مجھے امید ہے کہ ہیرو (Harrow) کے تعلیم یافتہ ان کے جانشین شاہ غازی اس اسکیم کو عراق کے حالات کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ان سطور میں یوسف علی کا اشارہ اپنے ۱۹۲۹ء کے سفر عراق کی طرف ہے۔ اس بات کا امکان کم ہے کہ شاہ فیصل کی اگر ان سے اس سے قبل پیرس میں ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو

Marfat.com

وہ اس طرح غیر معمولی طور پر یوسف علی کی خاطر تواضع کرتے۔ اگر یہ حوالہ صحیح ہے تو یوسف علی کی شناسائی پیرس امن کانفرنس کے عرب وفد کے مشیر ٹی۔ای۔لارنس سے بھی ضرور ہوئی ہوگی۔ عبداللہ یوسف علی نے کناڈا کا دورہ کیا تھا۔ کناڈا کے ایک اخبار ''فری پریس'' نے جو اونٹیریو کے شہر لندن سے شائع ہوتا تھا اپنی ۶ جنوری ۱۹۳۹ کی اشاعت میں ان کے کناڈا کے دورے کے بارے میں معلومات دی ہیں، جس میں اخبار نے ان کو ''آنجہانی کرنل لارنس آف عربیا کا ذاتی دوست'' لکھا ہے۔

۳۴- (1919-20) PRO:FO 371/4231 یہ اقتباس علی برادران کے اس میمورنڈم سے ماخوذ ہے جو انہوں نے اپریل ۱۹۱۹ء میں جیل سے وائسرائے کو ارسال کیا تھا۔ اس دستاویز سے اس واضح فرق کا اندازہ ہوتا ہے جو سلطنت برطانیا کے وفاداروں نے اپنے عاجزانہ اور انتہائی فدویانہ عرض داشتوں میں استعمال کیا تھا۔ یہ دستاویز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہو کر قرآن کی ان آیات پر ختم ہوئی ہے جن کا مفہوم ہے ''اے ایمان والو صبر و صلوٰۃ سے مدد حاصل کرو اور جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں ان کو مردہ نہ کہو''۔ اس عرض داشت کے مطابق مسلمانوں کے ہاتھ سے اسلام کے مرکزی مقامات نکل جانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری شریف حسین پر عائد ہوتی تھی۔ اس میمورنڈم میں ان اسباب کو دستاویزی حیثیت مل گئی جن کی وجہ سے برطانیا نے حجاز میں ہاشمیوں کی بغاوت کو ہوا دی تھی۔ اس کے مطابق ۲۱ را کتوبر ۱۹۱۵ء کو یعنی ۲ رنومبر ۱۹۱۴ء کے اعلان پاسداری عہد کے ایک سال سے بھی کم عرصے میں (ملاحظہ ہو نوٹ نمبر ۱ وائسرائے ہارڈنگ کا اعلان عہد) ہم دیکھتے ہیں کہ سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا وائسرائے کو مندرجہ ذیل مضمون کا برقیہ ارسال کرتے ہیں: ''اس وقت ہماری پوزیشن اور اس میں بہتری کے امکانات بڑے غیر یقینی ہیں۔ عرب اپنے

Marfat.com

روپے کے معاملے میں بڑے متردد ہیں اور اگر ہم ان کو کچھ زیادہ پرکشش پیش کش کرنے میں ناکام رہے تو وہ شائد ترکوں سے مل جائیں۔ ہمیں مشرق کی جانب بڑی واضح اور نمایاں کامیابی حاصل کر کے دکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال ہے کہ ہم بغداد پر قبضہ کرلیں اور عربوں کو یقین دلا دیں کہ ہم ترکوں سے آزادی کے بعد عربوں کی خودمختار ریاست کے حق میں ہیں''۔

یہ میمورنڈم ایک بہت زیادہ نقل ہونے والی دستاویز ہے۔ بعض مستشرقین نے اس دستاویز میں موجود قرآنی حوالوں کو معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ منالٹ کہتا ہے کہ ترکوں کی حمایت کا جذبہ معقول سیاسی سمجھ بوجھ کا اظہار تھا جس سے اسلامی اخوت کا احساس پیدا ہوتا تھا اور جس احساس نے انہیں (یعنی ہندوستانی مسلمانوں کو) اپنے اندر باہمی اتحاد کے لیے بنیاد فراہم کی تھی جس کی ان کو ہندوستان کی سیاسی فضا میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں بڑی شدت سے ضرورت تھی۔ ملاحظہ ہو'' خلافت موومنٹ'' صفحہ ۵۷۔ اس قبیل کے اسکالر حضرات تاریخی دستاویزوں کو اپنی پسند کے مطابق کانٹ چھانٹ کر سیاق وسباق سے علیحدہ کر لیتے ہیں، جس طرح یہاں پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ برصغیر میں مذہب صرف ابن الوقت مسلمان سیاست دانوں کے لیے لوگوں کو جمع کرنے کا ایک کارآمد وسیلہ ہے۔

۳۵۔ خلافت کے وفد کی یادداشت بنام وائسرائے اور وائسرائے کا جواب جو ایس ایس پیرزادہ کی مرتب کردہ کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو'' قائداعظم محمد علی جناح کی جمع کردہ تحریریں۔ ایس۔ ایس۔ پیرزادہ صفحہ ۳۸۲۔۳۷۲

۳۶۔ ملاحظہ ہو مخطوطہ IOL:Mss Eur D 523/4 '' مانٹیگو پیپرز''، مانٹیگو کا مراسلہ

Marfat.com

چیمسفورڈ کے نام مورخہ یکم اپریل ۱۹۲۰ء

۳۷- بڑی شدت اور کمال احتیاط سے جو نگرانی کی جا رہی تھی اس کی مثال یہ اقتباس ہے: ''۸/مارچ ۱۹۲۰ء جوہر نے کیپٹن بینٹ کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا جو امیر علی کا قریبی دوست ہے اور اخبارات میں ترکی کی حمایت میں اشتہارات شائع کروانے کا ذمہ دار بھی ہے۔ ملاحظہ ہو مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری نمبر IOL/L/R&s/18/B 361۔ عبداللہ یوسف علی نے ''آل انڈیا تنظیم کانفرنس'' سے خطاب میں خلافت تحریک کے لوگوں سے اپنے تعلقات کا دعوی کیا تھا۔ ایضاً

۳۸- اپنی کتاب 'The Making of India' میں جو ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی انہوں نے کہا تھا کہ علی گڑھ کو علی برادران کی انقلابی مہم سے بچا لیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ کا حکومت کی مالی مدد پر انحصار کم کیا جائے۔ صفحہ ۲۹۸

۳۹- ملاحظہ ہو مخطوطہ نمبر IOL/L/R&s/18/B 361 ہندوستان کے خلافت کے وفد سے وزیر اعظم کی ملاقات کی روداد کا ریکارڈ۔

۴۰- ملاحظہ ہو مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری نمبر IOL/L/R&s/18/B 361 ایضاً

۴۱- ملاحظہ ہو: ورنن بارٹلٹ کی کتاب ''امن کانفرنس کے پس منظر میں''۔ یہ بارٹلٹ، خبر رساں ایجنسی رائٹرز کا پیرس امن کانفرنس میں نمائندہ تھا۔

۴۲- ''گاندھی جی اپنے مسلم اتحادیوں کی بڑھتی ہوئی بے صبری پر بڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ اب مسلمان ان سے آگے آگے ان کی عدم تعاون کی تحریک کو لے کر بڑھنے لگے تھے۔ مزید یہ کہ وہ یورپین اشیا کے بائیکاٹ کی تجویز سے بھی متفق نہیں تھے''۔ ملاحظہ ہو مینالٹ کی کتاب ''دی خلافت موومنٹ'' صفحہ ۹۶۔ اس کے علاوہ

Marfat.com

نیمچر کی کتاب صفحہ ۱۰۸-۱۰۷، جس میں وسط ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے رویے میں تردد کی تفصیل دی گئی ہے جو اسے عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں تھا۔ تحریک خلافت کا مطالبہ تھا کہ پولیس سے استعفے دے دیئے جائیں اور ٹیکس دینا بند کر دیا جائے۔ یہ وہ اقدام تھے جو اس وقت کی کانگریس کے لیے زیادہ جرأت کے متقاضی تھے۔

۴۳- یہ جج رولٹ کی تیار کردہ ایک رپورٹ کا نتیجہ تھا جو آخر کار ۱۹۱۹ء کے رولٹ ایکٹ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یوسف علی اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے اس پر معترض نہیں ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا ''رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کا جو خلاصہ ٹیلگراف کے ذریعے موصول ہوا ہے اس سے ہندوستان میں فوجداری مقدمات کے طریق کار کے متعلق کچھ سوالات ضرور اٹھتے ہیں جن پر غور اس لیے ضروری ہے کہ ان کا اثر عدلیہ کے انتظام وانصرام اور اسی سے متعلق وسیع تر معاملات سے وابستہ ہے۔ کمیٹی نے جو تنقید اور سفارشات مرتب کی ہیں بلاشبہ وہ اپنے عملی انطباق کے حوالے سے صرف ان مخصوص مقدمات سے متعلق ہیں جو بغاوت کے جرم میں چلائے جاتے ہیں'' دی ٹائمز ۱۶ اگست ۱۹۱۸ء۔ جب رولٹ رپورٹ ایک بل کی شکل میں قانون سازی کے لیے پیش ہوئی تو پورے ہندوستان میں ۱۹۱۹ء کے موسم بہار اور موسم گرما میں احتجاج کی زوردار لہر اٹھی۔ جناح نے رولٹ ایکٹ کے متعلق کہا تھا: ''کسی مہذب ملک کے قانون کی تاریخ میں ایسے قوانین کے بنائے جانے اور نافذ کیے جانے کی کوئی نظیر نہیں ملتی''۔ ملاحظہ ہو، جناح آف پاکستان مصنفہ ایس والپورٹ صفحہ ۶۱

۴۴- ''دی ہندوستان ریویو'' جنوری ۱۹۱۶ء مقالہ بہ عنوان ''ہمارا قریبی مستقبل''

۴۵- تختِ طاؤس کے موضوع پر ۱۰ ستمبر ۱۹۱۹ کو 'دی ٹائمز'' میں شائع ہونے والے مراسلے

میں عبداللہ یوسف علی نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ تخت طاؤس کو خریدنے کے لیے کیوں نہ ہندوستان میں فنڈز اکھٹے کیے جائیں'' کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اسے ہندوستان اور اس کے نئے شاہی پایہ تخت کے لیے حاصل کرلیا جائے۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام کا واقعہ ۱۳/اپریل کو ہوا تھا جنرل آر۔ ڈائر کے حکم پر ۹۰ سپاہیوں نے دس منٹ تک مسلسل بیس ہزار کے مجمع پر فائر کھولے رکھا جو رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کرنے جمع ہوئے تھے۔ اسی سال موسم گرما میں گوجرانوالہ میں احتجاج کرنے والوں پر فضا سے بمباری کی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو۔ پی۔ جی۔ روب کی تالیف: ''دی گورنمنٹ آف انڈیا اینڈ ریفارم'' صفحہ ۱۷۷ جس میں دونوں واقعات کی تفصیل درج ہے۔

۴۶- ملاحظہ ہو مخطوطہ نمبر IOL:L/I&s/II/190,File 8342 وہ یادداشت جو برطانیا کی رعایا کے افراد نے ''لیگ آف نیشنز کو پیش کی تھی۔ دستخط کنندگان میں اکثر وہی لوگ شامل تھے جنہوں نے اس سے قبل جنوری ۱۹۱۹ء میں بھی ایک مؤدبانہ عرض داشت پر اپنے نام اور دستخط ثبت کیے تھے۔ یادداشت میں کہا گیا تھا کہ انتداب کا حق کمزور اور چھوٹی اقوام کے استحصال اور ان کے حقوق غصب کرنے کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال نہیں کیا جائے گا۔ دستخط کرنے والوں میں لارڈ ایبنگڈن اور لارڈ لیمنگٹن بھی شامل تھے جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ لیبر لیڈر ریمزے میکڈونلڈ نے بھی اس یادداشت پر دستخط کیے تھے۔

۴۷- ولسن کی کتاب اینگلو محمڈن لا کے پانچویں ایڈیشن کا دیباچہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے'' بمبئی یکم دسمبر ۱۹۲۰۔'' اس سے اگلے سال اسے کلکتہ سے تھیکر اینڈ اسپنک نے شائع کیا تھا۔

۴۸- ملاحظہ ہو'' دی میکنگ آف انڈیا'' ۱۹۱۵ء صفحہ ۲۹۵

چوتھا باب

ہمہ جہت شخصیت

نوجوان شہزادے میر عثمان علی خاں دکن میں اپنی وسیع سلطنت کے حاکم تھے۔ ان کی حکومت ایک نرم سی اشرافیہ کے ذریعے چل رہی تھی۔ انہیں اس حقیقت کا پورا احساس تھا کہ اصل اور مؤثر طاقت اس پولیٹیکل ریذیڈنٹ کے پاس ہے جس کا تقرر دہلی سے کیا جاتا ہے۔ عبداللہ یوسف علی نے ایک مختصر سے عرصے کے لیے نظام کے ''صرف خاص'' میں مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں جو ایک ایسا ادارہ تھا جس کا کام شاہی زمینوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں وہ ریاست کی ایگزیکٹو کونسل کے ریونیو ممبر مقرر ہو گئے۔ (۱)

اس منصب نے ان کو ریاست حیدر آباد دکن میں زمینوں کے محاصل، قحط کی صورت حال اور اس کے انتظام مالیانہ کا معائنہ، جنگلات، چونگی، کسٹم اور ایکسائز اور پولیس کا نگران اور ذمہ دار بنا دیا تھا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو یو۔پی میں آئی سی ایس کلکٹر اور ڈپٹی کمشنر رہنے کے بعد ان کے لیے انتہائی مناسب تھا۔ نظام خود بڑی تن دہی سے تمام امور پر نگاہ رکھتے تھے، آپس میں دست و گریبان اشرافیہ کی زیادتیوں کی روک تھام بہت کامیابی سے کرتے تھے اور اپنے اہم وزرا کو اپنے مقرر کردہ مشیروں کے مشورے سے نظم و نسق چلانے پر اصرار کرتے تھے۔ ان کا خصوصی کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی کی سرپرستی تھی جو ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئی تھی اور جس میں ہندوستان بھر سے اہل علم اور سکالرز کھچ کھچ کر جمع ہونے لگے تھے۔ حیدر آباد یو۔پی کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے ایک بہتر جگہ بن گیا جس کی مثال ایک ایسے جزیرے کی سی ہوگئی جہاں مسلمانوں کو خوشحالی اور امن و استقلال میسر تھا۔ عبداللہ یوسف علی کو بھی نظام کی سیاست بھلی لگی ہوگی کیونکہ یہاں پر ''خلافتیوں'' کو برداشت نہ کیا جاتا تھا۔ (۲)

Marfat.com

عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک دارالترجمہ بھی تھا جہاں نصابی کتب اور سائنس سے متعلق لٹریچر کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ عبداللہ یوسف علی بھی ان ثقافتی اشغال میں شریک ہو گئے۔ جس کا ذکر بعد میں انہوں نے ان الفاظ میں کیا: ''جب میں حیدر آباد میں تھا تو مجھے عثمانیہ یونیورسٹی اور اُردو کی تحریک کے بالکل ابتدائی مراحل میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اپنی زبان کو ایسی مستند کتابوں اور نئی تصانیف کے ترجموں سے مالا مال کیا جائے جنہیں بعد میں تدریس کے لیے جامعہ میں استعمال کیا جا سکے۔ میں نے بھی ایک مختصر سا اُردو رسالہ ''اردو کتابت کا فن'' لکھا جس کا مقصد اُردو کی تحریر و کتابت، املا اور طباعت کو منظم اور مرتب کرنا تھا۔ (۳)

عبداللہ یوسف علی نے ۱۹۲۲ء میں اچانک اپنی ذمہ داریوں سے استعفیٰ دے دیا۔ اگرچہ اس وقت ان کے لیے ہر چیز درست اور مناسب معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کا خیال یہ تھا کہ تمام کام ایک اصول اور ضابطے کے مطابق ہونے چاہییں، نہ کہ محض نظام کے حکم یا کسی اور نواب کی خواہش پر کوئی فیصلہ کیا جائے۔

عبداللہ یوسف علی کے متعلق لارڈ میسٹن کا مشاہدہ اور اندازہ جو انہوں نے ان کے آئی سی ایس کے زمانۂ ملازمت میں کیا تھا کہ وہ ''انتہائی زود رنج اور حساس طبع'' شخص ہیں، اس مزاج کے ساتھ دربار کے سازشی ماحول میں ان کے لیے زندگی کئی اعتبار سے دوگنی دشوار ہونی ہی تھی۔ ان کی حیدر آباد سے روانگی کے فوراً بعد ان کے ایک ہم عصر بمبئی کے اکبر حیدری کا تقرر بطور ریاست کے وزیر مالیات ہو گیا۔ اکبر حیدری عبداللہ یوسف علی سے بالکل مختلف ذرا موٹی کھال والی شخصیت تھے۔ چنانچہ وہ اگلے بیس برسوں تک ریاست میں اس انتہائی اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ یہ ایک ایسا مثالی کیریر تھا جو عبداللہ یوسف علی کے لیے بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ ایک کہانی یہ بھی مشہور ہوئی تھی کہ نظام کی ملازمت کے دوران میں بھی عبداللہ یوسف علی سول سروس ہی کے لیے

Marfat.com

کام کر رہے تھے اور ان کے استعفے کی اصل وجہ وائسرائے لارڈ ریڈنگ اور نظام کے درمیان کسی قسم کا نزاع تھا۔(۴) شاید ۱۹۱۳ء میں اپنے استعفے کی اصل وجوہات بتا کر ریکارڈ کو درست رکھنے کے لیے حقائق کو آشکارا کرنا ان کے لیے اپنی اور ٹیریسا کی علیحدگی کے تاریک پہلوؤں کے ظاہر ہونے کے خوف کی وجہ سے آسان نہ رہا ہو۔

عبداللہ یوسف علی کو حیدرآباد سے کبھی پرخاش یا ناراضگی نہیں رہی۔ انہوں نے بعد میں کئی مضامین ''اسلامک کلچر'' جریدے کے لیے لکھے جو حیدرآباد سے اکبر حیدری کے زیر سرپرستی نکلتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے نظام کی سلور جوبلی کے جشن میں بھی شرکت کی اور حیدرآباد کے عمائدین سے بھی دوستانہ تعلقات برقرار رکھے۔ مثلاً نواب عمادالملک حسین بلگرامی، نواب سرامین جنگ بہادر اور نواب سر نظامت جنگ وغیرہ سے ان کے مراسم ہمیشہ کی طرح خوش گوار رہے۔(۵) عبداللہ یوسف علی کے قیام حیدرآباد کے مختصر مدت کی ایک یادگار ان کے بیٹے راشد کی ولادت بھی ہے جو اگست ۱۹۲۲ء میں ہوئی تھی۔(۶)

عبداللہ یوسف علی حیدرآباد سے ترک سکونت کر کے انگلستان کے ایک مختصر دورے کے بعد وکالت اور لکھنے پڑھنے کی مصروفیات کے لیے لکھنو آ گئے۔ انگلستان وہ اپنی فیملی کے لیے رہائشی انتظامات کرنے گئے تھے۔(۷) اگرچہ وہ ایک سند یافتہ بیرسٹر ہونے کے ساتھ ساتھ گفتگو اور تقریر سے دوسرے لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے جس کی وکالت کے پیشے میں کامیابی کے لیے بڑی ضرورت ہوتی ہے لیکن حقیقتاً وہ ایک علمی اور ادبی آدمی تھے۔ ان کو خصوصیت کے ساتھ مغل تاریخ سے دلچسپی تھی اور انہوں نے ڈبلیو۔ ایچ مورلینڈ کے ساتھ مل کر جو یو۔ پی میں لینڈ ریونیو کے محکمے کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے تھے اکبر کے زمینی محاصل کے نظام کا مطالعہ کیا تھا۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے یو۔ پی کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے ایک اجلاس میں بابر کے بارے میں اس کی ''تزک'' کے حوالے سے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں انہوں نے بابر کی بہت سی غیر معمولی خوبیوں اور کمالات کا اعتراف اور ذکر

Marfat.com

کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: ''پس اپنی زندگی اور موت دونوں میں بابر ایک جری اور فیاض انسان تھا۔ اس کی سخت کوشی کی زندگی میں فطرت سے محبت کا عنصر بھی بہت گہرا تھا۔ اس کی مہماتی زندگی میں کامیابیوں اور ناکامیوں نے اس کی شخصیت میں رحم دلی اور شفقت کے پہلو کو کبھی ختم نہیں کیا۔ اس کی باطنی سچائی اور اخلاص، اس کی طاقت اور کمزوری دونوں اس کی خودنوشت سوانح کے ہر صفحے پر نمایاں نظر آتی ہیں''۔ (۸)

یہ انتہائی متأثر کرنے والے فقرے اور الفاظ کی تراکیب جو انہوں نے ایک مسلمان بادشاہ کے لیے تعریف کرتے ہوئے استعمال کیے ہیں دراصل ان کے ذہنی رویوں میں تبدیلی کا اشارہ کرتے ہیں۔ اس سے دس سال پہلے جارج پنجم کا چہرۂ مبارک ان کی عزت و تکریم اور محبت و عقیدت کا مرکز تھا۔ اب کم از کم ان کے دل کے مندر کی مورتیوں میں ماضی کے ایک مسلمان بادشاہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جس طرح بابر اپنی عسکری مہمات کے لیے کمر کس کے تیار ہوا کرتا تھا اب عبداللہ یوسف علی بھی ہندوستان کے مسلمانون کے طرز فکر کو بدلنے اور انہیں ایک نئی طرح کی سوچ سے آگہی فراہم کرنے کی مہم کی تیاری کر رہے تھے جو بڑے غیر محسوس طریقے سے لڑی جانی تھی۔

اس کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ اپریل ۱۹۲۳ء میں انہیں پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے لاہور میں خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ اپنے خطاب میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے ان ساری متبادل صورتوں کا بھی تجزیہ پیش کیا جو علم و دانش اور سیاست میں کردار کے حوالے سے مسلمانوں کو دستیاب ہو سکتی تھیں۔ ان کی تقریر سے یہ پتا چلتا تھا کہ انہوں نے اسلام کے بارے میں از سرنو غور و فکر شروع کر دیا ہے اور ان کا ذہن یورپ کے حوالے سے ترقی کے جو تصورات رکھتا تھا اس میں وہ اسلامی فکر کے عنصر کو شامل کرنے یا سمونے میں منہمک ہو چکے ہیں۔ اس مہم کا آغاز ۱۹۲۳ء میں لاہور میں پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے خطاب کرنے کی ایک دعوت سے ہوا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں ان راہوں کی نشان دہی کی جو علمی اور سیاسی سطح پر مسلمانوں کے لیے کھلی ہوئی تھیں۔ ان کی تقریر سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے اسلام کے بارے

Marfat.com

میں از سر نو سوچنا شروع کیا ہے اور ان کا ذہن یورپ اور ترقی کے بارے میں ان کے نظریات میں اس نئے عنصر کو سمونے میں مشغول ہے۔ انہوں نے اثنائے خطاب کہا:

''اب اس وقت اسلام کو ہر چار سو اس طنز و تعریض کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ اسلام تنگ نظری کا مذہب ہے اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ آپ اور میں اور وہ سب لوگ جو اسلام کو سمجھتے ہیں یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام پر یہ الزام سراسر غلط ہے، لیکن ہمیں اپنے اداروں اور عملی کارکردگی سے یہ دکھانا ہوگا کہ ہم اپنے تعلیمی نظام کو جدید اور فکری آزادی کے اصولوں پر استوار کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اسلامی فکر و دانش کو جدید مغربی علوم کے ساتھ مربوط کیا جائے تاکہ ہمیں وہ تازہ توانائی حاصل ہو سکے جو ہمیں اپنے مخصوص مسائل سے نمٹنے اور ان کو حل کرنے کے لیے درکار ہے۔ یہ مسائل سماجی، معاشرتی اور سیاسی سبھی قسم کے ہیں اور ان کے حل کے لیے ہمیں جدید تعلیم کے ہتھیاروں سے اپنے آپ کو لیس کرنا اور جدید معاشروں کی شناخت اور نشو و نما کے اصولوں اور طریقہ ہائے کار کو سمجھنا پڑے گا۔ جدیدیت کی جانب اس سفر کے راستے میں جو خطرات ہیں ان پر ہمارے علماء اور دوسرے طنز و تعریض کے عادی اصحاب نے کچھ زیادہ ہی توجہ دی ہے۔ ہمیں یقیناً ان سے چشم پوشی تو نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک انگریزی محاورے کے مطابق نئی شراب سے کہیں پرانی بوتل ہی نہ ٹوٹ جائے، اس طرح ہم شراب اور بوتل دونوں ہی سے محروم ہو جائیں۔ (۹)

اگر سرسید کو انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ابن الوقت کہہ کر نشانہ تنقید بنایا گیا، صرف اس لیے کہ وہ بلاتردد یورپ کی بالادستی کو قبول کر چکے تھے تو بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آنے تک اس الزام کی شدت میں کمی آ چکی تھی اور ان کا ذکر ایک خاموش احترام سے کیا جانے لگا تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے اپنے خطبے میں مسلمانوں کی مذہبی شناخت کے مسئلے کو بھی اٹھایا اور اس کے ساتھ ہندو مسلم مفاہمت یا تعاون کا مسئلہ بھی ان کی توجہ کا موضوع بنا۔ انہوں نے کہا تھا ''جہاں

Marfat.com

تک ہمارا تعلق ہے ہم مذہبی سوالات کا جواب اپنے ہی مذہبی نقطۂ نظر سے تلاش کرتے ہیں اور اس پر پوری طرح مطمئن ہیں۔ اور ساتھ ہی دوسرے تمام لوگوں اور ان کی جماعتوں کے ساتھ بھی تعاون کے لیے آمادہ ہیں جو معاشرے میں منظم ترقی کے خواہاں ہیں۔ ہم صحیح قسم کے ہندوستانی نیشلزم کو ترقی پسندانہ تصورِ اسلام کے خلاف تصور نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اسلام کا ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ہندوستان میں ایک پائیدار قومیت کے فروغ میں معاون و مددگار ثابت ہوسکتا ہے''۔ عبداللہ یوسف علی کا فکری تصور یا نظامِ فکر مسلمانوں کی مذہبی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں ہندوستانی قومیت اختیار کر کے مغربی انداز کی تعمیر و ترقی میں شریک ہونے پر ابھارتا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ اقبال اس کانفرنس کے شرکاء میں موجود تھے یا نہیں۔ لیکن عبداللہ یوسف علی کے دلائل کی سمت اور ان کی پر امیدی کے منظر نامے نے انہیں شدت سے مضطرب اور سخت نقطۂ نظر اختیار کرنے پر مجبور ضرور کیا ہوگا۔ (۱۰)

لاہور میں عبداللہ یوسف علی کے میزبان غالباً میاں فضل حسین رہے ہوں گے جو پنجاب کے وزیر تعلیم تھے جن کو اس منصب پر آنے کا موقع گورنر سر ایڈورڈ میکلاگن کی خصوصی توجہ اور عنایتوں سے ملا تھا۔ (۱۱)

عبداللہ یوسف علی جون ۱۹۲۳ء میں لاہور سے براستہ بمبئی برطانیا کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ بعد ازاں انہوں نے اپنا وقت اپنی دو تصنیفات یعنی ''ہندوستان کی تشکیل'' اور ''ہندوستان اور یورپ'' پر صرف کیا۔ ان دونوں کتابوں میں انہوں نے ہندوستان کی بہتر اور اُمید افزا تصویر پیش کرنے کی شعوری کوشش کی۔ وہ تمام آلام و حوادث جو گزشتہ عشرے میں ہندوستان میں پیش آئے تھے۔ مثلاً کان پور کی مسجد کا حادثہ، ترکی میں جنگ سے پیدا ہونے والے تکلیف دہ اثرات، رولٹ ایکٹ اور اس کے بعد جلیانوالہ باغ کا خونی واقعہ جو ۱۹۱۹ء میں پیش آیا اور پھر تحریک خلافت اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے بگڑتے ہوئے باہمی تعلقات۔ ان کا ذکر بہت کم تفصیلات

کے ساتھ کیا گیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو غیر متنازع بنا کر پیش کرنے کی بہت شعوری کوشش کی تھی اور ہندوستان کی ایک ایسی تصویر پیش کی تھی جو پرسکون اور پرامن ہے سوائے اس معمولی ارتعاش کے جو کبھی کبھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک برطانوی مبصر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ ''مصنف ان موضوعات پر بہت اچٹتی ہوئی نظر ڈالتا ہے جنہیں وہ ظالمانہ کارروائیوں اور ناگوار حقائق کا نام دیتا ہے''۔ (۱۲)

کتاب ''ہندوستان کی تشکیل''، بمبئی کے سابق گورنر وائی کاؤنٹ ولنگٹن اور ان کی بیوی کے نام منسوب کی گئی تھی اور انتساب عبداللہ یوسف علی کے مخصوص مبالغہ آمیز تعریفی انداز میں کیا گیا تھا۔ یہ انداز جس بات کا مظہر تھا وہ یہ تھی کہ اس طرح انہوں نے جناح کے احساسات کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور علی برادران سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس انداز سے سیاسی فائدہ بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوا۔ ولنگٹن جناح کی نظروں میں قابل نفرت و ملامت شخص تھا اور گورنر کی حیثیت سے اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ علی برادران کو مروا دے گا یا جلاوطن کرا دے گا۔ ''ہندوستان کی تشکیل نو'' ایک ایسی کتاب تھی جس میں یوسف علی ہم عصروں سے بالکل علیحدہ اور منفرد نظر آتے ہیں۔ اس کتاب میں امیر علی کی سیرت پر تالیف کے علاوہ جو ۱۸۹۱ء میں چھپی، کسی بھی ہم عصر مصنف کے خیالات کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے۔

برطانیا کے انتظامی دروبست کا ایک پہلو جو عبداللہ یوسف علی کے لیے دل آزاری کا باعث تھا وہ حکومت کی نسلی امتیاز کی پالیسی تھی۔ انہوں نے ہندوستان میں برطانیا کے ان ''غیر سرکاری'' افسران کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں جو اپنے آپ کو حکمران طبقہ ہی شمار کرتے تھے۔ ''ان کا یہ دعویٰ اور زیادہ اذیت کا سبب تھا کہ حکمران نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو حکمرانوں کی نسل کے لیے مخصوص حقوق کے طلب گار ہوتے تھے''۔ انہوں نے اس موقع پر اسلام کے روشن خیالی پر مبنی ضابطے کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

Marfat.com

''مسلمانوں کو ان کا عقیدہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ نسلی تعصبات سے بلند رہیں۔ مسلمانوں کے تصور اخوت میں ساری نسلیں مساوی مقام رکھتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے عالمی مذاہب کے ہاں اخوت و مساوات کا تصور ملتا ہے۔ لیکن اسلام نے مساوات کے اس تصور کو اپنی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ اور ان کے خلفا کے عہد میں یہ فی الواقع ایسا ہی تھا اور یہ اب بھی ایسا ہی ہے گو کہ ان نسلوں اور ممالک کی تعداد جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اب بے حد بڑھ چکی ہے''۔ (۱۳)

جس طرح ہندوستان برطانیا سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے اس طرح اسلام بھی مغرب کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ اس طرح کا باہمی تعاون نئی ابھرنے والی دنیا کی ایک اہم خصوصیت بننے والی ہے۔ عبداللہ یوسف علی کے نئے فکری رجحانات میں یہ خیال نمایاں ہو رہا تھا۔ ان کی تصنیف ''انڈیا اور یورپ'' میں ایک جگہ پر یوسف علی کی دلچسپی ایک ایسی روحانی برادری کی تشکیل کی جانب محسوس ہوئی جس کے ذریعے مذاہب اور اقوام کے مابین توازن اور تعلق میں پائیداری پیدا کی جا سکے۔ دس سال بعد وہ ایک عالمی مذاہب کی کانگریس میں مصروف اور منہمک ہونے والے تھے۔ لیکن یہاں بھی وہ لکھتے ہیں کہ ''میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کا مذہب ایک ہی جیسا ہے خواہ ان کی روحانی اور وجدانی وضاحتوں پر مشتمل فلسفیانہ تعبیرات کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں اور خواہ ان کی روحانی آرزوؤں کی شکل بھی ایک دوسرے سے علیحدہ دکھائی دیتی ہو''۔

اب ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کا وہ دور آ گیا تھا جس میں بعض ''شعبے، مثلاً تعلیم، زراعت و صحت، وغیرہ مرکز سے لے کر صوبوں کے وزراء کی نگرانی میں دے دیے گئے تھے جو منتخب قانون ساز اداروں کو جواب دہ تھے۔ وہ لوگ جو مزید بنیادی تبدیلیاں چاہتے تھے اس بات سے سخت مایوسی کا شکار ہوئے تھے کہ امن و امان اور قانون کے نفاذ کا بنیادی کام اب بھی گورنر اور اس کی سرکاری ایگزیکٹو کونسل کے ہی ہاتھ میں تھا۔ وائسرائے اور گورنروں کو اب بھی یہ اختیارات

Marfat.com

حاصل تھے کہ اسمبلیوں کے رد کر دینے کے باوجود وہ قانون سازی کے بلوں پر مہر تصدیق ثبت کر دیں۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں اس نئے انتظامی بندوبست کے تحت انتخابات ہوئے تھے اور عبداللہ یوسف علی جو موسم گرما انگلستان میں گزارنے کے بعد واپس آ چکے تھے ان انتخابات میں یو۔ پی میں نیم دلی سے شریک ہوئے اور اس کے اثرات بھی بہت محدود اور بے نتیجہ رہے۔ (۱۵) اس مسئلے میں جناح کی دلچسپی زیادہ تھی۔ انہوں نے ایک آزاد مسلم امیدوار کی حیثیت سے بمبئی کی قانون ساز اسمبلی میں نشست حاصل کر لی تھی۔

عبداللہ یوسف علی ۱۹۲۴ء میں لاہور واپس آئے اور یہ موقع تھا انجمن حمایت اسلام کی جو ایک فلاحی تعلیمی تنظیم تھی چالیسویں سالگرہ یا یوم تاسیس کا۔ اس انجمن کا خاص تعلیمی کارنامہ اسلامیہ کالج تھا جو ایک ایسا تعلیمی ادارہ تھا جو مسلمان لڑکوں کے لیے ۱۸۹۲ء میں قائم کیا گیا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ علی گڑھ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کر رہا ہے وہ اسلامیہ کالج میں شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کیا جائے۔ ادارے کے بانیوں کے مطابق مسلمان لڑکوں کے لیے یہ ایک ایسا ادارہ ہوگا جو انہیں ''دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی تعلیم مہیا کرے گا''۔ (۱۶) انجمن کی کالج کمیٹی کے صدر شیخ عبدالقادر تھے جنہیں ایک پرنسپل کی تلاش تھی۔ یہ منصب عبداللہ یوسف علی کو اگلے تعلیمی سال کے آغاز پر سنبھالنے کی پیشکش کی گئی۔ انہوں نے یہ پیش کش یہ سوچ کر قبول بھی کر لی کہ یہ ملازمت ایک ایسا موقع فراہم کرے گی جس میں عوامی خدمت خوش گوار اور سازگار ماحول میں کی جا سکتی ہے۔ اس وقت پنجاب میں فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی جو دراصل موقع پرست جاگیرداروں اور زمین داروں کا ایسا جمگھٹا تھا جو شہروں میں مضبوط بنیاد رکھنے والے ہندو بنیوں اور ساہوکاروں کے خلاف متحد ہو کر مقابلہ آرا تھے۔ صوبے کی برطانوی حکومت کو شہری اور دیہاتی طبقات کی ایسی ہی تقسیم درکار تھی جو اس کے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ انگریزی حکومت نے جاگیرداروں اور

Marfat.com

زمین داروں کو مزید انتخابی نشستیں دے دیں اور شہری نشستیں کم ہوگئیں۔ اس کے پس پشت مقصد یہ تھا کہ زمین دار طبقے کی مزید سیاسی پشت پناہی کی جائے تاکہ دیہاتی علاقوں سے سپاہیوں کی بھرتی کا سلسلہ رکنے نہ پائے کہ اُن کے نزدیک پنجاب سپاہیوں کی فراہمی کے لیے سب سے بڑی منڈی تھی۔

اس طرح کی باہمی ضرورتیں، تقاضے اور ایک دوسرے پر انحصار برٹش گورنر اور یونینسٹ پارٹی کے مابین گرمجوشی کے تعلقات کی بنیاد فراہم کرتے تھے۔ یہ دلچسپ اتفاق تھا کہ اس وقت پنجاب کا نیا گورنر میلکوم ہیلی تھا جو آئی سی ایس کے اسی ۱۸۹۵ء کے گروپ کا رکن تھا جس میں عبداللہ یوسف علی بھی شامل تھے۔ دوسرے متعدد مواقع کی طرح عبداللہ یوسف علی اب بھی اپنے تعلقات سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اگلے سال کے لیے جب ان کی منصوبہ بندی مکمل ہوگئی تو وہ اپنی فیملی کے پاس لندن واپس چلے گئے۔

ان کا ۱۹۲۵ء کا موسم گرما اپنے نئے گھر جو Chiswick میں واقع تھا منتقل ہونے میں گزر گیا۔ ''یہ ایک شاندار اور خوبصورت موسم گرما تھا جو انہوں نے اپنی بیوی معصومہ اور بیٹے راشد کے ساتھ گزارا اور بہت سے دوستوں کی ضیافتیں کیں۔ (۱۷) اپنے نئے منصب کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے روانگی سے پہلے عبداللہ یوسف علی نے لندن کی لیوزک نامی اشاعتی ادارے سے ایک پروگرام طے کیا جس کے مطابق ''ترقی پسند اسلام'' پر پمفلٹوں کا ایک سلسلہ طبع ہونا تھا۔ اس سلسلہ کا پہلا کتابچہ اگست ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا جس کا نام ''وقت کی سب سے بڑی ضرورت'' تھا۔ دوسرا کتابچہ ان کے ایک لیکچر پر مشتمل تھا جس کا عنوان ''اسلام بحیثیت ایک عالمی قوت'' تھا۔ یہ لیکچر ایک سال قبل لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے سالگرہ والے اجلاس میں پیش کیا گیا تھا۔ اب اسلام کے سکالر کی حیثیت سے ان کی حیثیت نمایاں ہو رہی تھی۔ انہوں نے عظیم الشان ''انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' کے لیے بھی دو مضامین تحریر کیے ایک 'خوجہ' کی اصطلاح کی تشریح سے

Marfat.com

متعلق تھا جبکہ دوسرا انیسویں صدی کے ایک شیخ اور مرشد کرامت علی جونپوری کے بارے میں تھا۔ (۱۸) ثانی الذکر مضمون مصنف کی نظریاتی ترجیحات پر ہلکا سا پردہ ڈالتا ہے۔ شیخ کا تعلق ''تعینیہ'' فرقہ سے تھا جو 'طریقۂ محمدیہ' کی ایک شاخ تھی۔ وہ حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک کے مخالف تھے۔ نزاع اور اختلاف کا ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ آیا برطانوی ہند میں جمعہ اور عیدین کی نماز شرعاً ممکن ہے جن کو فرائضیوں نے غیر شرعی قرار دے دیا تھا۔

کرامت علی جونپوری کا خیال تھا کہ بنگال کو دارالحرب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اس لیے یہ اجتماعی نمازیں لازماً قائم ہونی چاہئیں۔ عبداللہ یوسف علی نے یہ ثابت کرنے کے لیے بڑی محنت کی تھی کہ شیخ وہابی نہیں تھے۔ اور اس طرح انہوں نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا کہ فرائضی تحریک ایک تشدّد پسند جماعت تھی۔ کرامت علی نے مضمون نویسی کے ایک انعامی مقابلے میں شرکت کی تھی۔ سر چارلس ٹریویلیان نے اس کے لیے انعام کی پیش کش کی تھی۔ مقابلہ بہترین اردو مضمون کے لیے تھا جس کا موضوع ''عربوں اور یونانیوں کے یورپ کی نشأۃ ثانیہ پر اثرات'' تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے موضوع کی توثیق کی تھی اور یہ نوٹ لکھا کہ ''گویا وہ ہندوستانی مولویوں کی اکثریت کے برعکس اسلام کے عالمی تناظر میں دوسرے وسیع تر مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے''۔ اور یہی امر بالخصوص عبداللہ یوسف علی کی خود اپنی ادبی اور علمی کاوشوں کا مرکز و محور تھا۔

عبداللہ یوسف علی کی شہرت، امتیاز اور روابط نے ان کو فوری طور پر پنجاب میں ایک اہم تر کردار ادا کرنے کے لیے سامنے لا کھڑا کیا۔ انہیں پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے جمعیت تنظیم کی صدارت بھی قبول کر لی۔ یہ جماعت صرف ایک سال قبل ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے بنائی تھی۔ اس کا خصوصی ہدف یہ تھا کہ پنجاب میں ہندومت کے احیا اور سنگھٹن کی عسکری تحریک کا مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ یوسف علی نے دسمبر ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ میں ہونے والی تنظیم کی کانفرنس سے خطاب کیا اور بڑے لطیف پیرائے میں یہ

اشارے دیے کہ انہیں ہندوستانی امور میں اس سے کہیں بڑھ کر کردار ادا کرنا ہے جتنا وہ پنجاب کی ایجوکیشن سروس میں رہ کر کر سکتے ہیں۔ انہیں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں پر بھروسا نہیں تھا کہ وہ منظم ترقی کی ضمانت فراہم کر سکیں گی۔ ان کو تنظیم کی وساطت سے نئے مواقع نظر آ رہے تھے۔

''اس تنظیم کی اساس چند افراد یا ایک محدود طبقے کے خیالات اور احساسات پر نہیں رکھی گئی ہے۔ اور نہ اس کے کوئی فرقہ ورانہ نظریات اور منصوبے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان مرکز گریز انتشار پیدا کرنے والی قوتوں پر گرفت مضبوط کی جائے جو مصروف عمل ہیں۔ نیز ان اداروں اور تنظیموں میں باہمی ربط واتحاد پیدا کیا جائے جو مختلف نظریات اور مقاصد کی حامل ہیں۔ اس کا مقصد قوم اور ملک کی خدمت کرنا ہے اور یہ مقصد سامنے رکھنا ہے کہ ہمیں دوسری تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے، ان کی مخالفت یا بائیکاٹ نہیں کرنا ہے۔ ہماری جماعت خلافت تحریک کی گود میں پیدا ہوئی ہے اس لیے دونوں تحریکوں میں کوئی رقابت یا مسابقت نہیں ہے اور نہ ہونا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے ہم بڑی ہوش مندی سے آگے بڑھیں تاکہ خلافت کے لوگ ہمیں اپنے رہنماؤں کا مخالف نہ سمجھیں اور مجھے بھی یقین ہے کہ ہم پورے اخلاص کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں''۔ (۱۹)

عبداللہ یوسف علی نے اس تحریک کے کام کے سلسلے میں اپنی طلاقت لسانی کا مزید مظاہرہ نہیں کیا۔ تحریک خلافت کے لوگوں کو صلح وآشتی کا پیغام ایک ایسے وقت دیا گیا تھا جب ڈاکٹر کچلو جو خلافت تحریک کے ایک سابق رہنما تھے محمد علی جوہر کے نزدیک طرفداری پر مبنی تنگ نظری کے مرتکب قرار دیے گئے تھے۔ (۲۰) تحریک خلافت کے علم برداروں کے پاؤں کے نیچے سے زمین اس وقت کھینچ لی گئی جب ۱۹۲۴ء میں خود ترکوں نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے پس پشت مصطفیٰ کمال پاشا کی قوت کا جبر تھا۔ گاندھی جی بھی صرف اچھے دنوں کے ساتھی ثابت ہوئے اور انہوں نے کئی اہم اور نازک مواقع پر علی برادران کا ساتھ چھوڑ

Marfat.com

دیا۔(۲۱)

اب تحریک خلافت والے اپنی سیاسی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے اور پنجاب میں ہی مسلم لیگ کی مرکزیت قائم کرنے کے لیے نئے گروپ تشکیل دیے جا رہے تھے۔ پنجاب کی مسلم لیگ برطانیا کی حامی یونینسٹ پارٹی کی سخت مخالف تھی۔ اگر ان کو نظر انداز کر دیے جانے کا احتمال ہوتا تو یہ لوگ اپنے ردعمل میں لازماً شدت کا مظاہرہ کرتے۔ چنانچہ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل کو بھی اس تنازع میں الجھنا پڑا۔

عبداللہ یوسف علی کو لیگ آف نیشنز میں اپنی سرگرمیوں کے حوالے سے اس تنازع میں فریق بن کر سامنے آنا پڑا۔ تحریک خلافت کے لوگ لیگ آف نیشنز سے اس لیے نفرت کرتے تھے کہ یہی تنظیم جزیرۃ العرب کے بٹوارے کی ذمہ دار تھی۔ لیگ آف نیشنز سراسر ایک داغ دار تنظیم تھی۔ اقبال نے اپنی ایک طنزیہ نظم میں لیگ آف نیشنز کو کفن چوروں کی تنظیم قرار دیا تھا جو قبرستان میں جمع ہوئے ہیں۔(۲۲)

لیگ اس لیے بھی مزید تکلیف دہ حقیقت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے بجٹ کے لیے ہندوستان کو ایک کثیر رقم اپنے حصے کے طور پر ادا کرنا پڑ رہی تھی۔ اس پر مستزاد یہ امر تھا کہ ہندوستان میں لیگ کی سرگرمیوں کے روحِ رواں سر ولیم برڈ وڈ تھے جو ایک برطانوی فوجی جرنیل اور گیلی پولی میں عثمانی ترکوں کے خلاف مہم کے کمان دار تھے۔

خلافت کے حامیوں کے برخلاف عبداللہ یوسف علی اور لاہور میں ان کے یونینسٹ حلقۂ احباب کے لوگ برڈ وڈ کی کارگزاری کے شدت سے حامی تھے۔ اخبار زمین دار نے جس کو تحریک خلافت کے ظفر علی خاں نکالتے تھے شیخ عبدالقادر پر اس وقت طنز و تعریض کے تیر برسائے تھے جب انہوں نے اور یوسف علی نے ۱۹۲۶ء کی فروری میں دہلی میں ہونے والی لیگ آف نیشنز یونین کے ایک اجلاس میں شرکت کی تھی۔ واضح رہے کہ شیخ عبدالقادر فضل حسین کی جگہ اب پنجاب

Marfat.com

کے وزیر تعلیم تھے۔اخبار نے لکھا:

''لیگ آف نیشنز فی الحقیقت مسلم دنیا کے خلاف ایک گہری سازش کا حصہ ہے اور ہم ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتے۔اگر لیگ ہندوستان میں کام شروع کرتی ہے تو ہم ہر طرح اور ہر قیمت پر اس کی مخالفت کریں گے اور اس جہاد میں پورا مسلم پریس ہماری حمایت کرے گا۔لاہور یونین کے ممبران اور عہدہ داروں کو اسلام کے لیے کچھ تو ہمدردی رکھنا چاہیے اور کم از کم اپنے اسلامی ناموں کا ہی کچھ خیال کرنا چاہیے۔شیخ عبدالقادر اور مسٹر یوسف علی حکومت کے ساتھ تعاون کر کے اپنے لیے عہدے اور مناصب حاصل کرنا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں لیکن ہم انہیں یہ اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ایسی تحریک میں شامل ہوں جس کا مقصد ہمارے مسلمان بھائیوں کی آزادی کو کچلنا ہے''۔(۲۳)

جب شیخ عبدالقادر کو ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے لیگ آف نیشنز کی کانفرنس میں شرکت کے لیے ۱۹۲۶ء میں جنیوا بھیجا گیا تو لاہور کے پریس نے ان پر اور زیادہ شدت سے تنقید کی۔(۲۴)

عبداللہ یوسف علی کا ردعمل دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہونے والی پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس میں سامنے آیا۔انہوں نے اس امر کا خاص اہتمام کیا کہ لیگ آف نیشنز کی تعریف کی جائے۔انہوں نے کہا تھا ''لیگ نے مختلف امور میں بین الاقوامی تعاون کا راستہ ہموار کیا ہے۔اور مادی طور پر بین الاقوامی تعاون کے جذبے کو فروغ دینے میں مدد فراہم کی ہے جس کے ذریعے قوموں کے درمیان توازن اور ہم آہنگی پیدا ہوئی ہے۔(۲۵) عبداللہ یوسف علی نے پوری صلاحیت اور عزم کے ساتھ اس تنازع میں حصہ لیا۔ان کے خطاب میں یونینسٹ پارٹی کے منشور کا بھرپور اظہار ہوا جس میں سلطنت برطانیہ سے تعلق برقرار رکھنے کی قدر و منزلت کا اعتراف موجود تھا۔(۲۶)

Marfat.com

اپنی محنت اور مشقت کی عادت کے مطابق ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیانی عرصے میں عبداللہ یوسف علی نے متعدد عوامی نوعیت کے کاموں میں شرکت کی اور ساتھ ہی اسلامیہ کالج کی پرنسپل شپ بھی جاری رہی۔ انہوں نے انڈین سائنس کانگریس کے چودھویں اجلاس کے یادگاری مجلّے ''پنجاب کی جھلکیاں'' کی ترتیب میں مدد دی۔ یہ کانگریس ۱۹۲۷ء میں لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ اس سال کے دوران انہوں نے طلبہ کے لیے ایک کتابچہ بعنوان ''ہندوستان آنے والے تین مسافر'' مرتب کی جس میں تین معروف بیرونی سیاحوں کے مشاہدات جمع کیے گئے تھے۔ یہ تین سیاح ہن سیانگ اور ابن بطوطہ کے علاوہ سترہویں صدی کے فرانسیسی سیاح فرینسیا وَ برنیئر تھے۔ عبداللہ یوسف علی نے میٹریکولیشن کی سطح کے طلبہ کے لیے ایک نصابی کتاب ''ہندوستان کی تاریخ کا خلاصہ'' شائع کی۔ وہ اس وقت شہر کے روشن ترین دماغوں میں سے نمایاں ترین شخص تھے جہاں پہلے ہی بڑے بڑے دانش وروں کی ایک پوری نسل آباد تھی۔ سید سلیمان ندوی نے شہر لاہور کے ایک سفر کے بعد ان دانش وروں کی ایک پوری فہرست پیش کر دی تھی: ''ادبی اور علمی اشخاص کے لیے لاہور اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں بہت بڑے بڑے صاحب صلاحیت لوگوں کا اجتماع موجود ہے، مثلاً یہاں ڈاکٹر سر محمد اقبال ہیں، شیخ عبدالقادر ہیں، پرنسپل عبداللہ یوسف علی ہیں، پروفیسر حافظ محمد شیرانی ہیں۔ پروفیسر اقبال، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر سراج الدین اظہر، مولوی محمد علی ایم۔ اے۔ خواجہ کمال الدین، پروفیسر سید عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں جیسے لوگ ہیں۔ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں بیک وقت اتنے بہت سے فضلا کا اجتماع نہیں ہے۔ اسی طرح پرانی نسل کے لوگوں میں سید ممتاز علی صاحب ہیں، منشی محبوب عالم ہیں اور مولوی انشاء اللہ خاں ہیں جن کی زندگی اگرچہ خزاں کے دور میں داخل ہو چکی ہے مگر وہ ہمارے ذہنوں میں موسم بہار کی یادیں تازہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مزاح نگاروں، مصنفوں اور شعرا کی بھی اس شہر میں کمی نہیں ہے ان میں عبدالمجید سالک ہیں، غلام رسول مہر ہیں، تاجور ہیں، حفیظ جالندھری

Marfat.com

ہیں، غلام ربانی ہیں اور محمد دین تاثیر ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے اہل قلم ہیں جو اپنے آپ کو منوانے کی کوشش میں مصروف ہیں اور مستقبل میں کامیابیاں ان کی منتظر ہیں''۔(۲۷)

انجمن حمایت اسلام میں یونینسٹ اور مسلم لیگیوں کے درمیان کشمکش فطری انداز سے اور لازمی طور پر بڑھتی جارہی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے پاس انجمن کے مناصب زیادہ تھے۔ باعث نزاع مسئلہ عبداللہ یوسف علی کا اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے عہدے پر برقرار رہنا تھا۔ انجمن کے جلسوں کی کارروائی کا ریکارڈ اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ بارہا انتہائی تلخ وتند گفتگو و بحث مباحثہ کے مواقع پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹ جون ۱۹۲۷ء کو یہ سوال اٹھایا گیا کہ آخر عبداللہ یوسف علی تدریسی کام کیوں نہیں کرتے ہیں۔ چند مہینوں کے بعد ایک اور ممبر نے معلوم کرنا چاہا کہ موسم گرما کے دوران میں عبداللہ یوسف علی پرنسپل صبح ۷ کے بجائے ۱۰ بجے دفتر کیوں آتے ہیں۔ (۲۸) تعلقات کار میں خرابی اور انحطاط پیدا ہو رہا تھا، جس کے بعد کالج کمیٹی کی ایک خصوصی میٹنگ اکتوبر کے مہینے میں طلب کی گئی۔ عبداللہ یوسف علی نے شکوہ کیا کہ ان کی غیر موجودگی میں انجمن کی کمیٹی کے اجلاسوں میں ان کی ذات پر کیچڑ اچھالی جاتی رہی ہے، اس لیے اسلامیہ کالج سے متعلق امور ان کی غیر موجودگی میں زیر بحث نہ لائے جائیں۔ یہ گویا ایک طرح کا الٹی میٹم تھا جس کے بعد انہوں نے اسلامیہ کالج چھوڑ دیا اور اپنے مختلف علمی و تصنیفی کاموں میں منہمک ہو گئے۔ فروری ۱۹۲۸ء تک انہوں نے اپنی مرتب کردہ اور کثرت سے استعمال میں آنے والی قانونی حوالے کی کتاب ولسنز اینگلو محمڈن لا کے چھٹے ایڈیشن پر کام ختم کر دیا تھا۔ اس کتاب کے تمام سابقہ ایڈیشن بھی ان کے ہی مرتب کردہ تھے۔ اس کے ایک ماہ بعد عبداللہ یوسف علی الہ آباد پہنچے اور اردو میں لیکچروں کا ایک سلسلہ مکمل کیا۔ یہ خطبات مشہور و معروف ہندوستانی اکیڈمی میں دیے گئے اور ان کا موضوع ''قرون وسطیٰ کے ہندوستان کے سماجی اور معاشی حالات'' تھا۔ اس عرصے میں ان کا تقرر علی گڑھ یونیورسٹی کی کورٹ کے ممبر کی حیثیت سے بھی ہو گیا تھا۔

Marfat.com

اس موسم بہار میں وہ اپنے سابقہ راستے سے ہٹ کر بغداد اور کربلا ہوتے ہوئے عازم سفر ہوئے اور انہوں نے 'المسیب' نامی کشتیوں کے پل سے دریائے فرات عبور کیا۔ انہوں نے اس کا حال بڑے خوب صورت انداز میں لکھا، وہ لکھتے ہیں:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے بغداد سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جو دریائے فرات سے سیراب ہوتا ہے میں نے ''المسیب'' کے مقام پر کشتیوں سے بنے ہوئے پل کے ذریعے دریا پار کیا۔ یہ اپریل کی ایک خوب صورت صبح تھی اور میں گزشتہ صدیوں کے واقعات و حوادث کے بارے میں سوچ میں غرق تھا۔ دریائے فرات کے بائیں طرف قدیم شہر 'بابل' کے کھنڈرات تھے۔ ماضی میں یہ آثار صحرا کی ریت میں مدفون تھے۔ اب ان کے ذریعے عہد قدیم کی عظمتوں اور تابناکیوں کا اظہار ہوا ہے۔ فرات اپنی نوعیت کا بڑا منفرد دریا ہے اس کا منبع مشرقی آرمینا کے پہاڑوں میں بہت سے چشموں میں ہے۔ پھر یہ لہراتا بل کھاتا پتھریلے میدانوں سے گزرتا ہوا صحرا کے کنارے کنارے آگے بڑھتا ہے اور بہت سی چھوٹی ندیوں، نالوں اور نہروں کے ذریعے سارے علاقے کو سیراب کرتا ہے جہاں پھلوں اور سبزیوں اور دوسری زرعی پیداوار کی کثرت سے زمین کو مالا مال کر دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ دلدلی علاقے میں آ جاتا ہے۔ یہاں پر وہ جھیلیں ہیں جو کربلائے معلیٰ سے قریب ہی دریا سے مل گئی ہیں ان جھیلوں کو ذخیرہ ہائے آب کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے آگے یہ دریائے دجلہ میں مل جاتا ہے جس جگہ دونوں دریا ملتے ہیں اسے 'شط العرب' کہتے ہیں اور یہاں پر ہی یہ خلیج فارس میں سمندر میں جا گرتا ہے۔

پانی کی بہتات کے باوجود خطے میں 'پیاس' ہمیشہ ہی ایک آزمائش ثابت ہوئی ہے۔ فرات کے نشیبی میدانوں میں وسیع و عریض باغات زمانۂ قدیم سے پائے جاتے ہیں۔ یہ جگہ قدیم تہذیبوں کا گہوارا رہی ہے۔ حمیری عرب یہاں ہی ملتے تھے۔ اور عربوں اور ایرانیوں کے روابط بھی اسی علاقے میں قائم ہوئے۔ یہ خطہ انتہائی سرسبز و شاداب اور زرخیز ہے۔ کھجوریں اور انار کثرت

سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھلوں کی کثرت سے پورے پورے شہروں کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ عرب بدو اپنے ریوڑ لے کر میدانوں میں آتے ہیں۔ یہ دیکھ کر بڑا دکھ اور الم محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسی سرزمین پر جہاں پانی کی افراط سے دستیابی عام بات ہے حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں نے پیاس کے عالم میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ چاروں طرف پانی کو دیکھ کر اور صحرا کے اس ماحول کو محسوس کر کے حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ آپ کے شعور و حواس کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

کربلا شریف پہنچ کر میرے جذبات کی شدت اپنے عروج کو پہنچ گئی اور میں اپنے ہی جذبات سے مغلوب ہو کر رہ گیا۔ صبح سویرے کی دھوپ اور سورج کی شعائیں امام حسین کے مزار کے گنبد کو ایک عجیب حسن اور دل آویزی عطا کر رہی تھیں۔ کربلا صحرا میں ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں سے اکثر قافلے گزرتے ہیں۔ کوفہ جو خلافت کا دارالحکومت تھا آج دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ حضرت علیؓ کی آرام گاہ شہر نجف میں ہے۔ نجف کی تجارتی اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ کربلا صحرا میں واقع ہے اور ایک قابل احترام زیارت گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ایک تجارتی اہمیت ابھی تک باقی ہے۔ یہ صحرا کی ایک بندرگاہ ہے، ٹھیک اس طرح جیسے بصرہ خلیج فارس کی بندرگاہ ہے۔ کربلا اور بصرہ دونوں شہری تجارت کے مراکز ہیں۔ ساری دنیا سے یہاں مال واسباب پورے سال پہنچتا رہتا ہے وہ سڑک جو مزار شریف کو جاتی ہے اپنی شان اور اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے لاثانی ہے۔ مزار کی چھت رنگین ہے۔ جس کی اندرونی اور بالائی دیواریں شیشہ گری کے کام سے مزین ہیں۔ روشنی ان شیشوں پر پڑتی ہے اور جھلملاتی ہوئی ہرطرف منعکس ہوتی نظر آتی ہے۔ زیارت گاہ کے دروازے مقفل رہتے ہیں۔ انسان یہاں پہنچ کر بے حد روحانی لذت اور ترفع محسوس کرتا ہے۔ مزار شریف کی دیواریں بہت بلند نہیں ہیں۔ امام حسین کے مقبرے کے اندر نیچے ایک تہہ خانہ ہے اصل قبر اس تہہ خانہ میں واقع ہے۔ اور یہی وہ

Marfat.com

جگہ ہے جہاں امام حسینؓ کو شہید کیا گیا تھا۔ یہاں سے چالیس میل دور نجف کا متبرک شہر ہے جہاں حضرت علیؓ کا مقبرہ واقع ہے۔ یہ جگہ قدرے بلندی پر ہے جس کا نتیجہ ہے کہ سبز گنبد میلوں دور سے نظر آتا ہے اور یہ منظر ہر سمت سے آنے پر سامنے ہوتا ہے۔ کوفہ نجف سے چار میل کے فاصلے پر ہے اور آج کل غیر آباد ہے۔ ایک ٹرام گاڑی نجف سے کوفہ جاتی ہے جہاں ایک شان دار جامع مسجد ہے لیکن ویران ہے۔ اس کا گنبد نیلے رنگ کا ہے اور محراب بہت خوب صورت رنگوں سے بنائی گئی ہے جو اس کے ماضی کے شکوہ کی گواہی دیتی ہے''۔ (۲۹)

عبداللہ یوسف علی کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا کہ وہ ٹھیک اور مناسب وقت پر صحیح اور مفید مطلب آدمی کو پہچان کر اس سے تعلق پیدا کر لیتے تھے۔ چنانچہ اپنی اس صلاحیت کی بدولت ان کو بغداد کے شاہی محل سے شاہ عراق سے ملاقات کے لیے حاضر ہونے کی دعوت موصول ہو گئی۔ عبداللہ یوسف علی نے اس کا پس منظر بتاتے ہوئے شاید غیر شعوری طور پر یہ فقرہ لکھ ڈالا ہے، جو شاہ فیصل کی شخصیت کا پورا احاطہ نہیں کرتا۔ وہ لکھتے ہیں: ''انہیں (شاہ فیصل کو) برطانیا سے تعلق کی اہمیت اور قدر و قیمت پر حد درجہ یقین تھا۔ تعلیم کے مسئلے میں انہیں گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے مجھے جو سہولتیں فراہم کیں اُن کی مدد سے ہی میں ان کے نظام تعلیم کا مطالعہ کر سکنے کے قابل ہو سکا جو ابھی بالکل ابتدائی مدارج اور حالت میں تھا''۔ (۳۰) اس سے یہاں اشارہ ملتا ہے کہ عبداللہ یوسف علی کا یہ سفر غالباً کسی ایسی کارروائی کا حصہ تھا جس کا مقصد معلومات کا حصول اور اس کی جمع و تدوین تھا۔ اس سفر کے دوران میں انہوں نے ترکی کا بھی سفر کیا جہاں انہیں مصطفیٰ کمال کو بھی ایک نظر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ان کا تأثر محتاط انداز میں تعریف کا تھا، وہ لکھتے ہیں: ''وہ غلطیوں سے مبرا نہیں ہیں۔ ان کی بعض اصلاحات سے انتہائی شدت پسندانہ قوم پرستی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن بہر حال انہوں نے اپنی قوم کو فنا ہونے سے نہ صرف بچایا بلکہ ان کی آزادی اور استقلال کی حفاظت بھی کی ہے۔ انہوں نے اپنی قوم اور ملک کو صدیوں سے لاحق لاتعداد برائیوں اور غلط رسم و

Marfat.com

رواج سے بھی نجات دلائی اور ان عناصر کا قلع قمع کیا جو ملک کی جدید خطوط پر ترقی کی راہ میں حائل تھے۔انہوں نے ماضی کی روایات کا لحاظ کیے بغیر نئے اداروں کی داغ بیل ڈالی''۔(۳۱)

عبداللہ یوسف علی اور ہندوستان کی معروف انگریزی شاعرہ اور سیاست دان سروجنی نائیڈو ہی دو ایسے اشخاص تھے جن کو اس قسم کے تعلیمی سفر پر برطانوی ہندوستان کے ثقافتی سفیروں کی حیثیت سے کسی دوسرے ملک جانے کا اتفاق ہوا۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک عبداللہ یوسف علی نے ہندوستان میں کئی مختلف قسم کے کاموں میں ہاتھ ڈالا، کئی جگہ نئی ذمہ داریاں اور مناصب سنبھالے لیکن اکثر و بیشتر کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچے۔سب سے پہلے انہوں نے حیدر آباد میں وزیر محصولات کا قلم دان سنبھالا لیکن ایک سال کے عرصے کے دوران ہی میں اچانک استعفیٰ دے دیا۔اس کے بعد لکھنؤ میں وکالت کی اور بے دلی سے انتخابی سیاست میں بھی حصہ لیا۔البتہ لاہور کے چند سال کام کے حوالے سے کافی بہتر نتائج کے حامل تھے۔لیکن وہاں بھی جمیعت تنظیم کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے ان مواقع کو پوری طرح استعمال نہیں کیا جو ہندوستان میں سماجی اصلاحات کے کسی سنجیدہ کام کے لیے حاصل ہوسکتے تھے۔

انہیں اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے بھی بہت نمایاں کام کرنے کا موقع مل سکتا تھا لیکن وہ اپنے سیاسی نظریات پر سمجھوتہ کرنے کے قائل نہیں تھے۔بحیثیت ایک مصنف اور مقرر وہ بڑی مستقل مزاجی سے اپنے ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کو پیش کرتے رہتے تھے جس کے اعتبار سے اسلام ایک روشن خیال اور ترقی پسندانہ دین ہے جو سلطنت برطانیا کے مقاصد سے کہیں متعارض نہیں ہوتا ہے۔ان کی عمر اب ۵۵ سال کی ہو چکی تھی لیکن ان کا سب سے یادگار کام یا کارنامہ ابھی پردہ اخفا ہی میں تھا، جس کا ظہور ابھی باقی تھا۔

Marfat.com

حواشی باب چہارم

۱- دی ٹائمز۔ عبداللہ یوسف علی کے بارے میں تعزیتی نوٹ، ۱۵ دسمبر ۱۹۵۳ء ملاحظہ ہو: ''اسلامک کلچر'' حیدر آباد جلد (XX'VIII) عدد 1، ۱۹۵۴ء، جب وہ ریاست میں ریونیو ممبر تھے اس وقت ان کے سیکرٹری نواب فصیح جنگ ہوتے تھے۔

۲- مئی ۱۹۲۰ء میں نظام حیدر آباد نے تحریک خلافت کے جلسوں پر پابندی لگا دی تھی۔ انہوں نے وائسرائے چمسفورڈ کو اس حوالے سے لکھا تھا: ''میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کارروائیوں کو خاموشی سے دیکھتا رہوں جن کا اعلانیہ مقصد صرف برطانوی اقتدار اور حکومت کے خلاف رکاوٹیں کھڑی کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ہر قسم کے اختیار و اقتدار کو چیلنج کرنا نظر آتا ہے''۔ ملاحظہ ہو نیمی جر کی تالیف ''تحریک خلافت'' صفحہ ۸۹

۳- عبداللہ یوسف علی کی کتاب ''تاریخ ہند کے ازمنہ وسطیٰ میں معاشرتی اور اقتصادی حالات'' صفحہ ۱۷۔ یہ وہ لیکچر تھے جو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں ۲-۴ مارچ ۱۹۲۸ء کو دیے گئے اس کا اردو متن قائداعظم لائبریری لاہور میں دستیاب ہے۔ یہ ایڈیشن ۱۹۳۹ء کا طبع شدہ ہے۔

۴- واقعات کے اس بیان کے مطابق استعفے کا سبب یہ تھا کہ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کا اصرار تھا کہ نظام دہلی آ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ عبداللہ یوسف علی نے بحیثیت حیدر آباد کے ریجنٹ جنرل میر عثمان علی خاں کو اس کے برعکس مشورہ دیا اور کہا کہ وائسرائے محض حکومت کا نامزد کردہ شخص ہوتا ہے جبکہ نظام کی حیثیت بادشاہ کی ہے اس لیے وائسرائے کو نظام کی خدمت میں حاضری دینا چاہیے نہ یہ کہ اس کے برعکس

Marfat.com

معاملہ ہو۔ لیکن بہرحال وائسرائے کی بات ہی اونچی رہی اور نظام کو دہلی جا کر حاضری دینا پڑی۔ برطانیا نے انتقامی طور پر یوسف علی کا استعفیٰ آئی سی ایس سے دلوایا۔ اس نقطۂ نظر کے بیان کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو بیدار ملک کی کتاب: ''یاران مکتب، تحریک پاکستان اور اسلامیہ کالج، صفحہ ۱۸۹۔ اسی نوعیت کا زبانی احوال اس مصنف کو جنوری ۱۹۸۸ء میں مولانا اسماعیل احمد مینائی نے سنایا تھا جو ان دنوں حیدر آباد دکن میں مجسٹریٹ تھے۔

اس کہانی کے کئی اور بھی ایسے تانے بانے ہیں جو اصل واقعات سے مربوط نظر آتے ہیں لیکن کئی جگہ ان میں تضاد بھی ہے، مثلاً یہ تو حقیقت ہے کہ لارڈ ریڈنگ نے نظام کو دہلی طلب کرنے کا قدرے توہین آمیز حکم جاری کیا تھا لیکن یہ واقعہ ۱۹۲۱ء کا نہیں ہے بلکہ ۱۹۲۶ء کا ہے۔ حیدر آباد میں استعفے کا ایک واقعہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں ضرور پیش آیا۔ لیکن یہ استعفے سر علی امام کا تھا جو نظام کی ایگزیکٹو کونسل کے صدر نشین تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عبداللہ یوسف علی کے استعفے کی دلچسپ کہانی خاصی مقبول ہوئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں ایک ایسے مسلمان افسر کے اصولی موقف پر استقامت کی مثال سامنے آئی تھی جس میں اس نے اعلیٰ ترین سطح پر برطانوی انتظامیہ کا مقابلہ کیا تھا۔ اور یہ اس وقت ہوا تھا جب مسلمانوں کا عام رویہ خوشامد اور عاجزی کا تھا۔ ایسی مثالوں کی شدید ضرورت تھی جن کے ذریعے ان کا اعتماد اور وقار کچھ بلند محسوس ہو۔ چنانچہ عبداللہ یوسف علی اس پس منظر میں مسلمانوں کی جانب سے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے احترام نفس اور وقار کی علامت بنا دیے گئے۔

۵- ''دی ہولی قرآن، ٹیکسٹ، ٹرانسلیشن اینڈ کمنٹری'' (قرآن مجید، متن، ترجمہ اور

Marfat.com

تفسیر) تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء اس حصے میں جس کا عنوان ''قرآن پاک کے تراجم'' ہے، ایک حوالہ نواب حسین بلگرامی کا ملتا ہے۔ جون ۱۹۳۵ء کی قسط (دی ہولی قرآن۔ پہلا ایڈیشن) میں نواب سر امین جنگ بہادر کی زبردست تائیدی تحریر شامل ہے۔نواب نظامت جنگ نے عبداللہ یوسف علی کی تعریف وتوصیف میں ایک نظم 'اسلامک کلچر، جلد (XXVIII) شمارہ نمبر ا مطابق جنوری ۱۹۵۴ء میں شائع کی تھی۔

۶۔ راشد کی پیدائش اس ریکارڈ میں نہیں ہے جو جنرل رجسٹر آفس سمرسٹ ہاؤس، لندن میں موجود ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ راشد ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ یوسف علی کی وصیت یہ بتاتی ہے کہ راشد ۴/اگست ۱۹۴۳ء کو اکیس سال کا تھا۔ اس بنیاد پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ راشد کی پیدائش ۴/اگست ۱۹۲۲ ہوگی۔ جنگ عظیم دوم کے بعد راشد علی نے حیدرآباد میں پولیس کے محکمے میں خدمات انجام دی تھیں جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس کا تعلق شاہی ریاست سے تھا۔

۷۔ ستمبر ۱۹۲۲ء میں انہوں نے ایک پاور آف اٹارنی یا مختار نامہ ریورنڈ ارنسٹ فاسٹر کے نام لکھا تھا جس کا غالباً مقصد اپنی کم عمر فیملی ممبران کی دیکھ بھال کے اختیارات اپنی غیر موجودگی میں اُن کے سپرد کرنا تھا۔ اس مختار نامے کے الفاظ کچھ یوں تھے:

''میں یعنی جارج برائن فاسٹر، برینٹر میں جوڈیون کی کاؤنٹی میں ٹیوسٹاک کے قریب واقع برینٹر ہوٹل کا مالک ومختار ہے اس مختار نامے کا جائز مالک ہوں جو ستمبر کی ۱۵ تاریخ کو ۱۹۲۲ء میں ریورنڈ ارنسٹ فاسٹر کے دستخط اور مہر سے لکھا گیا ہے اور جس میں مجھے اس جائیداد کا مختار بنایا گیا ہے جو نمبر ۳ مینسل روڈ، ومبلڈن، سرے کی کاؤنٹی میں موجود ہے اور اس کے علاوہ بھی کچھ جائیداد اس میں موجود و مذکور ہے۔ اس تحریر کے

Marfat.com

ذریعے اس کا اقرار کرتا ہوں کہ اس دستاویز کو ضرورت پڑنے پر پیش کروں گا اور اس کی نقول فراہم کروں گا اور اس کی پوری حفاظت کروں گا۔ بطور گواہ آج اگست کے بارہویں روز ۱۹۲۸ء میں میں اس پر دستخط ثبت کرتا ہوں"۔

(اضافہ از مصنف) یہ دستاویز مکان نمبر ۳ مینسل روڈ، ومبلڈن کے مالکان کے پاس سے ملی تھی جو عبداللہ یوسف علی کا لندن میں آخری پتا تھا۔

۸- "بابر کی کہانی خود اس کی زبانی" دراصل اس مقالے کا عنوان تھا جو ۳۱ رمارچ ۱۹۲۳ء کو پڑھا گیا۔ یوسف علی نے سلطنت مغلیہ کے انحطاط اور زوال کی وضاحت بھی کی ہے: "اگر مغل حکمران بے روک ٹوک تعدد ازدواج سے پرہیز کر کے صرف اپنی عائلی زندگی کی تطہیر کر لیتے تو مغل ہندوستان کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی"۔

۹- یہ اقتباس اور بعد والے اقتباس یوسف علی کے اس صدارتی خطاب سے لیے گئے ہیں جو انہوں نے پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں ۱۹۲۳ء میں دیا تھا اور جس کا عنوان "مسلمانوں کے تعلیمی مقاصد" تھا۔

۱۰- اقبال نے بہت پہلے ۱۹۰۹ء میں لکھ دیا تھا "میرا خیال یہی رہا ہے کہ اس ملک سے مذہبی جھگڑے اور اختلافات ختم ہو جانے چاہییں۔ میں تو اپنی ذاتی زندگی میں اس اصول پر عمل پیرا بھی رہتا ہوں لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے اپنی علیحدہ قومی شناخت قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ایک مستحسن عمل ہوگا۔ ہندوستان کے لیے ایک مشترکہ مقصد اور قومیت کا خیال ایک خوب صورت اور شاعرانہ تصور تو ہو سکتا ہے لیکن قابل حصول اور قابل عمل نظر نہیں آتا"۔ ملاحظہ ہو راج موہن گاندھی کی کتاب "آٹھ شخصیتیں"، صفحہ ۵۴

۱۱- ملاحظہ ہو ''اقبال کے آخری دو سال'' مصنفہ عاشق حسین بٹالوی، صفحہ ۱۱۹-۱۱۸۔ فضل حسین نے بھی کیمبرج میں حصول تعلیم کے بعد انڈین سول سروس میں شامل ہونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

۱۲- ملاحظہ ہو ''دی ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ'' ۳ر دسمبر ۱۹۲۵ء۔ عبداللہ یوسف علی کا یہ عزم کہ وہ غیر متنازع رہیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس وقت کے ڈرامائی واقعات کو پردہ اخفا میں رکھنے کے لیے ان کو اپنی بات گھما پھرا کر اور نامکمل طور پر پیش کرنے کے لیے جتن کرنے پڑے، مثلاً ان کا یہ بیان ملاحظہ ہو ''جب لارڈ چمسفورڈ کی جگہ ۱۹۲۱ء میں لارڈ ریڈنگ نے وائسرائے کا منصب سنبھالا تو گاندھی کے اثرات اپنے عروج پر تھے۔ لارڈ ریڈنگ نے ان اثرات کے عوامل کا تجزیہ کیا اور اپنی مہارت اور صبر و ہمت سے تدریجاً گتھیوں کو سلجھا لیا۔ ۱۹۲۱ء میں محمد علی اور شوکت علی برادران کو مسلمان سپاہیوں کی وفاداریوں کو متاثر کرنے کے جرم میں دو سال قید کی سزا ہوئی۔ ۲۲-۱۹۲۱ء کے شدید موسم سرما میں پرنس آف ویلز کے دورے کے موقع پر کچھ ناخوش گوار واقعات ایسے رونما ہوئے جس سے دورے کے مقاصد متاثر ہوئے اور انگریزوں اور ہندوستان کے لوگوں میں قربت و اتحاد کا مطلوب مقصد حاصل نہ ہو سکا''۔ ملاحظہ ہو: ''ہندوستان کی تشکیل''، صفحہ ۲۹۸

۱۳- ''انڈیا اور یورپ''، صفحہ ۸۲

۱۴- ایضاً صفحہ ۹۷

۱۵- ۱۹۳۳ء میں ایک بار ان سے یہ دریافت کیا گیا کہ کیا انہوں نے کبھی انتخابات میں حصہ لینے کا تجربہ کیا ہے اور آیا کبھی صوبائی یا مرکزی قانون ساز اسمبلی کی نشست کے لیے

Marfat.com

مقابلہ کیا ہے۔ یوسف علی کا جواب تھا: ''میں نے فی الاصل کسی نشست کے لیے تو مقابلہ نہیں کیا ہے لیکن اس پورے عمل سے وابستہ ضرور رہا ہوں اور ایک مختصر سے عرصے کے لیے یو۔ پی میں خود امیدوار بھی رہا ہوں''۔

ملاحظہ ہو، آل انڈیا مسلم کانفرنس کے وفد کا جوائنٹ کمیٹی کے سامنے بیان، جس کو کے۔کے۔عزیز (K.K.Azaiz) نے آل انڈیا مسلم کانفرنس ۳۳-۱۹۲۸ء کے اپنے مرتب کردہ دستاویزی ریکارڈ کے صفحہ ۱۵۶ پر نقل کیا ہے۔

۱۶- ملاحظہ ہو ''فاران'' اکتوبر ۱۹۸۱ء (اسلامیہ کالج لاہور کا میگزین) اردو مقالہ از ایم صدیقی، کالج کی تاریخ کے بارے میں صفحہ ۱۳۷_۷۶

۱۷- ملاحظہ ہو ''نقوش- مکاتیب نمبر جلد ۲ صفحہ ۸۴۳، مراسلہ بنام صغریٰ ہمایوں مرزا صاحبہ مورخہ ۲/ جون ۱۹۲۵ء

عبداللہ یوسف علی کا اپنا پتا یہ تھا: ماراش، ۱۲/ گرینج روڈ۔ چیزوک، لنڈن ڈبلیو ۵۔ اس موسم گرما میں ان کے مہمانوں میں نواب زادہ نور اور ان کی بیگم اور ایک دوسری شخصیت مسٹر یاسین جو ہندوستانی ہائی کمیشن سے وابستہ تھے، شامل تھے۔

۱۸- 'خوجہ' کے بارے میں معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: ''دی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' جلد II مطبوعہ لیڈن، ۱۹۲۷ء، صفحہ ۹۶۰ تا ۹۶۲ اس میں آغا خاں کی ''مقدس ہستی'' کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کرامت علی کے بارے میں بھی اس جلد کے صفحہ ۷۵۲ تا ۷۵۴ میں تفصیل موجود ہے۔

۱۹- آل انڈیا تنظیم کانفرنس جو دسمبر ۱۹۲۵ء میں منعقد ہوئی تھی کے صدارتی خطبے کا اردو متن قائد اعظم لائبریری لاہور سے دستیاب ہوا۔

Marfat.com

۲۰۔ ایضاً، منالٹ صفحہ ۱۹۹ کچلو کو غلطی سے طبی ڈاکٹر بتایا گیا صفحہ ۸۳۔ وہ اصلاً ایک بیرسٹر تھے اور انہوں نے ڈاکٹریٹ جرمنی کی یونیورسٹی سے مقالہ پیش کر کے حاصل کی تھی۔

۲۱۔ علی برادران نے جو اعتماد گاندھی جی پر کیا تھا دو مواقع پر ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی۔ پہلی بار اس وقت جب ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے بغیر مشاورت کے خود ہی سول نافرمانی کی تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں تحریک کے بے شمار کارکن حکام کی گرفت میں آ گئے۔ دوسری بار ۱۹۲۴ء میں جب انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کے گھر میں جہاں وہ بطور مہمان مقیم تھے بھوک ہڑتال شروع کر دی جس کا مقصد ان ہندوؤں سے اظہار ہمدردی تھا جو کوہاٹ کے فرقہ ورانہ فسادات سے متاثر ہوئے تھے۔ اس موقع پر جو بیان انہوں نے جاری کیا اس نے صورت حال کو مزید خراب کر دیا: ''میرے ذہن میں اس بارے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے کہ جہاں کہیں بھی جھگڑا فساد ہوتا ہے زیادہ تر موقعوں پر ہندو اس میں دوسرے نمبر پر رہتا ہے۔ میرا اپنا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسلمان ایک جارحانہ مزاج رکھتے ہیں اور ہندو مقابلتاً بزدل ہیں۔ اور یہ تو حقیقت ہے ہی کہ جہاں بزدل ہوں وہاں بدقماش جارحیت پسند چڑھ دوڑتے ہیں''۔ اس سلسلے کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: جناب شریف المجاہد کا مقالہ بعنوان ''تحریک خلافت'' جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کی مطبوعہ کتاب ''محمد علی، لائف اینڈ ورک'' ۱۹۲۸ء میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ راج موہن گاندھی کا مضمون محمد علی پر ان کی تصنیف ''آٹھ شخصیتیں'' کے صفحہ ۱۱۱ پر دیکھیے۔

۲۲۔ اقبال کی فارسی اور اردو نظموں میں لیگ آف نیشنز پر ان کی رائے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔ یہ اقتباس فارسی متن سے ماخوذ ہے جو ''پیام مشرق''

Marfat.com

میں شامل ہے۔ ملاحظہ ہو: ''کلیات اقبال'' (فارسی) لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۳ صفحہ ۳۶۳ اُردو کا متن بھی اتنی ہی شدت سے نشتر زنی کی کیفیت کا حامل ہے۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ میرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

ملاحظہ ہو: ''جمعیت اقوام'' ضرب کلیم، کلیات اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز مطبوعہ ۱۹۷۳ء صفحہ ۶۱۸ یا مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن مطبوعہ ۱۹۹۰ء صفحہ ۶۶۸

۲۳- پی-پی' زمیندار' مورخہ ۵ر فروری ۱۹۲۶ء

۲۴- مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: ''خان بہادر شیخ عبدالقادر کا یہ فرض ہے کہ وہ لیگ آف نیشنز کی توجہ ان غیر انسانی مظالم کی طرف دلائیں جو فرانسیسیوں نے بالخصوص دمشق اور بالعموم شام کی تباہی میں روا رکھے۔ ان کو برطانیا کی اس فرعونیت کی پالیسی پر بھی اپنی آواز بلند کرنا چاہیے جو انگریزوں نے مصر میں اختیار کی ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے کہ لیگ کی توجہ اس امر کی جانب مبذول ہو کہ انگریزوں نے نجد کی وساطت سے حجاز کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ فی الوقت لیگ انگریزوں کی غلام ہے اور اس سے کسی بھی قسم کی مدد کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھر بھی اگر شیخ صاحب آواز اٹھاتے ہیں اور ایران ان کی تائید کرتا ہے تو دنیا کو مسلمانوں کی شکایتوں اور احساسات کا کچھ اندازہ ضرور ہو جائے گا''۔

Marfat.com

پی-پی لاہور، سیاست ۸ جولائی ۱۹۲۶ء

۲۵- ملاحظہ ہو اس اقتباس کے لیے دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہونے والی پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس کے ہسٹری اور سوکس کے شعبہ میں عبداللہ یوسف علی کا صدارتی خطاب، جس کی روداد پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں محفوظ ہے۔ یہ جذبات جن کا اظہار ہوا ہے ایسے ہی ہیں جو ایک سال قبل ''انڈیا اور یورپ'' نامی تصنیف میں ظاہر کیے گئے تھے: ''لیگ آف نیشنز اپنی تمام تر کمزوریوں اور غلطیوں کے باوجود جن کی تعداد خاصی زیادہ ہے بہر صورت اس صحیح سمت میں ہی آگے بڑھ رہی ہے جس کے ذریعے اقوام وملل عالم کو ایک پرچم تلے جمع کر کے سب کو اس مشترک یقین اور اعتماد کے ساتھ مجتمع کرنا ہے تاکہ انسانیت کی ترقی کے مقصد کو فروغ دیا جا سکے''۔

۲۶- ایضاً، عبداللہ یوسف علی کی سلطنت سے وفاداری کا دعویٰ پوری شدت سے اس میں مزید ظاہر ہوتا ہے:

''حکومت ہند سے بالا ہمارے لیے ایک شاہی ارتباط اور تعلق بھی ہے جس کی علامت برطانیا کا پرچم ہے جو برطانیا کی سلطنت کا بھی پرچم ہے۔ پرچم محض ایک علامت ہے۔ ہمارے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ایک علیحدہ منفرد قومی پرچم اختیار کریں اور ساتھ ہی شاہی بندھن کو بھی نہ فراموش کریں اور اس سے وابستگی قائم رکھیں۔ رابطے کی ڈور پر اگر زیادہ دباؤ ڈالا جائے گا تو غلطی آپ ہی کی ہوگی۔ یہ رابطے کی ڈور لچکدار ہے۔ میں برطانوی کردار سے زیادہ کسی اور کیریکٹر یا مزاج سے واقف نہیں جو سمجھوتہ نہ کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کر سکے۔ اور نہ کہیں اور ایسے ادارے ہیں جو برطانیا کے اداروں کی مانند مقامی ضرورتوں پر توجہ دیتے ہوں۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ

Marfat.com

ان کو سمجھیں اور ان سے ایسی ہم آہنگی پیدا کریں جو ان ضرورتوں سے مطابقت رکھتی ہو جو سلطنت برطانیا کے ساتھ مشترک رشتے کا تقاضا ہے''۔

۲۷- ایم-اے- چغتائی، ''اقبال کی صحبت میں'' صفحہ ۲۱۳-۲۱۲۔ مولانا سلیمان ندوی کا سفر اپریل ۱۹۲۷ء میں ہوا تھا۔

۲۸- اے-ایچ-آئی مجلد بابت ۳/اکتوبر ۱۹۲۶ تا ۲۲/دسمبر ۱۲۲۸ء

۲۹- ''مسجد'' اردو ہفت روزہ لاہور ۱۶/اپریل ۱۹۳۷ء (105) YA ترجمہ از مصنف

۳۰- تعزیتی نوٹ بابت ''شاہ فیصل'' دی ٹائمز ۱۱/ستمبر ۱۹۳۳ء، اس سے قبل تیسرے باب کے نوٹ نمبر ۳۳ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

۳۱- ''دی ایسٹرن ٹائمز'' لاہور، ۳/جون ۱۹۳۶ء عبداللہ یوسف علی کا مضمون ''مصطفیٰ کمال اتاترک''، جس میں انہوں نے ۱۹۲۸ء میں اپنے ترکی کے دورے کا حوالہ دیا ہے۔(YA4)

Marfat.com

باب پنجم

جنیوا سے لاہور

۱۸/اگست ۱۹۲۸ء کے روز عبداللہ یوسف علی کو سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا، لارڈ برکن ہیڈ کی جانب سے اپنی جائے قیام نمبر ۳۴، ووڈ سائیڈ، ومبلڈن ساؤتھ لندن کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ اس خط کے ذریعے انہیں اطلاع دی گئی تھی کہ جنیوا میں ہونے والی لیگ آف نیشنز کی آئندہ اسمبلی میں ان کو ہندوستان کا نمائندہ منتخب کیا گیا ہے۔[1] ہندوستان کی نمائندگی کرنے والے دوسرے ارکان میں جو افراد شامل تھے ان کے نام یہ تھے: ارل آف لٹن جو بنگال کے ایک سابقہ گورنر تھے۔ نواب آف پالن پور اور سر کرما ریڈی جو مدراس کی حکومت کے ایک سابق وزیر تھے۔ نواب صاحب اور ان کے معاونین ومصاحبین کی جماعت جنیوا کے شان دار ہوٹل کارلٹن میں ٹھہرے تھے جبکہ بقیہ ارکان کا قیام بیوریواج ہوٹل میں تھا۔

ہندوستان کے وفد کو یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ لیگ کے اخراجات کو کم کرنے کے لیے مناسب طریقے اختیار کرنے پر شدت سے زور ڈالا جائے۔ یہ مالیاتی ترجیح اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ یوسف علی کو اس وفد میں کیوں شامل کیا گیا تھا، حالانکہ وہ اس وقت ہندوستان کی مرکزی یا صوبائی حکومتوں میں کسی بھی سرکاری منصب پر فائز نہیں تھے۔ ان کے آئی۔ سی۔ ایس کے سابق افسر اعلیٰ لارڈ میسٹن لیگ کی مالیاتی نگرانی کی کمیٹی میں شامل تھے۔ غالباً ان کو کسی ایسے لائق شخص کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی جو ان پالیسیوں پر عمل درآمد کے سلسلے میں مؤثر کردار ادا کر سکے۔ لیگ میں لارڈ میسٹن کی موجودگی بذات خود حیرت کا باعث تھی۔ وہ اس کلیدی کمیٹی کے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۷ء تک ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے ممبر رہے اگرچہ ان کا ہندوستان

Marfat.com

سے براہ راست تعلق ۱۹۱۹ء میں ہی ختم ہو چکا تھا۔ (۲)

برطانیا اپنی نو آبادیات کو شامل کر کے لیگ کے بجٹ میں ایک بڑا حصہ دار تھا اور اس کے بدلے میں اس کو توقع تھی کہ اس کی پالیسی پر اثر انداز ہو سکے گا اور اس کے سکریٹریٹ کے مناصب میں اس کا حصہ معتد بہ ہوگا۔ ہندوستان کے لیے یہ صورت حال بڑی پُر پیچ، مضحکہ خیز اور الجھن کا باعث تھی کہ یہ لیگ کے بجٹ میں چھٹا سب سے بڑا حصہ دار تھا لیکن اسے مستقل نشست حاصل تھی اور نہ کوئی دیگر فوائد اسے اس کی رکنیت کے سبب حاصل ہو رہے تھے۔ لیگ کی اصل اور اہم طاقتوں کے درمیان گرما گرم بحث و مباحثہ ہوا تھا، بالخصوص اس وقت جب برطانیا اور سلطنت کے دوسرے نمائندے ان پروجیکٹس کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنے تھے جو دوسرے ممالک کی جانب سے پیش ہوئے۔ یہ رکاوٹیں بجٹ میں ضروری منظوری نہ دینے کے ذریعے ہوا کرتی تھیں۔ ایک مقام پر کارروائی اس قدر طوفانی نوعیت کی ہوگئی کہ سکریٹری جنرل نے استعفیٰ کی دھمکی دے ڈالی۔ عبداللہ یوسف علی کمیٹی نمبر ۲ کے ممبر تھے جس کا کام ٹیکنیکل آرگنائزیشن یعنی فنی نوعیت کے تنظیمی معاملات دیکھنا تھا۔ وہ کمیٹی ۴ کے بھی ممبر تھے جس کا کام مالیاتی سوالات سے نمٹنا تھا۔ سیاسی اعتبار سے حساس نوعیت کی کمیٹی جس کو مشرق وسطیٰ سے متعلق لیگ کو تفویض کیے گئے اختیارات سے سروکار تھا اس کے رکن ایک ہندو ممبر سر کرماریڈی تھے۔

ہندوستانی وفد نے عراق اور فلسطین کے بارے میں برطانیا کے ارادوں اور مقاصد کے حوالے سے مشکل سوالات نہیں اٹھائے۔ بلکہ پوری قوت اور مہارت سے صرف لیگ کے اخراجات پر اپنی توجہ مرکوز کیے رکھی۔ اِس گفتگو میں عبداللہ یوسف علی سب سے پیش پیش تھے۔ (۳) ہندوستانی وفد نے بوقت ضرورت اپنی تقریروں میں مالیاتی نگراں کمیٹی کی حمایت کرتے ہوئے بتکرار کہا کہ ''یہ لیگ کا وہ عضو یا ادارہ ہے جس کے پاس مؤثر اختیارات موجود ہیں

جسے وہ اپنا بجٹ کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے''۔ بعد میں عبداللہ یوسف علی کو وائیکاونٹ پیل جواب سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا تھے، کی جانب سے ایک خط بھی ملا جس میں انہیں اس کمیٹی میں شرکت اور ہندوستان کی نمائندگی کے انداز اور طریقے پر بڑے خوب صورت انداز میں مبارک باد دی گئی تھی۔ یوسف علی نے ہواز ہو (Who is Who) والوں کو بروقت اطلاع دینا مناسب سمجھا کہ ان کے نام کے اندراج میں موجود معلومات کو اپ ٹو ڈیٹ کر دیں۔

۱۹۲۸ء کے اواخر تک عبداللہ یوسف علی کا خاندان اس گھر سے چند سو گز دور، نمبر ۳ مینسل روڈ پر منتقل ہو گیا۔ یہ ایک تین منزلہ سرخ اینٹوں کا بنا ہوا جزوی طور پر علیحدہ مکان تھا اور اس سٹریٹ پر واقع تھا جس پر ایک سکول قائم تھا اور اس کا پیدل فاصلہ اسٹیشن اور کھلے میدان (Common) سے تقریباً برابر تھا۔ عبداللہ یوسف علی کو اس کی قیمت 1750 پونڈ ادا کرنی پڑی۔ راشد علی ابھی بچہ ہی تھا اور اس مکان میں عبداللہ یوسف علی کی جمع کردہ ان انتہائی قیمتی کتابوں کے لیے کافی جگہ تھی جو وہ پچھلے پچیس (۲۵) برسوں سے جمع کرتے رہے تھے۔ مکان کے پچھلے حصے میں ایک بڑا باغ تھا جس میں ٹینس کورٹ بھی موجود تھا جو ان کا ایک مرغوب کھیل تھا۔ اسی گارڈن میں ایک لکڑی کا ہٹ (Hut) بھی بعد میں بن گیا جس میں مزید کتابیں سٹور کر دی گئی تھیں۔ ۱۹۳۰ء تک عبداللہ یوسف علی کی لائبریری کی کتابیں تعداد میں اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ انہوں نے اپنی لائبریری کا علیحدہ سے پانچ سو پونڈ ادا کر کے انشورنس کروایا تھا۔

اسلامیہ کالج کی پرنسپل شپ، مشرق اقصیٰ کے تعلیمی دورے اور پھر اس پر مستزاد متعدد ہندوستانی تعلیمی کانفرنسوں کی صدارت اور علی گڑھ یونیورسٹی کے کورٹ کی رکنیت نے مل ملا کر ان کو ہندوستان پر گفتگو کا مجاز ماہر تعلیم بنا دیا تھا۔ جنیوا سے واپسی کے فوراً بعد ان کی اگلی سرکاری مصروفیت رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں تھی جس کی اکتوبر کی ایک میٹنگ میں انہوں نے ''ہندوستانی

Marfat.com

تعلیم - نیا نقطۂ نظر'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ جو''انیسویں صدی اور مابعد'' کے عنوان سے بعد میں شائع ہوا۔ اگست ۱۹۲۸ء میں سیّد امیر علی کے انتقال کے بعد شاید ہی کوئی دوسرا ایسا مسلمان ہو جو ذہنی تفوّق اور علمی صلاحیت و ذہانت کے اعتبار سے نمایاں ہو اور برطانیہ کے معاشرے میں بھی اتنا رسوخ رکھتا ہو۔ علم و فضل کی دنیا میں ان کا جو حصہ تھا اس کا مقابلہ امیر علی کے کام سے کیا جا سکتا تھا۔ ان کے نام سے نصف درجن کتابیں، اتنے ہی کتابچے، ایک درجن سے زیادہ فاضلانہ مقالے اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں شامل دو مضامین ریکارڈ پر آ چکے تھے۔

لندن میں مقیم مسلم کمیونٹی بڑی اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کے درمیان میں کس پایہ کا ممتاز سکالر موجود ہے۔ ۱۹۲۹ء کی عیدالاضحیٰ کے موقع پر مسلم کمیونٹی نے ان کو سیرت النبیؐ پر تقریر کرنے کی دعوت دی۔ ''پروگریسو اسلامک ایسوسی ایشن'' کے نام سے ایک تنظیم بھی مطالعہ و تحقیق اور بحث و گفتگو کے لیے ان کی ہی ہدایت پر قائم ہو گئی تھی۔ (۴)

جب پروگریسو اسلام کی اصطلاح ۱۹۲۳ء میں پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں استعمال کی گئی تھی تو اس کا مقصد اسلامی دانش و ذہانت کا احیا قرار دیا گیا تھا۔ (۵) مسلمانوں کے ادارے قریب المرگ اور ان کا اندازِ کار رازکار رفتہ ہو چکا تھا اور وقت کے تقاضوں اور چیلنج سے نمٹنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ عبداللہ یوسف علی کے لیے ''پروگریسو اسلام'' کی اصطلاح ایک کلیدی لفظ تھا جس میں شدت پسندی اور بت شکنی کا کوئی مفہوم پنہاں نہیں تھا بلکہ انتہائی نرم اور مناسب طریقے سے ایک ایسا پیغام دینا مقصود تھا جو اس عنوان سے ان کے کئی کتابوں میں پہنچایا گیا تھا اور جس کا سلسلہ ۱۹۲۵ء سے شروع ہو چکا تھا۔ ان کتابچوں کے نام یہ تھے: ''وقت کی عظیم ترین ضرورت''، ''اسلام بحیثیت ایک عالمی قوت''، ''اسلام کی بنیادی تعلیمات''، ''محمدؐ کی شخصیت''۔ وغیرہ۔ یہ تھا ان کا ذہنی پس منظر اور فکری مسافت کا نقشہ، جب انہوں نے اپنی زندگی

کی سب سے بڑی علمی وادبی کاوش یعنی قرآن کے پیغام کو پیش کرنے کے کام کا آغاز کیا۔

بعد میں ۱۹۲۹ء میں عبداللہ یوسف علی کو ایک اور طویل سلسلۂ سفر پر جانے کا موقع ملا۔ اس سفر میں انہیں امریکا، جزائر ہوائی، جاپان، چین، فلپائن، مشرق بعید کی آبنائے کے جزائر اور سیلون اور ہندوستان جانے کا موقع ملا۔(۶) دن میں وہ سلطنت برطانیا کے گن گاتے اور رات کے وقت خوشی کی خاطر سرانجام دیے جانے والے کام میں ذہن و دانش کی یکسوئی صرف کرتے۔ ''دی ہولی قرآن- متن، ترجمہ اور تفسیر'' کے دیباچے میں وہ ایک جگہ ذکر کرتے ہیں کہ کتاب کا مسودہ کس طرح ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہے اور ہر قسم کے ملکوں اور رنگا رنگ اور مختلف النوع اقوام کے درمیان سے گزرتا ہے۔(۷)

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان تین نہایت اہم مگر بے نتیجہ کانفرنسیں لندن میں منعقد ہوئیں جن کا مقصد ہندوستان میں دستوری اصلاحات پر بحث کرنا تھا۔ عبداللہ یوسف علی مسلمان وفود کے ممبر نہیں تھے مگر مہاراجہ بیکانیر جیسی قدآور شخصیت اور نظام حیدرآباد کے نمائندے اکبر حیدری سے ذاتی شناسائی کے سبب ہندوستان کے نوابوں اور شہزادوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ وہ واقعات اور کارگزاریوں کا بڑی توجہ سے مطالعہ کرتے رہے اور اگلے اٹھارہ مہینوں تک کسی بھی سفر پر ملک سے باہر نہیں گئے۔ ماسوا پیرس کے ایک مختصر سفر کے جو ستمبر ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ وہ وہاں پانچویں بین الاقوامی اخلاقی تعلیم کانفرنس میں ان دو افراد میں سے ایک تھے جن کو رابطے کے فرائض ادا کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔(۸)

پہلی گول میز کانفرنس کا اختتام ۲۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو ایک مایوس کن اعلان پر ہوا۔ ہندوستان میں سیاسی تشدد بڑھتا جا رہا تھا، کانگریس کے کارکن اس بات کا پختہ عزم کر چکے تھے کہ مسلمانوں کی آزاد اور غیر جانب دار آوازوں کو ڈرا دھمکا کر اپنی مہم میں شامل ہونے پر رضامند

کریں۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن نے جو بیشتر آئی۔ سی۔ ایس کے ریٹائرڈ افسران پر مشتمل تھی، کاکسٹن ہال لندن میں مئی کے مہینے میں ایک اجتماع منعقد کیا جس کا مقصد راؤنڈ ٹیبل اور اس کے بعد درپیش صورت حال پر غور وفکر کرنا تھا۔ اس کانفرنس کے خصوصی مقرر لارڈ زٹ لینڈ تھے جو مستقبل میں سیکریٹری آف سٹیٹ فار انڈیا مقرر ہونے والے تھے۔ عبداللہ یوسف علی نے بھی اس میں شرکت کی اور جو کچھ انہوں نے کہا وہ اگلے دن کے اخبار ''دی ٹائمز'' میں رپورٹ ہوا۔ عبداللہ یوسف علی نے کہا تھا کہ وہ ہندوستان کے لیے ایک نظم وضبط کے تابع ترقی کا خواب دیکھتے ہیں لیکن واقعات جس رخ پر جارہے ہیں اس پر وہ بہت بے چین ہیں۔ جب تک ہندوستان میں قانون سے تنفر کی کیفیت برقرار رہے گی، کانفرنس کی کامیابی محض کاغذ تک ہی محدود رہے گی۔ اور ایسا کوئی حل سامنے نہیں آسکتا جو پائیداری کا حامل ہو''۔ (۹)

جب ستمبر میں دوسری گول میز کانفرنس طلب کی گئی تو سیاست کے جگمگاتے ستارے جمع تھے جن میں گاندھی، جناح، اقبال، آغا خاں، میاں محمد شفیع اور شاہ نواز بھٹو قابل ذکر تھے۔ صرف جوہر نہیں تھے جو سابقہ کانفرنس کے دوران میں انتقال کر چکے تھے۔ (۱۰) وفد کے مسلم ارکان دور بیٹھے فضل حسین کے زیر اثر کارروائی میں شریک تھے جو اب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے دہلی میں رکن اور واقعات کے تناظر میں ایک حقیقی طاقت متصور ہوتے تھے۔ (۱۱) بڑی بحث اس بات پر تھی کہ آیا انتخابات عمومی حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہونے چاہییں یا ان کے لیے جداگانہ طرز انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ مسلم رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ جداگانہ طرز انتخاب اختیار کیا جائے جس کی مخالفت کانگریس نے کردی تھی، اور برطانیا کی لیبر پارٹی کے ہیرالڈ لاسکی جیسے دانش ور بھی جس کی مذمت میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے مسلمانوں پر یہ الزام لگایا کہ ان کا مذہبی جنون انتہائی تشویش ناک ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اللہ کے نام پر بڑی خوشی سے میرا گلا کاٹ ڈالیں گے''۔ (۱۲)
ہندوستانی وہابیت اور پین اسلامزم کے طعنے اب پرانے اور از کار رفتہ ہو چکے تھے اس لیے ایک نیا

Marfat.com

موقلم تلاش کیا گیا جس کے ذریعے مسلمانوں کی تصویر کے خدوخال مسخ کیے جا سکیں۔

اس وقت کے سیاسی مناقشوں کے حوالے سے عبداللہ یوسف علی کا ایک اور کارنامہ ہندوستان کی تاریخ کے مطالعہ پر ایک نئی کتاب کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ کتاب ''ہندوستان کے تمدن کی تاریخ'' ستمبر ۱۹۳۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ دراصل ہندوستان کے نمائندوں کے ان مطالبات کا ردعمل اور جواب تھا جو وہ ہندوستان کی وسیع تر آزادی کے لیے کر رہے تھے۔ اور اس کا خصوصی پس منظر اقبال کا وہ خطبہ اور اس پر مبنی قرارداد تھی جو انہوں نے ۱۹۳۰ء پیش کیا تھا اور جس میں سلطنت برطانیا کے اندر رہتے ہوئے یا اس سے علیحدہ ایک مسلم ریاست کا مطالبہ کیا تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے اس قسم کے مطالبے پر اصرار کو غیر مناسب قرار دیا اور اس کے برعکس اس بات کی پرزور وکالت کی کہ ''برطانوی ہند کی ثقافت کے ارتقا پر برطانوی خیالات کی چھاپ ہے جو ان لوگوں کے احتجاج سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو بظاہر بدیسی خیالات و افکار کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے نظر آتے ہیں۔''(۱۳) انہوں نے یونینسٹ اور سلطنت سے وفاداری کی روایت کو ہندوستانی سیاست کی مجموعی آرا میں ایک دانش ورانہ آواز اور ایک نقطۂ نظر مہیا کر دیا تھا۔

ہندوستان کے سیاسی معاملات میں عبداللہ یوسف علی کا کردار گو مرکزی نہیں تھا پھر بھی واضح طور پر نظر آنے والا تھا اور مخفی نہ تھا۔ اقبال نے ۱۹۳۱ء کے موسم سرما میں متعدد علمی اور ادبی جلسوں سے خطاب کیا تھا۔ ان میں سے ایک والڈورف ہوٹل میں بڑی پررونق دعوت بھی تھی جس میں عبداللہ یوسف علی بھی شریک ہوئے تھے۔(۱۴) ایک اور موقع پر انڈیا سوسائٹی نے ایک لیکچر کا اہتمام کیا جس میں اقبال کو اپنی شاعری اور فلسفہ پر گفتگو کرنی تھی۔ اس جلسے کی صدارت سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو کرنی تھی جو پہلے آئی سی ایس سے وابستہ رہ چکے تھے۔(۱۵) عبداللہ یوسف علی نے اس موقع پر اقبال کی نظم خود پڑھ کر سنائی اور اُن کے پیغام کی وضاحت کی۔ انہوں نے اقبال کا

Marfat.com

موازنہ فرانسیسی شاعر پال کلاڈل سے کیا کیوں کہ دونوں شاعروں کے ہاں یکساں مثالوں کا استعمال پایا جاتا ہے اور دونوں کے ہاں مذہبی احساس کی شدت بھی بڑی واضح ہے۔ انڈیا سوسائٹی کی اس تقریب کے دوسرے ہی دن اقبال لٹریری سوسائٹی کی جانب سے ایک تقریب ترتیب دی گئی۔ اس میں اقبال کے کیمرج کے استاذ ڈاکٹر نکلسن بھی تشریف لائے تھے۔ اس مجلس میں عبداللہ یوسف علی نے اقبال کی ''بانگ درا'' سے کچھ حصے پڑھ کر سنائے اور ان کا مقابلہ نطشے سے کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے جرمن فلاسفر کی طرح اپنی قوم میں دوبارہ زندگی کی روح پھونک دی ہے۔(۱۶) اگر چہ اقبال اور عبداللہ یوسف علی کے مابین سیاسی اعتبار سے بڑی وسیع خلیج حائل تھی لیکن دونوں نے انتہائی مہذب انداز سے باہمی دوستی کا تعلق برقرار رکھا تھا۔ یہی بات عبداللہ یوسف علی کے جناح سے تعلقات پر بھی صادق آتی ہے۔ دوسری گول میز کانفرنس کے التوا کے کچھ ہی عرصے بعد لندن یونیورسٹی میں ہندوستانی طلبہ کا ایک اجتماع ہوا تھا جس میں عبداللہ یوسف علی نے ''ہندوستانی یونیورسٹی کے تصور'' پر بات کی تھی۔ جناح نے اس اجتماع کے شرکا کے لیے لندن کے بہترین انڈین ریستوران ''ویرا سوامی'' میں ایک استقبالیہ دیا تھا۔(۱۷)

گول میز کانفرنس اس سے اگلے سال دوبارہ بلائی گئی اور انتخابی طریق کار اور مسلمانوں کو صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی کے لیے مناسب وزن مہیا کرنے کے بارے میں ایک قسم کا سمجھوتہ کر لیا گیا۔ اس وقت یوسف علی لندن میں نہیں تھے کہ اجلاس کی اختتامی کارروائی دیکھ سکتے۔ جس کا سبب یہ تھا کہ وہ نیشنل کونسل آف ایجوکیشن کی دعوت پر کناڈا کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جب جناح عارضی طور پر ہندوستان کی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے جس کی وجہ ایک تو وہ مایوسی تھی جو ہندو مسلم سیاست کے ایک بند گلی میں محصور ہو جانے سے پیدا ہو گئی تھی اور جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جناح کے دیرینہ مخالف لارڈ ولنگڈن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا تھا۔ جناح نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے

Marfat.com

اپنی ساری توجہ وکالت کی پریکٹس پر مرتکز کر دی جس میں وہ بہت کامیاب بھی رہے۔ وہ ۱۹۳۴ء میں کئی سال کے وقفہ کے بعد اس وقت ہندوستان آئے جب مسلم لیگ پر ان کی گرفت اور اختیار مضبوط نظر آنے لگے۔ عبداللہ یوسف علی ولنگڈن کو ایک بالکل دوسری طرح سے دیکھتے تھے اور وہ ۱۹۳۲ کے ستمبر تک ہندوستان واپس آ کر اپنی عوامی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے سندھ آزاد کانفرنس کی صدارت کی اور پھر لاہور واپس جا کر پنجاب یونیورسٹی کی انکوائری کمیٹی کے ممبر مقرر ہو گئے جو اکتوبر ۱۹۳۲ سے مارچ ۱۹۳۳ تک کام کرتی رہی۔

اس کمیٹی کو عام طور پر اینڈرسن کمیٹی بھی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے چیئرمین سر جیمس اینڈرسن تھے اور یہ کمیٹی یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی کے موقع پر بنائی گئی تھی تاکہ یونیورسٹی کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لے کر مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کی جا سکے۔ یونیورسٹی کی ایک سرکاری سطح پر مرتبہ تاریخ میں عبداللہ یوسف علی کی خدمات کا خصوصی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ تذکرہ متوقع طور پر ہندوستان کے تعلیمی نظام میں انگریزی زبان کو کامیابی کی ضمانت کے طور پر استعمال کرنے سے متعلق ہے۔ عبداللہ یوسف علی کے مطابق: ''تمام مقامی زبانیں انگریزی ادب کے مطالعہ اور تدریس سے انتہائی گہرائی میں جا کر متاثر ہوئی ہیں اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انگریزی صوبوں کے مابین اور بیرونی دنیا سے رابطے کی زبان ہے۔ بلاشبہ انگریزی کا استعمال وہ سب سے بڑا رابطہ ہے جو مختلف صوبوں اور قوموں کے ہندوستانیوں کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے۔ اس بندھن اور رابطے کے بغیر ہندوستان کے وفاق کا اتحاد محض ایک تصوراتی خواب و خیال ہی رہے گا''۔ (۱۸)

یہ وہ گہرے اور عمیق جذبات و احساسات تھے جس نے ان کے ذاتی علمی و ادبی اشغال اور کاوشوں کو پائیداری اور استقلال عطا کیا تھا اور جس کے نتیجے میں انہوں نے قرآن کے

پیغام کو انگریزی میں منتقل کر کے دنیا بھر کے لوگوں کے لیے سمجھنے کا وسیلہ بنایا۔ ان تمام مہینوں کے دوران وہ یقیناً قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر کے نوٹس کے مسودے اپنے ساتھ لیے ہوئے بحری جہاز کے طویل پرسکون سفر کو خوشی خوشی قبول کرتے رہے تا کہ اس دوران ان کو وہ مہلت اور فراغت میسر آجائے جس میں کوئی خلل ڈالنے والی چیز رکاوٹ کا سبب نہ بن سکے۔

اس دوران میں سب سے اہم عوامی نوعیت کی ذمہ داری جو عبداللہ یوسف علی کو سپرد کی گئی وہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں کلکتہ میں منعقدہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت تھی۔ یہ تنظیم ۱۹۲۸ء میں فضل حسین نے قائم کی تھی جس کا مقصد مسلم لیگ اور اس کے صدر جناح کے اثرات کو زائل کرنا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں یہ تنظیم ایک ایسا فورم بن گئی جسے مختلف قسم کے مسلمانوں کے سیاسی گروپ شکوک وشبہات اور رقابتوں کے زمانے میں باہمی رابطے کے لیے استعمال کرنے لگے تھے۔ (۱۹) مسلم کانفرنس کی ان کوششوں کو جو اس نے مسلمانوں کے اتحاد کے لیے کی تھیں سمجھنے کے لیے اس کے سابقہ صدور پر ایک نظر ڈالنا بہتر ہو گا جن میں آغا خاں، شوکت علی، جوہر اور اقبال کے نام آتے ہیں۔ یوسف علی بھی ہندوستانی مسلمان رہنماؤں کے ایک ممتاز گروہ میں شامل ہو گئے، اگرچہ ان کا انتخاب بڑا عجیب سا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں انتخابی سیاست کا کوئی تجربہ کبھی نہیں رہا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ رہنما جو زیادہ نمایاں اور ممتاز سمجھے جاتے تھے اس وقت لندن میں تیسری گول میز کانفرنس میں شریک تھے۔ فضل حسین کو وائسرائے کی کونسل میں شمولیت کی وجہ سے ایک ایسی امتیازی حیثیت حاصل تھی جہاں سے وہ کلکتہ میں ہونے والی کانفرنس کے معاملات، بالخصوص مالیاتی سہولت فراہم کرنے کے مسائل، کو آسانی سے کنٹرول کر سکتے تھے۔ اور اسی امر کا پورا امکان ہے کہ انہوں نے خود ہی اپنی مرضی کے صدر کو منتخب کرا لیا ہو۔ (۲۰)

عبداللہ یوسف علی نے غیبتوں، دشنام طرازیوں، شکووں، شکایتوں اور غیر اخلاقی جوڑ

Marfat.com

توڑ کا مشاہدہ ضرور کیا ہوگا لیکن ان کی سیاسی زندگی کے اشغال اور مذہبیات کے ایک سکالر کی حیثیت سے زندگی کا انداز اور اسلوب دو متوازی خطوط کی شکل میں چل رہے تھے اور یہ دونوں خطوط ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ تھے اور کہیں بھی ایک دوسرے کو کاٹ نہیں رہے تھے۔

جنوری ۱۹۳۳ء میں ان کا کتابچہ The Religious Polity of Islam شائع ہوا جو نظریاتی بحثوں کے اعتبار سے تو بھرپور تھا لیکن اس کے عملی پہلو کمزور تھے۔[۲۱] یہی وہ زمانہ تھا جب ملک کے اردو پریس نے انہیں ''علامہ'' کا لقب دیا۔[۲۲]

جون ۱۹۳۳ء میں عبداللہ یوسف علی لندن آئے جو غالباً ان کا چالیس سال میں بمبئی سے برطانیا کا ساتواں بحری سفر تھا۔ اس طویل فاصلے کے لیے ہوائی سفر کا آغاز ہونے میں ابھی پانچ چھ سال کا عرصہ باقی تھا۔ ان کے لندن پہنچنے کے چند روز بعد ایسٹ انڈین ایسوسی ایشن نے انہیں ''قرطاس ابیض پر ہندوستان کا ردعمل'' کے موضوع پر خطاب کی دعوت دی۔ جلسہ حسب معمول کاکسٹن ہال ہی میں منعقد ہوا جو ایسوسی ایشن کا مستقل مستقر تھا۔ انہوں نے خطاب میں ان ہندوستانی ساتھیوں پر توجہ رکھی جن کا خیال تھا کہ وائٹ پیپر میں خودمختار حکومت کے سلسلے میں کافی پیش رفت نظر آتی ہے۔ پنجاب کے یونینسٹ گروپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''وہ لوگ بھی جو عام طور پر حکومت کی تائید کرنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں اس رپورٹ سے خوش نہیں دکھائی دیتے اور اس کی اشاعت سے ان میں بھی مایوسی کا احساس پایا جاتا ہے۔ اس کی اشاعت کے وقت سے اب تک عوامی رائے میں کچھ سنجیدگی پیدا ضرور ہوئی ہے۔ معقول لوگ اب یہ سمجھتے جا رہے ہیں کہ جو تحفظات اور محفوظ اختیارات اس میں رکھے گئے ہیں ان کا اصل مقصد اور افادیت کیا ہے اور توقعات پوری نہ ہونے سے جو دھند پیدا ہوگئی تھی وہ اب خاصی چھٹ چکی ہے''۔[۲۳]

اب ہر ہر قدم پر ہندوستان کی رائے عامہ مکمل آزادی کے حق میں بدلتی جا رہی تھی۔ لیکن عبداللہ یوسف علی اُسی عزم وارادے سے حالت موجودہ کو برقرار رکھنے کے حق میں سعی کر رہے تھے۔ جو لوگ بے صبری سے اصلاحات اور تغیر کے لیے کوشاں تھے ان کو عبداللہ یوسف علی کا مشورہ تھا کہ ''آہستہ روی اختیار کی جائے اور ہر ہر قدم دیکھ بھال کر اٹھایا جائے''۔ (۲۴)

مسلم کانفرنس کی صدارت نے انؐ کے اوپر کئی مزید ذمہ داریوں کا بوجھ بھی لا ڈالا تھا۔ اگست ۱۹۳۳ء میں وہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کے ایک مشترکہ وفد میں شامل تھے، جسے ایک اعلیٰ اختیاراتی، جوائنٹ کمیٹی آن انڈین کانسٹی ٹیوشنل ریفارم کے اجلاس میں جو ماکوی آف لن لتھ گو کے زیر صدارت ہو رہا تھا، پیش ہونا تھا۔ اس کمیٹی نے عبداللہ یوسف علی اور ان کے چار ساتھیوں سے بڑی شدید جرح کی اور پانچ سو سے زائد سوالات پوچھے، جو اسلام میں عورتوں کے حقوق سے لے کر مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے مطالبے اور تعلیم اور ٹیکس کی پالیسی تک سارے موضوعات پر محیط تھے۔ (۲۵) وفد کے نفس ناطقہ یا ترجمان کی حیثیت سے عبداللہ یوسف علی نے ہی بیش تر سوالات کا جواب دیا۔ ہندو مندوبین نے جوائنٹ کمیٹی کی سماعت اور پیشی کے دوران میں مسلمانوں کے وفد کو نیچا دکھانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور خود عبداللہ یوسف علی اس پورے مرحلے سے نکلنے میں مکمل طور پر زخموں اور چوٹوں سے محفوظ نہیں رہ سکے تھے۔ (۲۶)

کمیٹی کی کارروائی کے دوران سر ریجنالڈ کریڈک نے جو جوائنٹ کمیٹی کے ایک ممبر تھے، عبداللہ یوسف علی سے سوال کیا کہ آیا کوئی ایسی تجویز بھی ہے جس میں بعض صوبوں کی فیڈریشن بنا کر پاکستان کا نام دیا جائے۔ عبداللہ یوسف علی نے جواب دیا کہ ''جہاں تک میری معلومات ہیں یہ صرف طالب علموں کی ایک سکیم ہے اور کوئی بھی ذمہ دار شخص اس کو پیش کرنے میں شامل نہیں ہے''۔ (۲۷) اس بیان میں کیمبرج میں موجود ہندوستان کے مسلمان طلبہ کے ایک چھوٹے سے

Marfat.com

گروپ کی طرف اشارہ تھا جنہوں نے ۱۹۳۲ء میں مسلمان صوبوں کی فیڈریشن کی تجویز دی تھی۔(۲۸) کریڈک نے اپنے سوال پر اصرار برقرار رکھتے ہوئے ظفر اللہ خاں سے جو کمیٹی کے ایک ممبر تھے یہ کہلوا دیا کہ پاکستان کی سکیم غیر عملی اور خواب وخیال کے قبیل کی چیز ہے۔ عبداللہ یوسف علی نے مختلف قوموں کے مابین قائم ہونے والے اتحاد واتفاق کی صورتوں پر پورے اعتماد کا اظہار کیا۔ انہوں نے مثال کے طور پر پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کو پیش کیا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں طبقوں کے زمین دار شامل تھے۔ انہوں نے کہا: ''میرے دوست چودھری چھوٹو رام ایک ایسی سیاسی جماعت کے لیڈر ہیں جس کے ممبران کی اکثریت مسلمان ہے''۔(۲۹)

جوائنٹ کمیٹی کی رپورٹ کے نتیجے میں ایک قرطاس ابیض سامنے آیا جو آخر کار ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی بنیاد بنا۔ اس میں صوبائی اور مرکزی قانون ساز اسمبلیوں کی تشکیل اور دوسری تجاویز تھیں جن کے ذریعے محدود اختیارات کی حامل ایک وفاقی ریاست قائم کرنا مقصود تھا۔ عبداللہ یوسف علی کے لیے سلطنتِ برطانیا سے تعلق کو قائم رکھنے کا اصول مطلق اہمیت کا حامل تھا جس کو کسی قیمت پر بھی متاثر نہیں ہونے دینا چاہیے تھا۔ انہوں نے ''دی ٹائمز'' کو ایک نوٹ تحریر کیا اور گول مول طریقے سے اس سکیم پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ انہوں نے لکھا کہ اب پالیسی الجھاؤ کا شکار ہوگئی ہے اور ان دنوں کے مقابلے میں جب ان کے والد کے دوست لِلّی جیسے لوگ ہندوستان کی انتظامیہ میں شامل تھے اب صورت حال بڑی تبدیل ہوگئی ہے اور الجھی بھی گئی ہے۔ اس نوٹ کے یہ فقرے ملاحظہ ہوں:

''سر فریڈرک لِلّی نے ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران اپنے منصب کی ذمہ داریوں کے ساتھ برطانوی اور ہندوستانی کمیونٹی کے مابین انتہائی اعلیٰ معیار کے سماجی روابط برقرار رکھے۔ ان کا مثالی نمونہ یہ ثابت کرتا ہے کہ پرانے مدرسۂ فکر کے حکام برطانوی انتظامی ضرورتوں

Marfat.com

اور مقاصد کو اپنی ذاتی شفقت اور خاص و عام کی زندگی میں براہ راست دلچسپی لے کر زیادہ بہتر طور پر پورا کر سکتے ہیں اور وہ کچھ حاصل کر سکتے ہیں جو قواعد وضوابط کی بھرمار اور نام ونمود کی خاطر کی جانے والی تقریروں اور کارروائیوں سے نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کے لوگوں کی زندگی سے متعلق گہری حقیقتوں کا جیسا ادراک اُنہیں تھا وہ حقیقت میں حیرت انگیز نظر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر طبقے کے لوگوں میں بے حد مقبول تھے۔ اگر مجھے ایک بات کہنے کی اجازت ہو جو ساری بات کا سر عنوان کہی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہوگی کہ آپ اپنے سارے سیاسی انتظام و انصرام کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کی اہمیت کو کم نہ کریں اور نہ اس عنصر کو فراموش کریں''۔ (۳۰)

عبداللہ یوسف علی کے جذبات ان پختہ کار روایتی قدامت پسند برطانوی سیاست دانوں کے حلقے کی مقبول سوچ سے مطابقت رکھتے تھے جن کا خیال تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کو آزادی نہیں چاہیے بلکہ وہ اس پوری شفقت اور رہنمائی کے متلاشی ہیں جو ان کو سماجی بہبود اور اقتصادی ترقی کی جانب رہنمائی فراہم کر سکے۔ ۳۵ء کے ایکٹ نے ۱۹۳۷ء میں انتخابات کے لیے ایک بنیاد فراہم کر دی تھی اگر چہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں ہی کے نزدیک یہ ان کے مطالبۂ خود مختاری کو پورا نہیں کرتا تھا اور دونوں جماعتوں نے اس پر اپنا عدم اطمینان ظاہر کر دیا تھا۔

عبداللہ یوسف علی نے ایک بار پھر سات سمندر پار کا سفر اختیار کیا اور ۱۹۳۴ء کے اوائل میں لاہور پہنچ گئے۔ اب ان کا قرآن کے ترجمے وتفسیر کا کام ایک متعین شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اور وہ اس کو اجزاء کی شکل میں شائع کرنے کا سوچنے لگے تھے۔ پہلے ایڈیشن کے دیباچے کے ایک حصے میں وہ اس کی اشاعت کا حال بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''لاہور شہر میں، میں نے اس کا ذکر چند ایسے نوجوانوں سے کیا جن کا مجھ سے محبت اور احترام کا تعلق تھا۔ انہوں نے اس کام کے لیے اپنی شدید خواہش اور جوش و جذبے کا اظہار کیا جس

Marfat.com

سے میں حیران رہ گیا۔ انہوں نے پورا کام ایک طرح سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی فوری اشاعت کا مطالبہ کر ڈالا۔ اگرچہ میرے پاس بہت سے حصے تو تیار شکل میں تھے لیکن کوئی سپارہ بھی مکمل شکل میں موجود نہیں تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں لاہور سے روانگی سے قبل کم از کم ایک پارہ ضرور مکمل کر ڈالوں۔ جادو کی سی برق رفتاری سے ناشر، کاتب، بلاک بنانے والے اور پریس کا انتظام کر لیا گیا۔ یہ سب لوگ طباعت کے پروگرام کو جلد از جلد شروع کرنے کے لیے بے چین نظر آتے تھے۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ ہر پارہ جو تیار ہو جائے اشاعت کے لیے دیتا جاؤں۔ اس طرح کہ درمیانی وقفہ تین ماہ سے زیادہ نہ ہونے پائے۔ جوں جوں کام آگے بڑھے گا مجھے امید ہے کہ رفتار کار میں اضافہ ہوتا جائے گا''۔ (۳۱)

یہ امر اتفاقیہ سے زیادہ ارادی ہی نظر آتا ہے کہ پہلے ایڈیشن کے دیباچے پر جو تاریخ درج ہے وہ ان کی ۶۲ ویں سالگرہ کا دن یعنی ۴ر اپریل ۱۹۳۴ء ہے۔ (۳۲) ان کے نوجوان دوستوں نے جو ناشر تلاش کیا تھا وہ کشمیری بازار لاہور کے شیخ محمد اشرف کے نام سے معروف تھا۔ جون میں ترجمہ و تفسیر کی پہلی قسط مارکیٹ میں فروخت کے لیے آ گئی جس کی قیمت ایک روپیہ تھی ۔ اس میں ہلکے نیلے رنگ کی چرمی جلد کے ساتھ بہترین طباعت اور کاغذ استعمال ہوا تھا۔ (۳۳) پشت پر بڑی خوبصورت اور ہنرمندانہ تحریر تھی جس میں اس پوری سکیم کے فروغ میں تعاون کی اپیل درج تھی۔ یہ اپیل اتوار کے عبادت والے دن دیے جانے والے کسی خشک اور غیر دلچسپ وعظ و نصیحت کی طرح کی نہیں ہے بلکہ ایک ادبی شہ پارہ ہے۔ اس میں کسی قسم کے فرقہ ورانہ خیالات تشریح و تفسیر کے مابین کہیں نہیں ملیں گے۔ کتاب میں شامل عربی متن کو تصویری بلاکوں کے ذریعے انتہائی اعلیٰ درجے کے چکنے کاغذ پر صاف خوش خط انداز میں کتابت کرایا گیا تھا اور اس کی مجموعی وضع و شکل آنکھوں کے لیے خوش گوار تھی۔ قارئین کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ آئندہ آنے والی جلدوں کے اپنے آرڈر بذریعہ ڈاک بھیج دیں۔ ۱۹۳۴ء کے دوران عبداللہ یوسف علی نے تفسیر کی دو مزید

Marfat.com

قسطیں تیار کر کے اشاعت وطباعت کے لیے بھیج دیں۔

محمد اقبال اس وقت انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ اسلامیہ کالج لاہور میں، جہاں اب طلبہ کی تعداد سات سو تک پہنچ گئی تھی، بہترین تدریسی عملے کی فراہمی ممکن بنائی جائے۔ اسلامیہ کالج میں اب اعلیٰ ثانوی درجے کی تعلیم یعنی انٹرمیڈیٹ کے ساتھ ساتھ مختلف شعبوں میں بی۔اے، بی۔ایس۔سی اور ایم۔اے کی ڈگریوں کے لیے بھی تعلیم دی جا رہی تھی۔ اس لیے اقبال حقیقی صلاحیت کے حامل افراد کی تلاش میں دور تک نظر دوڑا رہے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۴ء میں محمد اسد کو فقہ پڑھانے کے لیے کالج میں منصب سنبھالنے کی پیش کش کی۔(۴۴) ایک اچھے پرنسپل کی تلاش بھی ضروری تھی۔ اقبال اس وقت علیل تھے اور انجمن کے اجلاس میں حاضر ہونا ممکن نہیں تھا لیکن انہوں نے ایک نوٹ میٹنگ میں شریک اصحاب کے ملاحظہ کے لیے ارسال کیا تھا جو یہ تھا:

''اگر مسٹر عبداللہ یوسف علی اس اعلیٰ منصب پر واپس آنے کے لیے رضامند ہو جاتے ہیں تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی واپسی کی امید رکھنا مشکل ہے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں کسی مسلمان پرنسپل کا ملنا مشکل ہے۔ ہمیں ایک ایسے پرنسپل کی ضرورت ہے جو نہ صرف صاحب علم وفضل ہو بلکہ وسیع اثرات اور روابط کا بھی حامل ہو جس کو مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں سے ہمدردانہ وابستگی بھی ہو اور جو ہمارے بچوں کو مستقبل میں پیش آنے والی سیاسی صورت حال کے تقاضوں کے اعتبار سے تمام میدانوں میں تربیت دے سکے۔

''مستقبل کی قومی زندگی کے لیے یہ انتہائی ضروری امر ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمان خوش قسمتی سے ایسے کسی شخص کو تلاش کر لیتے ہیں تو یہ ایک انتہائی اہم ضرورت کی تکمیل ہو گی۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے۔ اس لیے

Marfat.com

حکمت کے اس اصول کے مطابق کہ 'علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے' میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہمیں اپنی تلاش میں تامل یا تردد ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ فنی اعتبار سے یہ حدیث ضعیف ہو سکتی ہے مگر عملی انطباق کے اعتبار سے اس کی موزونیت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ ہمیں مشرق و مغرب میں اپنی ضرورت کے مطابق کسی مناسب شخص کی تلاش جاری رکھنا چاہیے۔ یاد رہے کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ آخری فیصلہ آپ لوگوں کو ہی کرنا ہے''۔ (۳۵)

اگرچہ اقبال نے یوسف علی کی اسلامیہ کالج میں واپسی کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کر دیا تھا لیکن یہ وقوع پذیر بہر صورت ہوا۔

مارچ ۱۹۳۵ء میں ترجمہ و تفسیر کی چوتھی جلد طبع ہوئی۔ عبداللہ یوسف علی نے اس دوران میں حج بیت اللہ کا فریضہ بھی ادا کر لیا اور وہ واپس لاہور آ گئے۔ اب ان کے لیے یہ بات اہم تھی کہ وہ اپنے طابع اور ناشر سے قریب ہی رہیں۔ غالباً اسلامیہ کالج کے بارے میں ابھی وہ فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ اس لیے انہوں نے انگریزی اخبار روزنامہ ''ایسٹرن ٹائمز'' کی ادارت سنبھال لی۔ (۳۶) چالیس صفحات پر مشتمل ترجمہ و تفسیر کی ہر نئی قسط کو زبردست کامیابی اور مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد تعریف و توصیف پر مشتمل تبصرے اس کے اندرونی ٹائٹل کے علاوہ پہلے اور آخری صفحوں پر درج ہونے لگے۔ چوتھی قسط میں جو تبصرے شامل تھے وہ لاہور کے مقامی اخبارات مثلاً ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' اور ''ایسٹرن ٹائمز'' میں شائع ہوئے تھے۔ کچھ دور دراز کے اخبارات مثلاً ''بمبئی کرانیکل'' اور کلکتہ کے ''اسٹار آف انڈیا'' سے بھی لیے گئے تھے۔ ایک ممتاز عالم سید سلیمان ندوی نے بھی اس کام کی تائید و توثیق کی۔

۱۴ر اپریل ۱۹۳۵ء کو اقبال کے پاس بہت سے معزز مہمان ملنے تشریف لائے جس

Marfat.com

میں مسز سروجنی نائیڈو بھی شامل تھیں۔ مسز نائیڈو کے بعد یوسف علی اور انجمن حمایت اسلام کے لوگوں کا ایک گروپ آیا جس سے علامہ کی طویل گفتگو ہوئی۔ (۳۷) ایک اعتبار سے بڑی سخت اور مشکل سودے بازی کی سی شکل پیدا ہوگئی جس کے نتیجے میں عبداللہ یوسف علی نے اس امر کی یقین دہانی حاصل کرنا چاہی کہ ایسے مسائل اور مشکلات ان کی راہ میں پیدا نہیں کی جائیں گی جیسی کہ ان کے سابقہ دور میں پیش آئی تھیں۔ اس سے اگلے دن کونسل کی میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا کہ یوسف علی کا تقرر ۱۳۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ پر کیا جاتا ہے۔ (۳۸) یہ رقم محمد اسد کو دی جانے والی ۲۵۰ روپے ماہانہ کی رقم (جو چھ ماہ کی آزمائشی مدت کے بعد ۳۰۰ روپے ماہانہ کی جانی تھی) کے مقابلے میں بڑی شاہانہ ہی کہی جا سکتی ہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد اقبال اور عبداللہ یوسف علی کی شناسائی بہت قریبی دوستی میں تبدیل ہو کر خوش گوار اور پائیدار ہوتی چلی گئی۔ دونون کے مابین ایک باہمی احترام کا رشتہ بھی تھا۔ عبداللہ یوسف علی اقبال کی شاعرانہ عظمت و عبقریت کے معترف تھے تو اقبال یوسف علی کی وسعت علمی کی قدر کرتے تھے۔ لیکن سیاسی نقطہ ہائے نظر میں دونوں کے درمیان وسیع خلیج حائل تھی۔ ''لیگ آف نیشنز'' کے بارے میں دونوں کے خیالات میں زبردست فاصلہ تھا لیکن اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یونینسٹ مسلمانوں کا تھا۔ اس پارٹی کے رہنماؤں سے اقبال کے تعلقات اب خوش گوار نہیں تھے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ۱۹۳۵ء ہی میں اقبال نے فضلِ حسین پر بڑی کڑی اور تلخ نکتہ چینی اس بات پر کر ڈالی کہ انہوں نے دیہی علاقوں کے مسلمانوں اور لاہور شہر کے رہنے والوں کے درمیان بڑی کوشش اور مہارت سے تنازع اور اختلاف کی بنیاد ڈال دی ہے۔ (۳۹) ان کی تنقید ٹھیک اس بات پر تھی جس کی تائید اور تحسین عبداللہ یوسف علی نے ہندوستان کی سیاسی اصلاحات کے لیے قائم کی جانے والی 'جوائنٹ کمیٹی' کے سامنے پیش ہونے پر کی تھی۔ (۴۰) جوں جوں فضلِ حسین اور اقبال کے باہمی روابط انحطاط کا شکار ہوتے گئے اسی

Marfat.com

رفتار سے عبداللہ یوسف علی کو یونینسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں نمایاں اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۵ء میں انہوں نے لوکل سیلف گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ پنجاب میں زیر تربیت افسروں کے لیے افتتاحی خطبہ دیا۔ وہ ادارہ معارف اسلامیہ سے بھی ایک ذمہ دار حیثیت میں وابستہ رہے جو قائم تو علامہ اقبال نے اسلامی تحقیق کے لیے کیا تھا لیکن ۱۹۳۶ء میں اس کی سالانہ کانفرنس کی صدارت فضل حسین نے کی تھی۔ (۴۱) یونینسٹ عبداللہ یوسف علی کو ایک ایسے دانش ور کی حیثیت سے دیکھتے تھے جو اقبال کے مقابلے میں ان کو معقول سہارا فراہم کر سکتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مسلم رائے عامہ کو یونینسٹ رہنماؤں کے خلاف بھڑکانے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یہ شہید گنج کی مسجد کے انہدام کا واقعہ تھا جس کو عدالتی حکم کی تائید حاصل تھی جس کی وجہ سکھوں کا مسجد کی زمین پر دعوے کا مقدمہ تھا۔ اقبال نے ۱۹۱۳ء میں کان پور کی مسجد کو نقصان پہنچنے کا شدید اثر لیا تھا اور وہ گرفتار شدہ مسلمانوں کی وکالت کے لیے وہاں گئے بھی تھے، کان پور کی مسجد کا معاملہ تو صرف وضو خانے کے انہدام کا تھا۔ لیکن یہاں لاہور میں اب پوری مسجد ہی کو منہدم کر دیا گیا تھا۔ عدالتی حکم نے مسلمانوں میں توقع کے عین مطابق بڑا جوش پیدا کر دیا تھا اور اقبال نے اس موقع پر اپنے کئی یادگار اشعار بھی اردو میں کہے تھے۔ یونینسٹ پارٹی اس قابل نہیں تھی کہ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کر سکے اور مسلم لیگ کی مقبولیت میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب ۱۹۳۶ء کے مارچ میں مسٹر جناح نے لاہور کا دورہ کیا۔ سڑکوں پر تشدد سے پر مظاہرے پھوٹ پڑے تھے لیکن جناح کی بردبار قیادت نے مزید کسی جانی نقصان سے بچا کر انتہائی تباہ کن صورت حال کو ٹھنڈا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جناح کے تین مرکزی معاون اقبال، ملک برکت علی اور ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین تھے۔ یہ سب انجمن حمایت اسلام میں اقبال کے شریک کار تھے۔ اقبال صدر تھے تو ملک برکت علی کالج کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔

Marfat.com

مئی ۱۹۳۶ء میں جناح نے اقبال کو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ میں شمولیت کی دعوت دی۔ فضل حسین نے اس تحریک کی مخالفت اس لیے کی کہ اس طرح کا ایک متحدہ قومی پلیٹ فارم صوبے میں ان کی سیاسی طاقت کو کمزور کرنے کا باعث بنتا۔ جناح اور فضل حسین کی معرکہ آرائی اگرچہ اخلاقی حدود کے اندر رکھ رکھاؤ سے چل رہی تھی لیکن لاہور میں نچلی سطح کی، خاص طور پر انجمن سے متعلق، سیاست میں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ بالخصوص ۱۹۳۶ء میں یہ معرکہ آرائی اپنے شباب پر تھی اور جن الجھنوں اور مسائل نے عبداللہ یوسف علی کو اس میں شمولیت پر آمادہ کیا وہ اس سال کالج میں موسم گرما کی تعطیلات کے بعد پیدا ہوئے۔

ان انتخابات کے پس منظر میں جو آئندہ سال کے اوائل میں متوقع تھے اقبال نے چودہ دوسرے مسلم زعما کے دستخطوں کے ساتھ ایک عوامی اپیل شائع کی جس کے ذریعے یونینسٹ پارٹی اور ان کے ہم نواؤں کے بارے میں ان کی رائے واضح طور پر ریکارڈ پر آ گئی۔ الفاظ یہ تھے:

”آپ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہوں گے کہ یونینسٹ پارٹی صوبہ کے الیکشن میں حصہ لے رہی ہے۔ آپ کے علم میں یہ بات ضرور ہونی چاہیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو پنجاب کے مسلمانوں میں دیہی اور شہری کی غیر اسلامی تفریق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی اخوت اور رواداری کی شان دار روایت کو اقتصادی فوائد کی خاطر بیچ ڈالا ہے۔ افسوس صد افسوس! کیا ان لوگوں کو یہ علم نہیں ہے کہ اسلام اس دنیا میں اس لیے نہیں آیا تھا کہ معاشی فوائد کی بنیاد پر لوگوں کو جمع کیا جائے بلکہ یہ انسانیت کے لیے ایسا اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے جس میں اتحاد اور اخوت کی بنیاد فکر و عمل کی یکسانیت پر ہوتی ہے۔ ہم یہ بات قبول کرتے ہیں کہ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان باہمی مفاہمت قصر آزادی کی تعمیر کی پہلی اینٹ ہے اور جب یہ لوگ قانون ساز اسمبلیوں میں پہنچ جائیں گے تو قوم و وطن سے سچی محبت رکھنے والے اور تعصب

Marfat.com

سے پاک ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کے ساتھ سیاسی معاہدے اور مفاہمت ضرور ہوگی۔ لیکن ہم ایک لمحے کے لیے بھی اسلام کے اعلیٰ مقاصد سے پہلو تہی نہیں کر سکتے اور نہ اپنے اصول غیر مسلموں کے ہاتھ صرف تھوڑے سے مادی فوائد اور خود غرضانہ مقاصد کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے فروخت کر سکتے ہیں''۔ (۴۲)

جن لوگوں نے اقبال کے ساتھ اس اپیل پر دستخط کیے ان میں ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین شامل تھے۔ اقبال خود پنجاب کی قانون ساز کونسل کے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک ممبر رہے تھے اور انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ یونینسٹ پارٹی کے سیاست دانوں کی مسلمانوں کے محروم طبقوں کے مسائل اور حالت زار سے بے اعتنائی کے بارے میں ان کی ذاتی اور اندرونی معلومات کی بنیاد پر تھا۔

موسم گرما کی تعطیلات عبداللہ یوسف علی نے اپنی فیملی کے ساتھ اپنے ومبلڈن والے گھر میں گزاریں۔ تعطیلات کا کچھ عرصہ ڈربی شائر میں بھی بسر ہوا۔ عبداللہ یوسف علی نے اسلامیہ کالج کے میگزین کے لیے ایک مضمون لکھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو عوامی مسائل سے کتنی دلچسپی ہے اور ان کی زندگی پر اس دلچسپی کا کتنا گہرا اثر ہے۔ اس مصروفیت کی وجہ سے انہیں اپنی بیوی معصومہ اور بیٹے راشد کے لیے بہت تھوڑا ہی وقت میسر ہوا حالانکہ وہ تقریباً ایک سال کے بعد ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے آئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جونہی میں لندن پہنچا، میں یونیورسٹی کالج میں مذاہب اور عقائد پر ہونے والی عالمی کانگریس کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ کانگریس کے پہلے مکمل سیشن میں جو پہلا مقالہ ''مذہب کی بنیاد'' کے موضوع پر پڑھا گیا، وہ میرا ہی تھا۔ اس بین الاقوامی اجتماع میں خیر سگالی کا بہترین جذبہ نمایاں تھا اور ہر شخص دوسرے کے نقطۂ نظر کو ہمدردی سے سننے اور سمجھنے کا خواہش مند نظر آتا تھا۔ اس

Marfat.com

کانگریس کے بارے میں اپنے تأثرات میں پہلے ہی انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کی ایک میٹنگ میں ۱۶ اکتوبر کو پیش کر چکا ہوں اس لیے اس کے بارے میں اس وقت مزید کچھ نہیں کہوں گا''۔

''میں نے چلتن ہیم میں منعقدہ نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی بین الاقوامی کانفرنس میں بھی شرکت کی، جہاں پنجاب سے آئے ہوئے تعلیم سے وابستہ کچھ لوگ بھی تھے۔ اس سلسلے میں میں نے چلتن ہیم کے یونٹیرین چرچ کے بھرپور اجتماع میں ایک وعظ بھی دے ڈالا۔

''بعدازاں میں مونٹیسوری کانفرنس میں شرکت کے لیے آکسفرڈ گیا جہاں اٹلی کی عظیم ماہر تعلیم خاتون ماڈام مانٹیسوری بہ نفس نفیس موجود تھیں جنہوں نے تین اہم خطبے دیے تھے۔

''اپنی بیوی اور بچے پر مشتمل میری فیملی کے ساتھ میری تعطیلات اصلاً صرف میٹلاک میں گزریں جو ڈربی شائر میں بلندی پر واقع ہے۔ یہ انگلستان کا ایک خوب صورت مقام ہے۔ یہاں پہاڑ اور وادیاں اور کچھ تاریخی نوعیت کے محلات نما مکانات ہیں۔ اس پورے عرصے میں میرا قرآن مجید کا مطالعہ جاری رہا اور ترجمہ و تفسیر لکھنے کا کام بھی رکا نہیں۔ مجھے بڑی امید ہے کہ یہ کام اگلے سال تک تکمیل کو پہنچ جائے گا''۔ (۴۳)

فضل حسین کا انتقال جولائی ۱۹۳۶ء میں ہوا، اس وقت عبداللہ یوسف علی لندن ہی میں تھے اور ''ورلڈ کانگریس آف فیتھس'' کے اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ جب یہ خبر ملی تو انہوں نے اجلاس کے شرکا سے ایک لمحے کی خاموشی اختیار کرنے کے لیے درخواست کی اور پھر بعد میں ایک تعزیتی نوٹ میں یہ کہہ کر خراج تحسین پیش کیا کہ وہ ہندوستان کے ایک انتہائی ذہین فرزند تھے جنہوں نے پنجاب کی ایگزیکٹو کونسل میں رہتے ہوئے بڑا زبردست کام سرانجام دیا اور اسی طرح کا مفید اور اہم کام لیگ آف نیشنز میں ہندوستان کی نمائندگی کر کے بھی کیا تھا۔ (۴۴) اس ماہ کے اواخر میں عبداللہ یوسف علی اور ان کی اہلیہ نے والڈورف ہوٹل میں فیروز خاں نون کے اعزاز میں

ایک استقبالیہ دیا جو یونینسٹ حکومت میں وزیر رہے اور پھر لندن میں ہندوستان کے ہائی کمشنر مقرر کیے گئے۔ ''دی ٹائمز'' اخبار کے مطابق اس استقبالیے کے معزز اور ممتاز مہمانوں میں سعودی عرب کے سفیر، سراٹل چٹرجی، سر فرانسس اور لیڈی ینگ ہسبنڈ، سر عبدالقادر اور لیڈی عبدالقادر اور سر حسن سہروردی شامل تھے۔(۴۵) لاہور میں مسلم لیگ کے لوگ جو جدوجہد کر رہے تھے یہ تقریب اس دنیا سے بالکل مختلف ماحول کی چیز تھی۔

عبداللہ یوسف علی ستمبر ۱۹۳۶ء میں سری لنکا سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ سری لنکا میں انہوں نے زہرہ کالج میں آل سیلون مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کی۔ اب قرآن کے ترجمے کی قسطوں کا شہرہ دنیا بھر میں ہو چکا تھا۔ ساتویں قسط پر انتہائی ہمدردانہ تبصرہ دی ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ کے علاوہ پکتھال کی جانب سے بھی ہوا جن کا اپنا انگریزی ترجمۂ قرآن ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکا تھا۔ پکتھال کے تبصرے میں خاصی فیاضی سے کام لیا گیا تھا لیکن تبصرہ کے آخری فقرہ میں ایک کانٹا بھی چبھو دیا گیا تھا: ''یہ کہنا ضروری ہے کہ ان کے ترجمے کی انگریزی ہندوستان کے کسی بھی سابقہ مترجم کے ترجمے سے بہتر ہے''۔ دوسرے تبصروں میں جن کے اقتباسات نقل ہوتے رہے ان میں شنگھائی ریکارڈر اور یروشلم سے نکلنے والے عربی کے جریدۃ ''العرب'' کے علاوہ ویسٹرن اسلامک ایسوسی ایشن کے ڈاکٹر خالد شیلڈریک کا تبصرہ جو اسپرانٹو کے جوشیلے حامی کی حیثیت سے معروف تھے، شامل تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ علامہ محمد اقبال کے کسی تعریفی یا تحسین آمیز تبصرے کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے حالانکہ وہ تو گھر کی سی بات تھی۔ ستمبر ۱۹۳۶ء تک ترجمہ و تفسیر کا یہ عظیم کام نصف سے زیادہ مکمل ہو چکا تھا۔

اسلامیہ کالج کی ملازمت کے دوران عبداللہ یوسف علی تنہا مال روڈ پر واقع نیڈو ہوٹل میں سکونت پذیر رہے۔ طلبہ کی ایک تنظیم نے جو انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کہلاتی تھی ان کو کریسنٹ

Marfat.com

ہوسٹل کے کوپر روم میں نماز جمعہ پڑھانے کی دعوت دے رکھی تھی اور وہ بڑی باقاعدگی سے یہ ذمہ داری ادا کرتے تھے۔اس تنظیم کے سیکرٹری محمد شفیع تھے جو کہتے ہیں کہ مجھے ان کا ایک باکسر کی مانند قوی الجثہ وجود یاد ہے جو طلبہ کے حلقوں پر اپنی وجاہت اور شکوہ کی وجہ سے بہت نمایاں تھا۔ان کے پاس اپنی ذاتی موٹر کار بھی تھی اور وہ ہمیشہ سوٹ زیب تن کرتے تھے۔انگریزی وہ انگریزوں کی طرح اور اُردو صاف اور شستہ بولتے تھے۔شفیع کو یہ یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی عربی زبان بولنے میں استعمال کی ہو۔عبداللہ یوسف علی کا خطبہ انگریزی میں ہوتا تھا یا پھر اردو میں۔وہ جمعہ کی نماز با جماعت کے لیے اپنا مصلا لاتے تھے اور نماز کے وقت ٹوپی ضرور پہنتے تھے۔ان کی شہرت یہ تھی کہ فضول احمق قسم کے لوگوں کو خوشی سے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔تنہائی پسند تھے اور اپنے ترجمے کے کام میں مشغول اور منہمک رہتے تھے''۔ (۴۶)

لاہور میں عبداللہ یوسف علی کا سماجی حلقہ بڑا منتخب قسم کا تھا۔وہ لاہور کی ایک انجمن کے نائب صدر تھے جس کا نام ''دی سوسائٹی فار پروموٹنگ سائنٹفک نالج'' تھا۔ثقافتی محاذ پر وہ لاہور آرٹ سرکل کے چیئرمین تھے اور متعدد کلبوں کے رکن تھے جس میں روٹری کلب اور انٹرنیشنل فیلو شپ سوسائٹی بھی شامل تھے (۴۷) انہیں اپنی ذات کے بارے میں کچھ کہنا سننا قطعاً پسند نہیں تھا یہاں تک کہ لاہور میں بہت کم لوگ ان کی زندگی کے سابقہ کارناموں کے بارے میں جانتے تھے ۔ایک معروف اور ممتاز ہم عصر لاہور اورینٹل کالج کے پرنسپل، جن سے عبداللہ یوسف علی عربی زبان کے رموز علمی کے حوالے سے مشورہ کرتے رہے تھے، یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کبھی حیدر آباد کی ریاست میں وزارت کے منصب پر فائز رہے تھے۔ (۴۸)

نومبر ۱۹۳۶ء میں طوفان برپا ہو گیا۔جنوری ۱۹۳۷ء میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہونا طے ہو گئے تھے اور فضل حسین کی جگہ یونینسٹ پارٹی کے نئے لیڈر سکندر حیات خاں نے

Marfat.com

عبداللہ یوسف علی سے شیخوپورہ کی دیہی نشست پر انتخابات میں کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ عبداللہ یوسف علی نے ان کی بات مان کر کاغذات نامزدگی داخل کر دیے۔ (۴۹) ایسا لگتا ہے کہ جب انہوں نے گزشتہ برس پرنسپل شپ کی حیثیت سے تقرر قبول کیا تھا تو الیکشن میں کھڑے ہونے کا ارادہ ان کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا۔ انہوں نے انتخابات میں کھڑے ہونے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھا تھا اور بڑے واضح الفاظ میں ہر ایسی شرط کو رد کر دیا تھا جو انہیں سیاست میں حصہ لینے سے روکتی ہو۔ (۵۰) اب منظرنامہ بالکل واضح اور تیار تھا کہ کالج کے یونینسٹ پارٹی کے حامی پرنسپل اور کالج کمیٹی کے ان ممبروں کے مابین معرکہ ہونا تھا جو جناح کے حامی تھے۔

برکت علی مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات میں امیدوار تھے۔ اس وقت ایک ایسا تأثر ابھرا کہ گویا عبداللہ یوسف علی اسلامیہ کالج کے سٹاف کو یونینسٹ پارٹی کے لیے فضا ہموار کرنے کی غرض سے استعمال کر رہے ہیں۔ (۵۱) عبداللہ یوسف علی نے خود اس حد تک تو اعتراف کیا کہ انہوں نے کالج کے سٹاف سے پارٹی کی میٹنگوں اور انتخابی جلسوں میں نمایاں شرکت پر اعتراض کیا تھا تاکہ کالج میں کوئی غیر مناسب سیاسی چپقلش کی فضا پیدا نہ ہو۔ ایک ایسی صورت حال میں جس میں سیاسی فضا انتہائی حساس اور گرم تھی کالج کے سٹاف کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی جب کہ کالج کا پرنسپل خود یونینسٹ پارٹی کو کھلے عام تعاون فراہم کر رہا ہو، یقیناً ایک اشتعال انگیز قدم تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے مزید غضب یہ کیا کہ کالج کے چند ایسے لیکچراروں کو نااہلی کے الزام میں برطرف کر دیا جن کا تعلق برکت علی کے گروپ سے تھا۔ (۵۲)

الیکشن کی ہماہمی میں اور اس مہم میں مدد کے لیے برکت علی نے اپنا ہفت روزہ اخبار ''دی نیو ٹائمز'' جاری کیا۔ ۱۱ نومبر کے شمارے میں ایک آرٹیکل چھپا جس میں عبداللہ یوسف علی پر تنقید کی گئی تھی۔ ایک اور مضمون اردو کے اخبار ''احسان'' میں ۱۹ نومبر کو شائع ہوا۔ یہ حافظ فیروز الدین

Marfat.com

نے لکھا جو انجمن کی جنرل کونسل کے ممبر تھے۔ ان تنقیدی حملوں کا مزاج زہریلا اور دشنام سے مشابہ تھا۔ اس سے پہلے ایک بار ۱۹۲۷ء میں بھی یہی کچھ ہو چکا تھا اور اب دوبارہ ویسی ہی تنقید ہو رہی تھی۔ اس وقت بھی ان سے اپنے تدریسی ریکارڈ اور کارکردگی کا دفاع کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

عبداللہ یوسف علی نے "ایسٹرن ٹائمز" کے کالموں کو اپنے دفاع کے لیے استعمال کیا:

"یہ صحیح ہے کہ میں کوئی تدریسی کام نہیں کرتا ہوں۔ انجمن کے ساتھ اپنے معاہدے کی رو سے میں نے ایسی کسی بھی شرط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کا تعلق تدریس یا ایسی کسی چیز سے ہو۔ لیکن ساتھ ہی میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ لڑکوں سے رابطے کے لیے کچھ تدریس مستحسن ضرور ہے۔ میرا یہ بیان انجمن کی جانب سے انٹرویو کے موقع پر جو سر محمد اقبال کے مکان پر ان کی موجودگی میں ہوا تھا، کافی سمجھا گیا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ گزشتہ سال بی۔اے کی انگریزی آنرز کی کلاس جس کو میں نے پڑھایا تھا، یونیورسٹی کے امتحان میں بہت اچھے نتائج کی حامل رہی تھی۔ خود کلاس پڑھانے کے علاوہ میں نے سٹاف کے تدریسی کام کی نگرانی اور تنظیم کے لیے بڑی محنت کی ہے جس کے نتائج بہت شاندار رہے ہیں اور بہت سے لڑکے اس بات کی گواہی دیں گے۔ مزید برآں میں ہر ہفتے ایک دو بار وعظ و نصیحت کے پیریڈ میں نگراں کی حیثیت سے شریک ہوتا ہوں اور کالج کے عمومی دینی یا ثقافتی لیکچروں کی صدارت بھی کرتا ہوں۔ میرے اپنے لیکچر کالج کا ایک معروف عمل اور شناخت ہیں۔ (۵۳)

عبداللہ یوسف علی پر دوسرا الزام یہ تھا کہ وہ کالج کے دفتری اوقات میں اپنے ترجمۂ قرآن پاک کا کام کرتے ہیں۔ عبداللہ یوسف علی کا ردعمل یہ تھا کہ اگر ایسا ہوتا ہو تو اس سے بڑا گناہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کالج کے اوقات کے دوران میں پروف کی تصحیح کا کام کبھی نہیں کیا۔ پروف کالج میں پرنٹر پہنچا جاتا ضرور تھا اس لیے کہ یہ اس کے لیے آسان

تھا۔(۵۴) ان پر یہ تنقید بھی کی گئی کہ وہ ۱۳۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ لیتے ہیں جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کو چھوڑ کر پنجاب کے کسی بھی پرنسپل کی تنخواہ سے زیادہ ہے۔(۵۵) عبداللہ یوسف علی کی عربی زبان میں اہلیت کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا اور کہا گیا کہ ''وہ قرآن کا ایک انگریزی ترجمہ شائع کر رہے ہیں حالانکہ جو لوگ انہیں قریب سے جانتے ہیں انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ عربی کا ایک لفظ نہیں جانتے اور ان کا ترجمہ سراسر انگریزی اور اردو کے دوسرے ترجموں پر مبنی ہے''۔(۵۶)

اس قسم کے ذاتی حملوں کا سامنا ہونے کا جو لازمی نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا اور یوسف علی نے ۶ رجنوری ۱۹۳۷ء کو استعفیٰ دے کر ذمہ داری وائس پرنسپل مسٹر غنی کے سپرد کر دی۔ طلبہ نے جونہی یہ خبر سنی فی الفور احتجاج شروع ہو گیا۔(۵۷) کھڑکیاں توڑ ڈالی گئیں اور طلبہ کالج کے مرکزی مقام حبیبیہ ہال میں جمع ہو گئے۔

''سول اینڈ ملٹری گزٹ''، جس کا میلان عبداللہ یوسف علی کی حمایت کی جانب تھا، نے یہ رپورٹ دی کہ طلبہ نے عبداللہ یوسف علی کی حمایت میں تالیاں بجائیں اور برکت علی، خلیفہ شجاع الدین اور میاں امیر الدین (جو انجمن میں مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے) کے خلاف نعرہ بازی کی۔ شائع ہونے والی روداد میں یہ تذکرہ بھی تھا کہ عبداللہ یوسف علی نے طلبہ کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی تلقین کی اور کالج کی نیک نامی اور اچھی شہرت کی حفاظت کرنے کو کہا۔ یہ ایک جذباتی لمحہ تھا جب طلبہ اور ان کے سابقہ پرنسپل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ طلبہ مسلسل نعرہ زن تھے اور بیک آواز کہہ رہے تھے: ''وعدہ کیجیے کہ آپ جائیں گے نہیں''۔(۵۸)

عبداللہ یوسف علی کے کالج سے جانے کے بعد طلبہ جلوس کی شکل میں مارچ کرتے ہوئے انجمن کے دفتر پہنچے اور پھر شہر کے مختلف گوشوں میں نعرے لگاتے ہوئے کالج کے میدان میں واپس آئے۔ جلوس کے شرکا میں سے ایک کا تاثر یہ تھا: ''یہ پہلی اسٹرائیک تھی جس کا مجھے تجربہ

Marfat.com

ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ علامہ اقبال انجمن کے صدر تھے یا نہیں لیکن وہی ایسے شخص تھے جن کی جانب ہم نے رجوع کیا تھا۔ طلبہ جلوس کی شکل میں مارچ کرتے ہوئے جاوید منزل پہنچے۔ علامہ بیمار تھے۔ طلبہ کے چار نمائندوں نے اندر جا کر ان سے ملاقات کی''۔ (۵۹) انجمن نے اس بحران پر ردعمل کا اظہار اس طرح کیا کہ اگلے دن جمعرات ۷ر جنوری ۱۹۳۷ء چھ بجے شام کو کالج کمیٹی کی ایک میٹنگ بلا لی گئی۔

ہڑتالی طلبہ کے ایک وفد نے عبداللہ یوسف علی سے شام کوان کے ہوٹل میں ملاقات کی جس کے نتیجے میں انہوں نے کالج میں واپسی کے لیے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ ان کے مطالبات کالج کمیٹی تسلیم کر لے۔ کالج کمیٹی کی میٹنگ شام چھ بجے منعقد ہوئی اور دو گھنٹے تک گہرے غور و خوض، بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیالات کے بعد آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ ایک قرارداد بالاتفاق منظور کی جائے جس میں کالج کمیٹی کے سیکرٹری اور کالج کے پرنسپل دونوں پر مکمل اعتماد کا اظہار ہو۔ (۶۰)

طلبہ کا جم غفیر جو باہر انتظار کر رہا تھا۔ خوشی سے پرنسپل یوسف علی زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا منتشر ہو گیا۔ جذبات ٹھنڈے ہو گئے اور سنیچر کے روز سے کالج کی معمول کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔

پولنگ کا دن ۲۸ جنوری ۱۹۳۷ء مقرر تھا۔ الیکشن عبداللہ یوسف علی کے لیے نقطۂ زوال ثابت ہوا۔ بظاہر ایسا ہوا کہ ایک مقامی زمین دار نے بھی الیکشن لڑنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اپنے خاص آدمی مولوی محی الدین قصوری کو کامیاب کرانے کے لیے سکندر حیات نے یہ چال چلی تھی کہ عبداللہ یوسف علی کو نامزدگی کے لیے تیار کر لیا۔ پھر اس نے زمین دار کو عبداللہ یوسف علی کے احترام میں مقابلے سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ادھر عبداللہ یوسف علی کو سمجھایا کہ مقامی زمیندار

Marfat.com

انتہائی مقبول اور با اثر ہے، بہتر ہے کاغذات نامزدگی واپس لے لیے جائیں۔اس طرح دونوں امیدوار پیچھے ہٹ گئے اور مولوی محی الدین قصوری بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔(۶۱) یونینسٹ پارٹی نے الیکشن میں اچھی کارکردگی دکھائی اور بھاری تعداد میں مسلم نشستیں جیت لیں۔اگر سکندر حیات کی سکیم یا سازش کا بیان درست ہے تو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یا تو یوسف علی ان سب باتوں سے مکمل بے خبر رہے یا دانستہ چشم پوشی کر گئے۔

الیکشن کے بعد ''دی ٹائمز'' کو ایک مراسلے میں سر سکندر حیات کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے عبداللہ یوسف علی نے کہا: ''ہندوستان کی حد تک میں فخریہ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ سکندر حیات کی قیادت میں یونینسٹ پارٹی نے قابل ذکر کامیابی حاصل کی ہے اور نئے دستور کے ماتحت پنجاب کی پہلی حکومت تشکیل دی ہے''۔(۶۲)

اسلامیہ کالج میں برکت علی کی چالوں کو انجمن کے اندر بھی پوری طرح تائید حاصل نہیں تھی۔یقینی طور پر لاہور میں کچھ دوسرے سرگرم مسلم لیگی ایسے بھی تھے جو مشکلات کی شدت کے وقت عبداللہ یوسف علی کی حمایت میں نکل آئے تھے۔محمد شفیع نے جو اس وقت انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے سیکرٹری تھے اور جن کے اقبال سے بھی قریبی روابط تھے عبداللہ یوسف علی سے قریبی اور قلبی رشتہ برقرار رکھا اور ان کی قدر افزائی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔(۶۳) نامور صحافی ظفر علی خاں اپنی رائے کے بے دھڑک اظہار کے لیے مشہور تھے۔انہوں نے بھی اسلامیہ کالج کی میٹنگ میں جو اسی مشکل عرصے میں ہوئی تھی، کھل کر عبداللہ یوسف علی کے لیے بہت واضح اور اچھے کلمات کہے تھے۔ظفر علی خان نے طلبہ سے کہا تھا کہ وہ ''یہ بات یاد رکھیں کہ ان کا پرنسپل کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو خوشامد یا ابن الوقتی کو پسند کرتا ہو''۔(۶۴)

بقیہ تعلیمی سال کے عرصے میں عبداللہ یوسف علی ہی پرنسپل رہے اور مزید کسی قسم کے

Marfat.com

اختلافات یا تنازع پیش نہیں آیا۔ فروری ۱۹۳۷ء میں ان کو نظام حیدر آباد میر عثمان علی خاں کی سلور جوبلی کی تقریبات میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ انہیں تقریبات کا جاہ و جلال اور رنگا رنگی بڑی اچھی لگی۔ وہ لکھتے ہیں:

''نیا حیدر آباد جو ہز ایگز الٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں کی تخلیق ہے اور جس کا تعلق اس کے آثار قدیمہ اور فطری حسن سے بڑا گہرا ہے یہ سب مل کر سلطنت کی حکمرانی کے ۲۵ سال مکمل ہونے کی یادگار تقریب کے لیے انتہائی مناسب پس منظر مہیا کرتے ہیں۔

''عالی جاہ میر عثمان علی خاں کے واضح حکم کی تعمیل میں تقریبات کا انعقاد ہر ممکن سادگی سے کیا گیا تھا۔ لیکن ان کی رعایا اور محبت سے سرشار لوگوں کا جوش و خروش اتنا شدید تھا کہ تقریبات کی سادگی میں ایک وقار اور تمکنت پیدا ہو گیا۔ اس کا اظہار عالی جاہ کے ان جوابی کلمات سے ہوتا ہے جن میں ان اعلیٰ جذبات و احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو انہوں نے مختلف خطبہ ہائے استقبالیہ کے بعد ارشاد فرمائے تھے۔

''عالی جاہ کے ان مخلصانہ اور کریمانہ کلمات کو کون بھول سکتا ہے جو انہوں نے نو تعمیر جوبلی ہال میں اپنی رعایا کو مخاطب کر کے سلور جوبلی کی بالکل ابتدائی تقریب میں ارشاد فرمائے تھے۔ اپنی رعایا کی خدمت اور ان کی محبت کے حصول سے زیادہ اعلیٰ و ارفع کون سا ایسا نیا مقصد ہو سکتا ہے جو ایک حکمران اپنے سامنے رکھ سکتا ہے؟ ان کے دو لائق فرزند، دو شہزادے بھی ریاست کے کاموں میں اہم ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں اور ان کی اعلیٰ صفات بیگمات، ترک شہزادیاں ہیں جن کی بدولت تعلیم کے فروغ اور ترقی اور صنف نازک کے ماحول کی اصلاح و تحسین کی تمام مساعی اور تحریکوں میں ایک وقار اور حسن و کشش کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ ان کے کم عمر پوتے ننھے نواب مکرم جاہ بہادر ان دوہری روایات عالیہ کے وارث ہیں جن کا مصدر و منبع اگر ایک

Marfat.com

طرف سر عثمان علی خاں کا خاندان ہے تو دوسری جانب خلافتِ عثمانیہ کے خاندان کی شاہی روایات ہیں۔

''جب عالی جاہ مختلف جماعتوں، کمیونٹی کے افراد اور جاگیرداروں وغیرہ کے خطبہ ہائے استقبالیہ کا جواب دے رہے تھے تو ان کے الفاظ کا انتخاب مسرت اور تبریک کا حامل تھا جس کے نتیجے میں بڑے ہال میں موجود تمام لوگ (بے ساختہ) نعرہ ہائے مسرت و تحسین بلند کر رہے تھے جس کی گونج ارضِ سلطنت کے طول و عرض میں محسوس کی جا سکتی تھی۔

''اچھوتوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: 'میری حکومت کے اندر کوئی اعلیٰ نہیں اور کوئی ادنیٰ نہیں ہے اور نہ اچھوت اور غیر اچھوت کا کوئی فرق و امتیاز ہے اور میرے خاندان کی یہی روایت ہے۔ منصب اور حیثیت کا انحصار صرف شرافت اور صلاحیت پر ہے' ۔اس طرح کے الفاظ ایک خاص پویلین میں جو جوبلی گارڈن میں تعمیر ہونا تھا نقش کیے جانے تھے جہاں وہ مستقل اور پائیدار حیثیت اختیار کر لیں۔عوام کو بلا روک ٹوک وہاں آنے کی اجازت دی جاتی تھی تاکہ رعایا کے ادنیٰ سے ادنیٰ افراد بھی آزادی سے وہاں آئیں، ان کو پڑھیں اور اس سے نفع حاصل کریں۔

''اس وسیع القلب حکمران کی مذہب سے محبت و احترام کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کی خدمت میں ایک خوب صورت چاندی کا بنا ہوا صندوقچہ پیش کیا گیا جو اصلاً سکندر آباد اور بولارم کے شہریوں کی جانب سے تحفہ تھا۔ یہ ایک ٹھیک ٹھیک ناپ تول کے مطابق بنا ہوا مدینہ منورہ کے حرم شریف کا ماڈل تھا جو حیدر آباد کے ایک انجینئر نے بنایا تھا۔ مدینہ منورہ کے حرم شریف میں اب برقی روشنی کا انتظام ہے جو حیدر آباد کی سلطنت کی جانب سے لگائی گئی ہے۔

''چند الفاظ روشنی اور چراغاں کے بارے میں: بہت سے مکانات بالخصوص بنجارا اہل

Marfat.com

کے علاقے میں پہاڑیوں پر تعمیر کیے گئے ہیں جن کے درمیان کافی فاصلہ رکھا گیا ہے تاکہ ہر سو مناسب وسیع منظر مہیا ہو سکے۔ چنانچہ چراغاں کی روشنی ہر جانب میلوں دور سے نظر آتی ہے۔ چراغاں کی روشنیوں سے منور حیدرآباد پریوں کی داستانوں کا شہر معلوم ہوتا ہے۔ شہر کی جدید اور قدیم تاریخ میں رومانویت رچی بسی ہے۔ شان دار طریقے سے تمام تقریبات کا اہتمام، جس کے پیچھے موثر منصوبہ بندی اور سخت محنت کی موجودگی نے اس کو کامیابی سے روشناس کیا، سارے کارپردازوں کو پروانۂ تحسین وشکر کا مستحق قرار دیتی ہے۔

''عالی جاہ کی اپنی سادہ دلی اور سادگی کردار کی عظمت و وقار اور عوام کے لیے مسلسل اظہار امتنان وتشکر ان کو اس خطاب کا پوری طرح مستحق بناتا ہے جو حیدرآباد کے قومی ترانہ کا اختتامیہ ہے۔ یعنی

سراج الدین اسلامی - امیر مومنان باشی

(دینِ اسلام کے چراغ، امیرالمسلمین)

خدا ان کو طویل عمر عطا فرمائے اور ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے''۔ (۶۵)

ایسا لگتا ہے کہ یوسف علی کا ذہن سیاسی حقائق کو نظر انداز کر کے خیالی دنیا میں رہنے کو چاہتا تھا۔ خواب وخیال کی خوب صورت دنیا میں حیدرآباد ان کو ایک ایسی مثالی سلطنت نظر آ رہا تھا جس کا بادشاہ روشن خیال تھا، منصب و مرتبے کا سختی سے اہتمام ہوتا تھا اور باہمی احترام کی فضا پائی جاتی تھی۔

حیدرآباد کے دورے کے دو ماہ بعد یوسف علی علی گڑھ پہنچتے ہیں اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں خطبۂ صدارت دیتے ہیں۔ لاہور کی اپنی سماجی اور ادبی زندگی نے بھی ان کو کافی مصروف رکھا تھا۔ لاہور کے معزز فرد کی حیثیت سے یوسف علی کو اکثر وزیراعظم پنجاب کی

Marfat.com

جانب سے اہم سرکاری تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا۔ یونینسٹ گورنمنٹ کو ان کی خدمات کی شدت سے ضرورت پڑتی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے ایک بلند عزائم کا آئینہ دار تعلیمی پروگرام شروع کیا تھا۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں وہ ایک بار پھر پنجاب کی سالانہ تعلیمی کانفرنس کے صدر ہو گئے۔ ان کی مستقل قسم کی سرگرمیوں میں ان کی وہ درس قرآن کی کلاس بھی تھی جس میں اسلامیہ کالج کے سٹاف کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ کوئی سٹاف کا شخص قرآن پاک کا کچھ حصہ تلاوت کرتا تھا۔ پھر عبداللہ یوسف علی انگریزی میں اس کی تفسیر بیان کرتے تھے۔ لیکن یہ ایک ایسا انتظام تھا جس میں بعض مرتبہ بات خلط ملط ہو جاتی تھی۔ (۶۶) اس دوران میں انہوں نے مقامی اردو اخبارات کے لیے بعض مضامین بھی لکھے، مثلاً ایک مضمون امام حسینؓ کی شہادت کے واقعات سے متعلق بھی انہی دنوں لکھا گیا۔ (۶۷)

عبداللہ یوسف علی کو ابھی اسلامیہ کالج میں اپنے معاہدے کی تکمیل کے ایک سال کا عرصہ مزید پورا کرنا تھا لیکن انہوں نے اس کے برخلاف دوسرا فیصلہ کیا۔ لاہور میں قیام کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ قرآن پاک کے ترجمے کی بقیہ آٹھ اقساط کے مسودے تیار ہو چکے تھے اور شیخ اشرف کے سپرد کر دیے گئے تھے تاکہ ایک ایک ماہ کے وقفے سے شائع کیے جاتے رہیں۔ سکندر حیات خان کے نام اپنے الوداعی پیغام میں انہوں نے الفاظ اور مفاہیم کا انتخاب اس طرح کیا کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہیں رہنے دیا۔ ان کا انداز قرون وسطیٰ کے ان علما و فضلا کی طرح کا تھا جو اپنے شاہانہ مربی کو سلام تشکر پیش کرتے ہوئے مبالغہ آرائی کی آخری حدود چھو لیتے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا: ''موجودہ حکومت پنجاب بین الاقوامی روابط اور اخوت کی مثال کامل ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کی کمیونٹی اور جماعت کے افراد شریک ہیں''۔ (۶۸)

یوسف علی نے لاہور میں اپنے ناقدین پر ایک چوٹ بھی کر ڈالی جو دسمبر ۱۹۳۷ء میں

Marfat.com

شائع ہونے والی آخری قسط میں سامنے آئی۔ ایک ایسے شخص کی جانب سے جس کے خلاف لوگوں نے گناہ کا ارتکاب کیا ہو انہوں نے ان الفاظ میں شکوہ کیا: ''میرے تصور میں بھی نہ تھا کہ کسی ایسے شخص کے خلاف اس درجہ بغض وحسد، بدگمانی اور اذیت ناک قسم کی غلط ترجمانی کا ارتکاب بھی کیا جا سکتا ہے جس کا مقصد کسی قسم کا دنیاوی فائدہ حاصل کرنا نہیں تھا اور نہ جس کو یہ دعویٰ تھا کہ اصولی اعتبار سے وہ کسی طرح سند کا درجہ رکھتا ہے''۔ (۶۹) عبداللہ یوسف علی اس پورے عرصے میں طوفان کی زد میں رہے لیکن اسی طوفان کے درمیان رہتے ہوئے انہوں نے اپنا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔

Marfat.com

حواشی باب ۵

۱- IOL:L/E/7/1526,1928: اس مخطوطہ میں یوسف علی کی ۱۹۲۸ء کی لیگ آف نیشنز کانفرنس میں شرکت کی تفصیلات ملتی ہیں۔

۲- IOL:L/E/7/1371,4112 اس ریکارڈ میں یہ درج ہے: ''لارڈ میسٹن کا مستقر اصلی صرف سہولت کی خاطر ہندوستان لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن وہ ہندوستان یا برٹش حکام کے ماتحت کام نہیں کرتے ہیں بلکہ پوری طرح آزاد ہیں'' گویا جب کہ میسٹن نے ۱۹۱۹ء میں ہندوستان سے اپنا تعلق ختم کر لیا تو بھی ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے مالیاتی نگراں کمیٹی میں اپنے منصب پر ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۷ء تک برقرار رہے۔ میسٹن نے غالباً زمرن کی وساطت سے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ زمرن پہلے دفتر خارجہ سے متعلق تھے اور اب لیگ کے انسٹی ٹیوٹ آف انٹلیکچول کوآپریشن میں کام کر رہے تھے۔ ان کی باہمی قربت اور تعلق کی تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو میسٹن پیپرز F 136/21: مکتوب منجانب زمرن۔ بنام میسٹن مورخہ ۱۵/مئی ۱۹۱۸ء

۳- ایضاً IOL:/L/E/7/1526: کمیٹی نمبر IV میں عبداللہ یوسف علی ڈچ وفد کے ساتھ ایک طویل بحث میں الجھ گئے تھے۔ ڈچ وفد کی تجویز تھی کہ ۱۹۲۵ء میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہیگ میں کیا جائے جس کا موضوع بین الاقوامی قانون کا کوڈیفکیشن (دفعات کی ترتیب) ہو۔ عبداللہ یوسف علی کی تجویز تھی کہ کانفرنس جنیوا میں ہونی چاہیے کیوں کہ جنیوا سے اسٹاف کی منتقلی اور دوسرے انتظامات پر ۱۲۸۵۰۰ سوئس فرانک کی اضافی رقم خرچ ہو جائے گی۔ وفد کی رپورٹ کے مطابق ''اس نقطۂ نظر کو سند

Marfat.com

قبولیت حاصل نہ ہوئی اور ایک طویل اور بسا اوقات پریشان کن قسم کا بحث و مباحثہ بڑی کمیٹی اور ذیلی کمیٹی میں ہوتا رہا جس کے یوسف علی بھی ایک ممبر تھے۔ آخر کار اس امر پر اتفاق ہوا کہ اس رقم کو معطل اور محفوظ رکھا جائے اور کوڈیفکیشن کانفرنس ۱۹۲۹ میں منعقد نہ کی جائے تاآنکہ اسلحہ پر پابندی کی کانفرنس منعقد ہونے کا مسئلہ ملتوی ہو جائے۔ اس صورت میں ۲۰۸۵۰۰ فرانک جو تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کے لیے مختص کیے گئے ہیں وہ کوڈیفکیشن کانفرنس کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔ ڈنمارک کی حکومت نے اضافی ۱۲۸۵۰۰ فرانک فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کی جو ہیگ میں کانفرنس منعقد ہونے کی صورت میں درکار ہونگے۔ یہی وہ بڑی بچت تھی جو بجٹ سے متعلق بحث و مباحثہ کے نتیجہ میں حاصل ہوئی تھی''۔

یوسف علی اسی طرح کی تلخ و تند بحث میں اس سے پہلے بھی الجھے تھے جب انہوں نے انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن میں ملازمت کی نئی جگہوں کے پیدا کرنے کی تجویز رکوانے کی کوشش کی تھی۔ یوسف علی نے یہ تحریک تجویز کی تھی کہ نئی جگہوں کے پیدا کرنے سے کوئی مفید مقصد پورا نہیں ہوگا۔ ان کی یہ تجویز کہ ۲۱۹۰۰۰ فرانک کے اخراجات جو نئی پوسٹوں کے لیے رکھے گئے ہیں کم کیے جائیں ۳ کے مقابلہ میں ۲۱ ووٹوں سے رد ہو گئی تھی''۔

۴۔ یوسف علی نے اس ایسوسی ایشن کا حوالہ پروگریسو اسلام سیریز کے سلسلے کے کتابچہ نمبر ۵ بعنوان ''اخلاقی تعلیم'' کے دیباچہ میں دیا ہے جو دسمبر ۱۹۳۰ میں شائع ہوا تھا۔

۵۔ ''مسلمانوں کی تعلیم کے مقاصد'' یہ وہ صدارتی خطبہ تھا جو پنجاب مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے موقع پر ۱۹۲۳ میں دیا گیا۔

۶- ''ہو واز ہو'' (۱۹۵۱-۱۹۶۱) لندن مطبوعہ ۱۹۶۲ء

۷- ''دی ہولی قرآن ٹیکسٹ، ٹرانسلیشن اینڈ کمنٹری'' تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء۔ سفر کا حوالہ پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں ہے۔

۸- پروگریسو اسلام سیریز کے پمفلٹ نمبر ۵ میں جس کا نام ''اخلاقی تعلیم'' تھا۔ عبداللہ یوسف علی اپنے کردار اور کام کے بارے میں کچھ معلومات مہیا کرتے ہیں ''اس موقع پر میرے خطبہ نے کافی توجہ حاصل کی اور کئی مختلف مدرسہ ہائے فکر کے لوگوں نے اس میں دلچسپی ظاہر کی اور میری آراء کی تائید اور توثیق کی۔ پروگریسو اسلام کی انجمن کے افراد نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس خطبہ کو کتابچہ کی شکل میں شائع کردوں چنانچہ میں ایسا ہی کر رہا ہوں''۔

۹- ''دی ٹائمز'' ۲۰ مئی ۱۹۳۱ء

۱۰- محمد علی جوہر نے بستر مرگ پر جو ہدایت وصیت کے سے انداز میں کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مقبوضہ اور غلام ہندوستان میں دفن ہونا نہیں چاہیں گے اور ایسا ہرگز نہ کیا جائے بلکہ ان کی تدفین گنبد صحراء کے قریب یروشلم میں عمل میں لائی جائے۔

۱۱- ''میاں فضل حسین کے خطوط'' ملاحظہ ہوں صفحہ ۱۷۳ تا ۲۰۳۔ اس حصہ میں ان کے وہ مفصل خطوط شامل ہیں جو انہوں نے آغا خان، شفاعت احمد خاں اور ظفر اللہ خاں کو لکھے تھے اور حد تو یہ ہے کہ وائسرائے ارون کے نام بھی ایک خط لکھا تھا۔

۱۲- ملاحظہ ہو کے۔کے۔عزیز کی کتاب ''برٹین اینڈ مسلم انڈیا'' جس میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ لاسکی کے تبصرہ کے الفاظ صفحہ ۱۲۷ پر ہیں۔

Marfat.com

۱۳- ''ہندوستان کے تمدن کی تاریخ'' کا انگریزی ترجمہ ''اے کلچرل ہسٹری آف انڈیا ڈیورنگ دی برٹش پیریڈ'' کے نام سے ڈی-پی تاراپوروالا سنز اینڈ کمپنی نے ۱۹۴۰ میں بمبئی سے شائع کیا تھا۔ یہ اقتباس انگریزی ایڈیشن کے دیباچہ سے ماخوذ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ طبع ثانی کی صورت میں لاہور سے کریم سنز نے ۱۹۶۷ میں شائع کیا تھا۔

۱۴- ملاحظہ ہو ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل۔ صفحہ ۲۴۵ تا ۲۴۷۔ ''انقلاب'' لاہور اخبار کا حوالہ اس کی ۲۱ نومبر ۱۹۳۱ کی اشاعت سے دیا گیا ہے۔

۱۵- ملاحظہ ہو محمد عبداللہ چغتائی کی تالیف ''اقبال کی صحبت میں'' صفحہ ۲۵۰ تا ۲۵۱

۱۶- ''رجال اقبال'' تالیف عبدالروف عروج صفحہ ۳۲۸۔ اردو کا فقرہ تھا ''قوم کی ہمت بڑھائی''، جس کو انگریزی میں ''ریوائیلائزڈ ہز پیپل'' لکھا گیا۔

۱۷- اخبار ''سٹیٹسمین'' کلکتہ ۳۰/جنوری ۱۹۳۷ء (YA.185)

یہ عشائیہ ۲۹/ دسمبر ۱۹۳۱ کو اس وقت ہوا تھا جب ہندوستان کے طلبہ یونیورسٹی یونین ہال میں، جو ٹورنگٹن اسکوائر پر واقع تھا، بیرون ملک ہندوستانی طلبہ کے پہلے اجتماع میں شریک ہونے آئے تھے۔ کانفرنس کا افتتاح لندن یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے کیا تھا۔ دو خاص مقرر تھے ایک ڈاکٹر ڈی-ایف سرکار جو کانفرنس کے کنویز تھے اور دوسرے عبداللہ یوسف علی جنہوں نے ''انڈین یونیورسٹی'' کے تصور پر بات کی تھی۔ ان کا پیغام، جس کے مطابق ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں یونیورسٹیاں طلبہ کے ضرورتوں کی اچھی طرح تکمیل نہیں کر پا رہی ہیں، غالباً خاصا مقبول عام تصور تھا۔

ملاحظہ ہو ''جے-ایف- بروس کی مرتب کردہ ''اے ہسٹری آف دی یونیورسٹی آف

Marfat.com

دی پنجاب'' صفحہ ۱۷۷-۱۷۸

۱۹- آل انڈیا مسلم کانفرنس کے بارے میں معلومات کے لیے ملاحظہ ہو، کے-کے-عزیز کی مرتب کردہ کتاب ''دی آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۹۲۸-۱۹۳۵ دستاویزی ریکارڈ'' جس کے صفحہ ۱۵ پر یہ تحریر ملتی ہے'' کانفرنس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اِس نے مسلمانوں کو ایک تنظیمی تباہی سے بچالیا جو امکانی طور پر زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی''

کانفرنس کے تنقیدی جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو عاشق حسین بٹالوی کی تصنیف ''اقبال کے آخری دو سال'' صفحہ ۲۱۱ سے ۲۱۵ تک بالخصوص محمد علی جناح کے کانفرنس میں شرکت سے انکار کے حوالہ سے۔

۲۰- ملاحظہ ہو ''میاں فضل حسین کے خطوط'' صفحہ ۲۴۱/۲۴۰، فضل حسین کو کانفرنس کے بارے میں جو فکرمندی تھی وہ ان ہدایات سے ظاہر ہوئی جو انہوں نے عبداللہ ہارون کو کانفرنس کے لیے ۷۰۰ روپے کی رقم فراہم کرنے کے لیے دی تھیں۔ انہوں نے ان کو تحریر کیا تھا'' میرے خیال میں یہ ضروری ہے آپ اس کانفرنس میں موجود ہوں بلکہ اہل کانفرنس سے چند روز پہلے پہنچ جائیں تاکہ اس کی کامیابی کے لیے کچھ کوشش کر سکیں۔ اس بات کے سبب کہ آپ انگلستان اور آٹووا (کناڈا) میں رہ چکے ہیں آپ کی شرکت اور بھی اہم ہو جاتی ہے''۔ فضل حسین نے نواب آف ڈھاکا سے بھی شرکت کا وعدہ لیا تھا۔ یوسف علی کا کانفرنس میں کیا حصہ تھا اس کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں۔

۲۱- ''دی ریلیجس پوٹنی آف اسلام'' پروگریسو اسلام کے سلسلے کا ساتواں کتابچہ ہوگا۔ اس کا حوالہ سرسری طور پر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہونے والے انتخابی عمل کے بارے میں ملتا ہے۔

۲۲- ملاحظہ ہو" حیات اقبال کے چند مخفی گوشے" مصنفہ ایم-ایچ فاروقی، صفحہ ۲۴۳ پر روزنامہ انقلاب کی ساتویں جلد سے ایک خبر کا حوالہ دیا گیا ہے جو ایک چائے کی دعوت کے بارے میں ہے جو لاہور کے ٹاؤن ہال میں یکم مارچ ۱۹۳۳ کو منعقد ہوئی تھی، جس کا مقصد علامہ اقبال کو تیسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر استقبالیہ دینا تھا۔

۲۳- ملاحظہ ہو رپورٹ "دی ٹائمز" ۲/ جون ۱۹۳۳ء

۲۴- ایضاً

۲۵- "دی آل انڈیا مسلم کانفرنس" ۱۹۲۸-۱۹۳۵ دستاویزی ریکارڈ" ایضاً ڈاکٹر عزیز نے جوائنٹ کمیٹی میں پوچھے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات کو درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۸-۱۳۷۔ وفد کے دوسرے چار ممبر مولانا محمد یعقوب، حسن شہید سہروردی، خلیفہ شجاع الدین اور حاجی رشید احمد تھے۔

۲۶- سر اینپو پیٹرو مدراس کی قانون ساز کونسل کے ایک ممبر تھے۔ انہوں نے اپنے سوال جواب کے ذریعہ یوسف علی کو اس طرح آڑے ہاتھوں لیا تھا:

پیٹرو: "کیا آپ یہ بتائیں گے کہ پچھلے ۱۲ برس میں آپ کو کوئی انتخابی تجربہ ہوا ہے؟ کیا آپ نے کسی صوبائی یا مرکزی اسمبلی کی نشست پر انتخاب لڑا ہے؟

یوسف علی "جی میں نے انتخاب تو نہیں لڑا ہے لیکن سارا عرصہ میں اس عمل سے بہت قریب رہا ہوں اور تھوڑے عرصہ کے لیے میں یو پی میں ایک نشست پر امیدوار بھی رہا ہوں"

پیٹرو ''کیا آپ انتخابات ہار گے تھے''؟

یوسف ''جی نہیں میں نے انتخاب میں حصہ نہیں لیا تھا''

پیٹرو ''اس کا مطلب ہے کہ آپ کو صوبائی یا مرکزی قانون ساز اسمبلی کی کارکردگی اور طریق کار کے بارے میں کسی قسم کا ذاتی تجربہ نہیں ہے۔

یوسف ''جی بطور ممبر مجھے واقعی تجربہ نہیں ہے''

پیٹرو ''میرا مطلب بطور ممبر تجربہ سے ہی ہے''

یوسف ''لیکن تمام سیاسی مسائل و معاملات سے براہ راست رابطہ میں رہا ہوں''

پیٹرو ''میں زائد از ضرورت جواب نہیں چاہتا آپ صرف ہاں یا ناں میں جواب دیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کو ریٹائرمنٹ لیے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے''

یوسف ''میں ۱۹۱۴ میں ریٹائر ہوا ہوں''

پیٹرو ''آپ ۱۹۱۴ میں ریٹائر ہوئے تھے؟''

یوسف ''جی ہاں''

پیٹرو ''اس وقت سے اب تک آپ نے یہ سارا عرصہ انگلستان میں ہی گزارا ہے''؟

یوسف ''جی نہیں سارا عرصہ برطانیا میں نہیں گزارا ہے''

پیٹرو ''بیشتر عرصہ؟''

یوسف ''میری سکونت انگلستان کی ہے لیکن میں اکثر و بیشتر ہندوستان جاتا رہتا

Marfat.com

ہوں۔ کیا میں صرف ایک لفظ کا اضافہ کرسکتا ہوں (ان کا اشارہ مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے براہ راست انتخاب کے طریقہ کی جانب تھا) اور وہ یہ کہ جن آراء کا میں نے اظہار کیا ہے وہ میری ذاتی آراء نہیں ہیں بلکہ وہ ایسوسی ایشن (مسلم کانفرنس) کی آراء ہیں۔

پیٹرو ''میں نے یہ سوال نہیں پوچھا ہے''۔

ملاحظہ ہو'' دی آل انڈیا مسلم کانفرنس ۳۳-۱۹۲۸ء دستاویزی ریکارڈ ایضاً صفحہ ۱۵۷-۱۵۶، کے-کے-عزیز کا کہنا ہے کہ مسلم کانفرنس کا وفد ناپختہ اور ناتجربہ کار تھا ''گواہوں میں سیاسی قابلیت اور استدلال کی مہارت بہت کم تھی۔ مسلمانوں کا مقدمہ ان کی وکالت سے مضبوط نہیں ہوسکا۔ دلائل دیتے ہوئے وہ کئی بار لڑکھڑا گئے۔ انہیں حقائق کا بھی علم نہیں تھا۔ وہ جواب دینے میں ذہانت اور برجستگی سے بھی محروم تھے۔ بسا اوقات سوال کا جواب دیتے وقت وہ بالکل گنگ ہو جاتے تھے اور کمیٹی کے مسلم ارکان ان کو اس پریشان کن صورت حال سے نجات دلاتے تھے''

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ وہ شخص جس نے یوسف علی پر جرح کی تھی جناح کا قریبی دوست تھا۔ ملاحظہ ہو، والپورٹ صفحہ ۱۹۰

۲۷- ''دی آل انڈیا مسلم کانفرنس'' ایضاً صفحہ ۱۷۰

والپوٹ کو یقین واثق ہے کہ خود جناح کو بھی پاکستان کی تجویز کے بارے میں اس مرحلہ پر کوئی علم نہیں تھا۔ یہ بات کہ جناح کو اس تاریخ تک پاکستان کی اسکیم کے بارے میں علم تھا ان کے کاغذات سے کہیں معلوم نہیں ہوتی ہے اور نہ کسی ایسی اسکیم

میں ان کی دلچسپی کا کوئی اشارہ ملتا ہے''

ملاحظہ ہو''جناح آف پاکستان'' والپورٹ صفحہ ۱۳۲

والپورٹ نے کریڈک (Craddock) کی سوالیہ جرح کا حوالہ تو ٹھیک دیا لیکن وہ عبداللہ یوسف علی کے اصلی وطن کے بارے میں غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ ان کو''شمالی مغربی سرحدی صوبہ'' کا بتاتے ہیں۔

۲۸- ان طلبہ میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت رحمت علی کی تھی۔ ملاحظہ ہو کے۔ کے عزیز کی تالیفات''برٹین اینڈ مسلم انڈیا'' اور''کمپلیٹ ورکس آف رحمت علی''۔ پہلی کتاب میں کے کے عزیز نے لکھا ہے کہ''ان کا (یعنی رحمت علی کا) تصور پاکستان اقبال کے تصور سے بنیادی طور پر مختلف تھا، وہ اس طرح کہ انہوں نے برصغیر ہندوستان میں تین آزاد مسلم ریاستوں کا مطالبہ کیا تھا۔ ایک پاکستان جس میں پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان شامل ہو۔ دوسرا بنگستان جس میں بنگال اور آسام شامل ہو۔ اور عثمانستان جو حیدرآباد دکن اور برار پر مشتمل ہو۔ جب جناح نے ۱۹۴۷ء میں موجودہ پاکستان کی سرحدوں کو قبول کر کے تقسیم ہند کے منصوبہ سے اتفاق ظاہر کیا تو رحمت علی نے اس پر سخت ناگواری کا اظہار کیا اور اسے قوم سے غداری کے مترادف قرار دیا'' صفحہ ۱۴۴۔

رحمت علی کو ایک طرح سے پاکستان سے جلاوطنی اختیار کرنی پڑی اور ۱۹۴۸ میں کیمبرج میں ان کا انتقال ہو گیا جہاں وہ مدفون ہیں۔

۲۹- ''دی آل انڈیا مسلم کانفرنس'' ایضاً صفحہ ۱۹۴

Marfat.com

۳۰- سر فریڈرک للی کے بارے میں تعزیتی نوٹ ''دی ٹائمز'' ۲۶ نومبر ۱۹۳۴ء

۳۱- ''دی ہولی قرآن-ٹیکسٹ، ٹرانسلیشن اینڈ کمنٹری'' تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء۔ اقتباس پہلے ایڈیشن کے دیباچہ سے ہے۔

۳۲- عبداللہ یوسف علی نے مسودہ ۴/اپریل ۱۹۳۷ء کو مکمل کیا جیسا کہ ''لا انیوائے'' میں اور ''دی ہولی قرآن''-کے اختتامی نوٹ میں مذکور ہے۔ ایضاً۔ عبداللہ یوسف علی ہر کام میں بڑے باریک بیں تھے۔ چنانچہ قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کا پروجیکٹ ان کی سالگرہ کی تاریخوں پر ہی شروع کیا گیا اور ایسے ہی ختم ہوا۔ ممکن ہے کہ یہ اتفاقیہ امر ہو یا پھر محض یوسف علی کا اپنے ادبی اور علمی کاوشوں کے بارے میں اپنی منزل کے شعور کے حوالہ سے ایک دلچسپ فیصلہ ہو۔

۳۳- گرد پوش (ٹائٹل) پر انگریزی میں جو الفاظ درج تھے ان کا مفہوم یہ تھا ''قرآن مقدس-انگریزی میں تعارف-متوازی کالموں میں اصل متن-خوبصورت انگریزی زبان میں تشریح وتفسیر اور مکمل وضاحتی حاشیوں کے ساتھ'' حقوق طباعت کے بارے میں کوئی حوالہ نہیں تھا۔ اگرچہ پشت پر ''عبداللہ یوسف علی کے لیے محفوظ'' کے الفاظ یہ اشارہ کرتے ہیں کہ کاپی رائٹ کے حقوق یوسف علی کے پاس تھے۔

طباعت رپن پرنٹنگ پریس لاہور، مرزا محمد صادق (جو پریس کے مالک تھے) نے کروائی تھی۔ کاغذ کا سائز A4 کے تقریباً برابر ہی تھا۔ تمام تیس قسطیں ایک ہی طرح ہلکی نیلے چرمی گرد پوش کے ساتھ مجلد کی گئی تھیں۔ صرف پانچویں جلد کا رنگ گلابی تھا۔

۳۴- AHI جلد برائے عرصہ یکم جولائی ۱۹۳۴ء تا ۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء

Marfat.com

تمام خطوط انگریزی میں ہیں اور رجسٹر کے صفحات پر چسپاں کیے گئے ہیں۔ ان کو یہاں اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اس ادارے کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں جس سے عبداللہ یوسف علی بڑی گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ ان خطوط کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔

خط نمبرا

محمد اسد کی جانب سے اقبال کے نام

۱۴/ جولائی ۱۹۳۴ء

ڈیئر ڈاکٹر اقبال صاحب

آپ کے ۱۰ر تاریخ کے خط سے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ آپ کا مشورہ اسلامیہ کالج میں دینیات کی تدریس سے متعلق واقعی بہت اچھا ہے۔ اگر مجھے یہ منصب دیا جاتا ہے تو میں اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اتنی سادہ سی بات نہیں ہے جیسا کہ مولوی صاحبان عام طور پر فقہ کی تدریس کا کام کرتے ہیں بلکہ یہ مکمل نصاب ہوگا جس میں دین اسلام کے آغاز، فلسفہ اور ارتقاء کا قرآن کی پہلی وحی سے لے کر تدوین حدیث کے مراحل تک احاطہ کیا جائے گا۔ قدرتی طور پر مسائل فقہ خود بخود اس میں شامل ہو جائیں گے لیکن یہ میری تدریس و تعلیم کا اصل ہدف نہیں ہوگا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں سب سے زیادہ اس ضروری مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جاؤں گا جو یہ ہے کہ نوجوان مسلم طلبہ یا کم از کم ان میں سے کچھ کے اندر ذہنی مسرت کا وہ احساس پیدا ہو جائے جس کے بغیر کسی قسم کی بھی

دینی علوم کی تدریس فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ مجھے اس امر میں بالکل شبہ نہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ مجھے اپنی مرضی سے کام کا نقشہ ترتیب دینے کی آزادی دی جائے۔ اگر ایسا ہوا، تو بہت مختصر عرصہ میں مثلاً دو تین سال تک اسلامیہ کالج، شمالی ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں ممتاز ترین مقام کا حامل ہو جائے گا۔ بالخصوص جہاں تک اسلامی دینیات کے فلسفیانہ انداز میں تدریسی عمل کا تعلق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے آپ کے مشورے کا تعاون حاصل رہے گا۔ میں نے آپ کے مشورے کے مطابق اپنے تصورات کا ایک خاکہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ میں لاہور آ کر براہ راست آپ سے سارے مسائل پر تبادلۂ خیال کروں۔ میرا دو ہفتوں کے لیے کسی پہاڑی مقام پر جانے کا ارادہ ہے۔ اس لیے کہ میں ابھی کچھ چیزیں لکھنا چاہتا ہوں اور دہلی کی گرمی میرے ہوش وحواس شل کر دیتی ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ میں ڈلہوزی چلا جاؤں اس طرح مجھے آپ سے اگلے چند روز کے اندر اندر ملاقات کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ آپ کی صحت وعافیت کے لیے بہترین تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

محمد اسد

پس نوشت: میں انتہائی ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے جلد جواب دیں تا کہ جیسا کہ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے، میں اپنے پروگرام کو ترتیب دے سکوں اور یہ عرصہ پہاڑ پر گزار سکوں۔ لیکن میں آپ کا جواب آنے تک اپنی روانگی ملتوی کر رہا ہوں۔

Marfat.com

(انجمن کی کارروائی میں یہ بات نوٹ کی گئی کہ اسد کو یہ اطلاع دے دی جائے کہ کالج ان دنوں موسم گرما کی تعطیلات کے لیے بند ہے اور مناسب ہوگا کہ وہ اپنے سفر کا پروگرام ملتوی نہ کریں۔

خط نمبر۲

محمد اسد کی جانب سے اقبال کے نام

۳۱ر جولائی ۱۹۳۴ء

مجھے کل کی تاریخ کا لکھا ہوا آپ کا خط ابھی ابھی ملا ہے۔ میں اپنے معاملہ میں آپ کی مساعی کے لیے تہ دل سے شکرگزار ہوں۔ جہاں تک چھ ماہ کی آزمائشی مدت کے ۲۵۰ روپے ماہانہ مشاہرہ کی تجویز کا تعلق ہے تو مجھے یہ قبول ہوگی بشرطیکہ انجمن اس مدت کے بعد دوسرے اساتذہ اور پروفیسروں کی طرح میری تنخواہ درجہ وار اسکیل کے مطابق مقرر کر دے۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی تجویز کیا ہے لیکن یہ امر ضروری ہے کہ ابتداء میں یعنی آزمائشی مدت کے بعد یہ ۳۰۰ روپے ماہوار سے کم نہ ہو۔ یہ خیال مت فرمایئے گا کہ میں کسی قسم کی سودے بازی کر رہا ہوں۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ میری کارکردگی اچھی ہو اور میرے مستقبل کے لیکچر اور کورس جو میں تیار کروں وہ بالکل ایسی ہی حقیقی سائنٹفک کاوش ہو جیسی کہ یورپین یونیورسٹیوں میں ہوتی ہے۔ اس کام کے لیے مجھے قدرے آسودگی درکار ہے جو مجھے سکون سے کام کرنے کی فراغت مہیا کر سکے۔ اس کام کے لیے مجھے یورپ کے بعض اخبارات سے اپنے تعلق کو بھی منقطع کرنا پڑے گا، جن کی خواہش ہے کہ آنے والے موسم خزاں سے میں ان کے لیے مشرق قریب کے لیے نامہ نگاری کے فرائض انجام دوں۔ دوسری جانب میرا

خیال ہے کہ میں اسلامیہ کالج میں اپنے تقرر کو دین اسلام کی وسیع تر خدمت کا ذریعہ اور بنیاد بھی بناؤں اور یہ کام میرے لیے بہت قدر و قیمت کا حامل ہے۔

میں چند روز میں عازم کشمیر ہوں گا اور راستے میں لاہور ٹھہر کر آپ سے ملوں گا، اور آپ سے اس مسئلہ پر بات مکمل کرنے کے لیے گفتگو کرنا چاہوں گا۔ لیکن اگر آپ اس دوران میں کالج کمیٹی کے قطعی اور متعین نقطۂ نظر کے بارے میں مطلع کر سکیں تو میں انتہائی شکر گزار رہوں گا۔

مکرر شکریہ کے ساتھ آپ کی دائمی صحت یابی کی امیدوں کے ساتھ

دستخط

محمد اسد

(انجمن کی روداد کی کارروائی میں لکھا ہے کہ ''کمیٹی قبول کرتی ہے''، لیکن بہر طور نامعلوم وجوہ کی بنا پر یہ تقرر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اس منصب پر ۱۹۳۹ء میں مولانا مودودی کا اعزازی طور پر تقرر ہو گیا)۔

۳۵- ایضاً: AHI اندراج مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۳۴ ''لائف آف کمیونٹی'' کے الفاظ اردو کے الفاظ ''قومی زندگی'' کا انگریزی ترجمہ ہیں۔

۳۶- عبداللہ یوسف علی کا ''ایسٹرن ٹائمز'' میں کام کرنے کا ذکر دو جگہ ہوا ہے۔ ایک عبدالسلام خورشید کی کتاب ''وے صورتیں الٰہی'' کے صفحہ ۲۶۹ پر اور عبدالرؤف عروج کی کتاب ''رجال اقبال'' کے صفحہ ۳۲۹ پر۔

۳۷- ملاحظہ ہو ''ملفوظات اقبال'' ابواللیث صدیقی صفحہ ۱۷

Marfat.com

۳۸- AHI ایضاً۔ اندراج مورخہ ۱۵ر اپریل ۱۹۳۵ء

۳۹- اقبال نے فضل حسین پر بڑی شدید تنقید کی تھی۔ ان کے الفاظ میں ''یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ شہری اور دیہی (نمائندگی) کا یہ سوال سر فضل حسین کی تائید و معاونت سے اٹھایا گیا ہے۔ جنہوں نے اصل میں اقتدار دیہی لیڈر کی حیثیت سے نہیں بلکہ صوبہ کے ایک مسلمان کی حیثیت سے حاصل کیا تھا۔ لیکن اب شہری اور دیہاتی کی تفریق پر شدت اور اضافہ کر کے اقتدار سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس طرح سے انہوں نے اپنے ساتھیوں میں ایسے لوگ جمع کر لیے ہیں جو انتہائی کمتر درجہ کے ہیں اور حکومت یا اقتدار میں ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتے''۔ ملاحظہ ہو ''سر چھوٹو رام۔ لائف اینڈ ٹائمز'' مصنفہ ڈی۔ سی۔ ورما۔ صفحہ ۱۰۸

۴۰- ''دی آل انڈیا مسلم کانفرنس'' ایضاً صفحہ ۱۹۴

۴۱- ملاحظہ ہو ''اقبال کی صحبت میں'' مصنفہ عبداللہ چغتائی صفحہ ۱۰۴

۴۲- ''گفتار اقبال'' ایضاً صفحہ ۲۰۴-۲۰۵۔ جہاں اقبال اور ان کے ساتھ دوسرے دستخط کنندگان کی جانب سے ایک اپیل کا حوالہ ہے جو ۸ر مئی ۱۹۳۶ء کو شائع ہوئی تھی۔

۴۳- ''ملاحظہ ہو اسلامیہ کالج لاہور کے میگزین ''کریسنٹ'' کا شمارہ اکتوبر ۱۹۳۶ء عبداللہ یوسف علی کا مضمون بعنوان۔ پرنسپل کی جانب سے طلبہ کے نام'' (YA 146)

۴۴- ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور ۱۹ر جولائی ۱۹۳۶ء (YA 115)۔ برطانیا کے اخبارات نے بھی یوسف علی کی جانب سے خراج تحسین کو شائع کیا۔ مثلاً ''دی ٹائمز'' نے ۱۱ر جولائی ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں مندرجہ ذیل الفاظ شائع کیے ''گوور اسٹریٹ پر

Marfat.com

یونیورسٹی کالج کے گریٹ ہال میں منعقدہ ورلڈ کانگریس آف فیتھس کے اجلاس کے دوران میں عبداللہ یوسف علی نے سر فضل حسین کے انتقال کی جانب توجہ دلائی اور کہا کہ پنجاب اپنے ایک باصلاحیت فرزند سے اور ہندوستان ایک نہایت قابل رہنما سے محروم ہو گیا ہے۔

فضل حسین کی ذہنی صلاحیت اور فکری بلندی کے لیے یہ بات یقیناً قابل ذکر ہے کہ یوسف علی نے جو اپنے ہمعصر مسلمانوں کے لیے تعریفی کلمات کہنے کے معاملہ میں بہت محتاط تھے، اس طرح کے توصیفی کلمات واشگاف انداز میں کہے۔

۴۵- ملاحظہ ہو مطبوعہ روداد "دی ٹائمز" ۲۹/ جولائی ۱۹۳۶ء

۴۶- مصنف کے ساتھ ایک انٹرویو، لاہور، جنوری ۱۹۸۹ء

۴۷- "دی سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور" ۷ار مئی ۱۹۳۵ء۔ اس اشاعت میں عبداللہ یوسف علی کی اس تقریر کی روداد شائع ہوئی ہے جو انہوں نے لاہور کے روٹری کلب میں "تعلیمی اصلاح" کے موضوع پر کی تھی۔ (YA 111)

"دی سسکس ڈیلی نیوز" مورخہ ۷/ اکتوبر ۱۹۳۷ء نے اپنی ایک رپورٹ میں جو عبداللہ یوسف علی کی اس تقریر پر مبنی تھی جو انہوں نے "مسئلہ فلسطین" پر برائٹن کے روٹری کلب میں کی تھی ان کا ذکر لاہور روٹری کلب کے ایک سابقہ صدر کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن لفظ "صدر" کو پنسل سے قلمزد کر کے اوپر سے "ممبر" لکھ دیا گیا ہے۔ (YA 70)

۴۸- پروفیسر حمید اللہ نے اپنے ایک خط میں جو مصنف کے نام ۶ر مارچ ۱۹۸۸ء کو لکھا گیا

ہے مندرجہ ذیل الفاظ درج کیے ہیں ''میں مرحوم پروفیسر محمد شفیع سے لاہور میں ملا تھا اور انہیں یہ بات خوب یاد تھی کہ عبداللہ یوسف علی پورے پنجاب میں ایک عالم، اور مصنف کی حیثیت سے معروف تھے۔ وہ اس بات پر بڑے حیران ہوتے تھے کہ عبداللہ یوسف علی حیدرآباد میں وزیر محصولات اراضی رہ چکے ہیں''۔

پروفیسر شفیع اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ یوسف علی نے ترجمۂ قرآن کے تیسرے ایڈیشن میں ان کے تعاون کے لیے سپاس و تشکر کا اظہار کیا ہے۔

۴۹- ملاحظہ ہو ''وے صورتیں الٰہی'' ایضاً صفحہ ۲۶۸، ''رجال اقبال'' ایضاً صفحہ ۳۲۹

۵۰- ''میری اپنی پوزیشن بالکل صاف اور واضح ہے۔ میری تقرری ایک خصوصی معاہدے کے ماتحت ہوئی تھی اور قانون ساز اسمبلی کے لیے کھڑے ہونے کے بارے میں میرا حق محفوظ تھا''، ایسٹرن ٹائمز، لاہور، ۱۷/نومبر ۱۹۳۶(YA 153)

''میں نے کسی ایسی شرط کو قبول نہیں کیا تھا جس کی رو سے میرا سیاست میں حصہ لینا ممنوع قرار پائے۔ اس کے برعکس میں نے واضح طور پر ہر ایسی شرط کو رد کر دیا تھا''

ایسٹرن ٹائمز لاہور ۲۷/دسمبر ۱۹۳۶ء(YA 167)

۵۱- ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور ۱۷/نومبر ۱۹۳۶ء(YA 153)

۵۲- ''پیسہ اخبار اردو، لاہور ۱۴/جنوری ۱۹۳۷(YA 179)

۵۳- ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور، ۲۷/دسمبر ۱۹۳۶ء(YA 167)

۵۴- ایضاً

۵۵- ''دی لائیٹ'' لاہور، ۲۴/دسمبر ۱۹۳۶ء(YA 168)

Marfat.com

۵۶- ایضاً

یوسف علی کی تنخواہ اور عربی زبان سے واقفیت کے بارے میں تنقیدی بات مسٹر درانی نام کے ایک صاحب نے اٹھائی تھی۔ اخبار ''دی لائیٹ'' کے مطابق درانی کے حملہ کے پس پشت ذاتی انتقام کا جذبہ تھا۔ اخبار کے مطابق ''وجہ یہ تھی کہ بدقسمتی سے مسٹر یوسف نے کچھ ہی عرصہ قبل مسٹر درانی کی کسی تالیف پر مقدمہ لکھنے کی درخواست قبول کر لی تھی لیکن اس میں مسٹر درانی کے بعض خیالات سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔ مسٹر درانی معاف کر دینے اور بھول جانے والے آدمی نہیں تھے''

ڈاکٹر کے۔ کے۔ عزیز نے مصنف کو اس امر کا اشارہ دیا ہے کہ ''دی لائیٹ'' نے جس مسٹر درانی کا ذکر کیا ہے وہ غالباً غازی کریم درانی نام کے کوئی صاحب تھے۔

۵۷- ''پیسہ اخبار'' لاہور ۱۴ر جنوری ۱۹۳۷ء (YA 179)

۵۸- ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور ۷ر جنوری ۱۹۳۷ء (YA 170)

۵۹- ملاحظہ ہو ''یاران مکتب، تحریک پاکستان اور اسلامیہ کالج'' صفحہ ۲۱۵ مصنفہ بیدار ملک

۶۰- ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور ۱۳ر جنوری ۱۹۳۷ء (YA 175)

۶۱- ''دے صورتیں الٰہی'' ایضاً صفحہ ۲۶۹-۲۶۸

۶۲- ''دی ٹائمز'' ملاحظہ ہو مراسلہ مطبوعہ شمارہ ۱۱ جون ۱۹۳۷ء (YA 39)

۶۳- اپنے ایک مراسلے میں جو ''دی نیو ٹائمز'' لاہور کے ایڈیٹر کے نام لکھا گیا تھا اور جو ۲۱ دسمبر ۱۹۳۶ کو شائع ہوا تھا محمد شفیع انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے سکریٹری کی حیثیت سے رقم طراز ہیں۔ ''علامہ عبداللہ یوسف علی سے ہمارے روابط انتہائی مخلصانہ ہیں اور

Marfat.com

ہم وقتاً فوقتاً ان کی جانب سے ملنے والی انتہائی قیمتی اور اخلاص پر مبنی رہنمائی کے لیے ممنون ہیں'' (YA 163)

۶۴- ''ٹریبیون'' لاہور ۴ ردسمبر ۱۹۳۶ء (YA 156)

۶۵- ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور ۲ ر مارچ ۱۹۳۷ء (YA 187)

یوسف علی نے اس موقع پر ایک مدحیہ تحریر یا نثری قصیدہ تحریر کیا جس میں یہ الفاظ شامل تھے ''شاہ معظم کی سلور جوبلی برار اور حیدر آباد ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں خصوصی جشن مسرت کے انعقاد کے ذریعہ منائی جانی چاہیے۔ شاہ معظم کی عظیم صفات جوان کی علوء ذہنی اور قلبی وسعتوں کا اظہار کرتی ہیں کچھ ایسی ہیں کہ ہر قسم کے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت وعقیدت پیدا ہوگئی ہے۔ ہم خوش اس لیے ہیں کہ ان کی سلطنت وحکومت سے لاکھوں لوگوں کو نوازا گیا ہے اور ان کو فوائد کا حصول ہوا ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ ان کا ساتھ ہمارے لیے بہت عرصہ تک باقی رہے۔ یہ دعا ہمارے لبوں سے اس لیے نکلتی ہے کہ ان کی شخصیت سے نظام شاہی منور ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی توقیر ملی ہے: ''ہفت روزہ پائلٹ'' امرتسر فروری ۱۹۳۷ء (YA 189) تاریخ درج نہیں۔

۶۶- ملاحظہ ہو ''یاران مکتب'' ''تحریک پاکستان اور اسلامیہ کالج'' ایضاً صفحہ ۱۹۲-۱۹۱۔

ایک مرتبہ یہ ہوا کہ جن آیات کی تلاوت کی گئی، یوسف علی کی تشریح وتفسیر ان سے متعلق نہیں تھی۔ اس الجھن اور غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف علی تیزی سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ بعد میں انہوں نے اسٹاف کے ممبرز سے معذرت کر لی تھی۔

Marfat.com

۶۷- ملاحظہ ہو اردو جریدہ ''مسجد'' لاہور ۱۶/اپریل ۱۹۳۷ء مضمون بعنوان ''سید شہید حضرت امام حسین علیہ السلام''۔

۶۸- ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور ۲۴/اپریل ۱۹۳۷ء یوسف علی کے تعریفی کلمات لاہور میں ''انٹرنیشنل فیلوشپ سوسائٹی'' کے عشائیہ میں ادا کیے گئے تھے۔

۶۹- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً ''لی اینوائے''۔

Marfat.com

چھٹا باب

ایک مضطرب روح

۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا ایک بھیانک انجام کی طرف بڑھتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ادارے جن کو یوسف علی نظم وضبط اور عقل ودانش کا مخزن سمجھتے تھے یعنی برطانوی بادشاہت اور لیگ آف نیشنز دونوں ٹوٹ پھوٹ کی زد میں تھے۔ شاہ ایڈورڈ کے عہد کی دنیا جس سے عبداللہ یوسف علی کو خصوصی دلی تعلق تھا، سمندر میں پوری رفتار سے سفر کرتے ہوئے پانی کے اس جہاز کی مانند تھی جس کے مقدر میں ایک عظیم الجثہ سمندری برفانی تودے سے ٹکرانا تھا۔ اسپین کی خانہ جنگی (۱۹۳۶-۳۹)، فلسطین میں مسلمانوں کی بغاوت (اپریل ۱۹۳۶)، اٹلی کا حبشہ پر حملہ (۱۹۳۵-۳۶)، ہٹلر کا رائن لینڈ پر از سر نو دعوی (مارچ ۱۹۳۶) اور اسی طرح کے اہم واقعات کی ایک طویل فہرست تھی جو آنے والے بدلتے ہوئے زمانے کی پیشگوئی کر رہے تھے۔ اور جنہوں نے سیاسی فضا میں نئی امیدوں کے چراغ روشن کر دیے تھے۔

برطانوی بادشاہت بھی اب وہ نہیں رہی تھی جیسی کہ ماضی میں ہوا کرتی تھی۔ جارج پنجم کی وفات جنوری ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ وفات کے وقت تک وہ پرنس آف ویلز کے اس معاشقہ کا معاملہ طے نہیں کرا پائے تھے جو ولی عہد شہزادے کا ایک امریکن تاجر کی بیوی مسز ویلس سمپسن کے ساتھ جاری تھا۔ مسز سمپسن بادشاہ کے ساتھ دربار کی سرکاری تقریبات میں نظر آنے لگی تھیں اگرچہ ابھی ان کی باقاعدہ طلاق نہیں ہوئی تھی۔ یہ طلاق بالآخر اس سے اگلے سال کے اکتوبر میں تکمیل پذیر ہوئی۔ برطانیا کے پریس نے دسمبر ۱۹۳۶ تک قدرے بزدلی اور بے ہمتی کے عالم میں اس مسئلہ پر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ لیکن آخر کار یہ خبر آشکارا ہوگئی۔ شاہی رومان کا اسکینڈل اب

Marfat.com

طشت از بام ہو گیا تھا اور ایڈورڈ ہشتم کا ایک مطلقہ سے شادی پر اصرار برطانیا میں ایک دستوری بحران کا سبب بن چکا تھا۔ ذاتی نوعیت کی تلخیوں اور نزاع و اختلاف کے نتیجہ میں شاہ برطانیا کو اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں تخت و تاج سے دستبرداری کے لیے رضا مند ہونا پڑا اور مئی ۱۹۳۷ء میں ان کے چھوٹے بھائی جارج ششم کی حیثیت سے تخت نشین ہوئے۔ ہندوستان کے عوام اس واقعہ پر اس لیے حیرت زدہ رہ گئے کہ ایڈورڈ کی تاجپوشی کی رسومات کے لیے ہندوستان میں روائتی دربار منعقد کرنے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ (۱)

برطانیا کی بادشاہت کی شہرت کو داغ لگ چکا تھا۔ عبداللہ یوسف علی طویل عرصہ سے شاہ سے وفاداری کے علمبردار تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جارج پنجم اور ملکہ میری کی تعریف و توصیف میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی تھی۔ انہوں نے ان کے لیے ''چہرۂ مبارک'' کی اصطلاح لندن کے ایک جلسہ میں سامعین کو متعارف کرائی تھی۔ (۲) اس وقت ۱۹۳۷ میں بھی وہ کچھ سہمے سہمے سے لیکن احترام کے جذبات سے خالی نہ تھے، جیسے کہ گزشتہ ۲۵ برس میں کوئی تبدیلی واقع ہی نہیں ہوئی ہو۔

جولائی ۱۹۳۷ء میں کنسنگٹن میں انہوں نے شاہ پرستوں کی لیگ کے ایک جلسہ سے خطاب کیا جس میں ''رائل فیملی'' کو ''پاکیزہ اطوار و اخلاق'' کا ایک نمونہ بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ (۳) وفاداری کے احساس کی شدت نے ان کی نظروں سے تمام تضادات کو اوجھل کر دیا تھا۔ ایک اور ایسا ہی کم نگاہی کا مظاہرہ وہ اسلامیہ کالج کے حالیہ واقعات کے علی الرغم ہندوستان کی تحریک آزادی کی طاقت کا صحیح اندازہ لگانے میں کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ابھی تک اسی سیاسی شعور سے چمٹے نظر آتے تھے جو کبھی کے گزرے ہوئے شاہ ایڈروڈ کے زمانے کے انگلستان کے منظر نامہ سے متعلق تھا۔ دوران تقریر انہوں نے کہا:

Marfat.com

''ہندوستان برطانوی سلطنت کا ایک جزو لاینفک ہے اور اس حیثیت سے اس کو وہ تمام فائدہ اور وقار حاصل ہوا ہے جو بادشاہت سے وابستہ ہے۔ ملک کی سیاسی زندگی میں جونئی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کے بارے میں ہمارے کچھ اندیشے ضرور ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس امر میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ (برطانوی) بادشاہت ہندوستان کے لیے قوت واستقرار کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اور شہنشاہ ہندوستان کا خطاب جو ہمارے حاکم اعلیٰ استعمال کرتے ہیں ملک کی تمکنت اور شان وشوکت کا اظہار ہے جو کسی اور طرح ممکن نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ موجودہ بادشاہت کے وجود کا سہارا ہمیں عجلت پسندانہ انقلابی تبدیلیوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ یہ مختلف الانواع قومیتوں کے درمیان میں تاریخی رشتہ قائم کرتا ہے اور اتحاد اور استقرار کی خوش آئند علامت بھی''۔ (۴)

ہندوستان کی حد تک صرف پنجاب کے یونینسٹ پارٹی کے لوگ ان خیالات سے اتفاق ظاہر کر سکتے تھے جس کے ایک سابق وزیر سر فیروز خاں نون نے بطور انڈین ہائی کمشنر اس جلسہ کی صدارت کی تھی جو مونارکسٹ لیگ نے منعقد کیا تھا۔ عبداللہ یوسف علی ہندوستان میں ہونے والے حالات وواقعات کے رخ سے بری طرح کٹ کر رہ گئے تھے جس وقت وہ مندرجہ بالا کلمات ادا فرمار ہے تھے۔ ہندوستان میں ڈرامائی نوعیت کی تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ ۱۹۳۷ کے انتخابات میں سر سکندر حیات اور ان کی یونینسٹ پارٹی نے مسلم اکثریت والے پنجاب کے علاقوں میں کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن آٹھ دوسرے صوبے جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور جن میں یوپی بھی شامل تھا کانگریس کے پاس چلے گئے تھے۔ کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ شرکت اقتدار سے انکار کر کے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ پنجاب میں تو مسلم لیگ اور یونینسٹ جماعت کے درمیان اتحاد کی صورت بھی بننے لگی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے نزدیک اس طرح کا اتحاد واتفاق دور دراز اجنبی سرزمین میں موجود بادشاہ کے مقابلہ میں ان کے لیے زیادہ

Marfat.com

تحفظ فراہم کرنے کا ذریعہ ہو سکتا تھا۔

عبداللہ یوسف علی کو سلطنت سے جو وابستگی تھی وہ انہیں سر فرانسس ینگ ھسبنیڈ کے قریب لے گئی۔ یہ صاحب پرانے مدرسۂ فکر کے انگریز تھے جن کا عقیدہ تھا کہ برطانیا کی سلطنت کے پس پشت کوئی پُراسرار روحانی مقصد ضرور کارفرما ہے۔ (۵) سر فرانسس نے ایک ہندو سوامی جی سے ملاقات کے بعد بڑے جوش و جذبہ کے ساتھ تمام عقائد اور مذاہب کی ایک موتمر بلانے کا خیال ظاہر کیا۔ (۶) انہوں نے سترہ ممبروں پر مشتمل ایک برٹش نیشنل کونسل بنا ڈالی جس کا مقصد یہ قرار پایا ایک انٹرنیشنل کونسل آف ورلڈ فیلوشپ منعقد کی جائے۔ اس کونسل کا جلسہ یونیورسٹی کالج لندن میں جولائی ۱۹۳۶ میں منعقد ہوا جس کا افتتاح ایڈورڈ ہشتم کے ذاتی پیغام سے ہوا۔ اس کونسل میں واحد مسلمان رکن شیخ عبدالقادر تھے جو یونینسٹ رہ چکے تھے اور ان دنوں لندن میں سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند کے مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ گویا برطانوی حکومت ہندوستان کے بارے میں صرف ان لوگوں سے ہی مشاورت کی قائل تھی جو برطانوی حکومت کے وفاداروں کے تنگ دائرہ کے اندر موجود تھے۔ غالباً شیخ عبدالقادر نے ہی اس کونسل میں عبداللہ یوسف علی کی شرکت کا بندوبست کیا تھا۔ (۷)

عبداللہ یوسف علی کو اس سے اگلے سال جولائی ۱۹۲۷ میں آکسفرڈ میں منعقد ہونے والی ''کانگریس آف فیتھس'' میں مدعو کیا گیا جس میں بدھ مت کے ممتاز اسکالر مونگ اے مونگ (Maung Aye Maung) اور ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ مذہب کے ڈین ولیم پیری نے بھی تقاریر کی تھیں۔ اس کانگریس کے صدر ہربرٹ سموئیل تھے جو اب لارڈ سموئیل ہو چکے تھے اور اس اجلاس میں یہودیت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس کانگریس کے فلسفیانہ مباحث وقت کے سیاسی زمینی حقائق کے سامنے بالکل متضاد کیفیت کے حامل تھے۔

Marfat.com

سر فرانس کی طرح عبداللہ یوسف علی بھی ایک عالمگیر اخوت اور بھائی چارے کے تصور سے جذباتی وابستگی رکھتے تھے اور یہ تصور ان کے اس نقطۂ نظر سے ہم آہنگ تھا جو وہ ہندوستان اور برطانیا کے درمیان تعلقات کے توازن کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے اس عقیدہ اور نقطۂ نظر کے لیے لڑ رہے تھے کہ اگر مذہب کو صحیح طریقہ سے سمجھا جائے تو وہ سچائی، عدل و انصاف اور انسانوں کے مابین بہتر تعلقات پیدا کر کے امن و شانتی کا ضامن بن سکتا ہے۔ (۸) اپنے مقصد اور مشن سے یہی شعوری وابستگی انہیں ستمبر کے مہینہ میں جنیوا لے گئی جہاں ''امن براستہ مذہب'' کے عنوان سے ایک کانفرنس منعقد کی جا رہی تھی، جس کا لیگ آف نیشنز نے اہتمام کیا تھا۔ اس کانفرنس میں ان کو ''ایک عظیم مسلمان'' کا خطاب عطا کیا گیا۔ (۹)

۱۹۲۰ء کے پورے عشرہ میں یوسف علی 'لیگ آف نیشنز' کی حمایت میں بولتے رہے۔ ان کے نزدیک یہ وہ ادارہ تھا جو عالمی توازن اور بین الاقوامی تعاون کے قیام کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ ۱۹۲۸ء میں منعقد ہونے والی لیگ کی کانفرنس میں وہ ہندوستان کے بڑے پر جوش نمائندہ بھی رہے تھے۔ لیگ وقت کے ان چند اداروں میں سے ایک نام تھا جس کا تذکرہ پہلی بار ان کے ترجمہ و تفسیر میں اکتوبر ۱۹۳۶ میں شائع ہونے والی قسط میں بھی آیا جس میں سورۂ نور کی تفسیر شائع ہوئی تھی۔ لیکن لیگ سے ان کی وابستگی اور اس پر اعتماد اس وقت متزلزل ہوئے جب اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا اور لیگ اس سلسلے میں کوئی اقدام نہ کر سکی۔ جولائی ۱۹۳۷ میں شائع ہونے والی قسط میں انہوں نے ''لیگ'' کو ناکام قرار دیا۔ (۱۱) یہ ان کا پہلا خواب تھا، جو بکھر گیا۔

جنیوا میں ہونے والی کانفرنس کا موضوع ''امن براستہ مذہب'' تھا۔ یوسف علی نے اس میں خطاب کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی تھی کہ عالمی امن اور ہم آہنگی سلطنت برطانیا اور امریکا کے تعاون سے ممکن ہو سکتے ہیں ان دونوں ملکوں کی مشترک زبان، انگریزی سیاسی مفاہمت کی کلید بن

سکتی ہے۔ (۱۲)

جنیوا سے واپس لندن جاتے ہوئے عبداللہ یوسف علی فرانسیسی دارالحکومت میں پیرس کی نمائش دیکھنے کے لیے ٹھہرے۔ نمائش میں فلسطین کے پویلین پر ایک بینر لگا تھا جس پر درج تھا " دی لینڈ آف دی جیوز"، یعنی یہودیوں کی سرزمین۔ اسے دیکھ کر انہیں شدید ذہنی صدمہ پہنچا۔ لندن پہنچ کر پہلی فرصت میں انہوں نے فلسطین کے مسئلہ پر پرزوردار انداز میں بات کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۹۳۷ء کے اکتوبر سے سال کے اواخر تک انہوں نے متعدد اجتماعات میں فلسطین کے حوالہ سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی۔

پیل (Peel) کمیشن نے فلسطین کو تقسیم کرنے اور اُس کے نسبتاً زیادہ زرخیز علاقوں میں ایک یہودی ریاست قائم کرنے کی تجاویز پیش کیں جس نے عبداللہ یوسف علی کے دل و دماغ کو جھنجوڑ دیا۔ فلسطین چونکہ برطانوی انتداب کا علاقہ تھا اس لیے عبداللہ یوسف علی کو ان تجاویز پر بڑی سبکی محسوس ہوئی۔ عبداللہ یوسف علی نے کئی مواقع پر ان تجاویز کی مخالفت کی۔ جن اجتماعات میں وہ ان پر تنقید کرتے رہے ان میں لندن میں مشرق وسطیٰ اور شرق اقصیٰ کی ایسوسی ایشن، کیمبرج کی نیو پیس موومنٹ، اور برائٹس کا روٹری کلب شامل تھے۔ اگر محمد علی جوہر اس وقت زندہ ہوتے تو عبداللہ یوسف علی کے اس جذبہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے اور بہت زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے۔ وہ اس پر بھی حیران اور متعجب ہوتے کہ تحریک خلافت کی کتاب کا ایک ورق دوبارہ سامنے آ گیا ہے۔

عبداللہ یوسف علی نے پرزور انداز میں کہا تھا کہ فلسطین جزیرۃ العرب کا حصہ ہے۔ اور کوئی مسلمان جانتے بوجھتے اس کو کسی غیر مذہب کے لوگوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اس تقریر کے دوران میں انہوں نے عربوں کی شورش کے خلاف کیے گئے اقدامات پر بھی شدید نکتہ چینی کی۔ جن

Marfat.com

میں ''اسٹار چیمبر'' یعنی من مانی عدالتی کارروائیاں بھی شامل تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ایسی شہادت کو بھی قبولیت کی قانونی سند دی جا سکے جو باہم مربوط نظر نہ آتی ہو۔ انہی کاروائیوں میں یروشلم کے مفتی پر پابندیوں کا نفاذ بھی تھا۔ (۱۳)

عبداللہ یوسف علی کے جذبات اور احساسات میں یہ شدت شاید اس لیے آئی کہ ایک طرف تو انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے نہ صرف لیگ آف نیشنز پر بیجا اعتماد کیا تھا بلکہ سموئیل ہربرٹ جیسے کئی خشک مزاج برطانوی سیاست دانوں سے بھی ان کی توقعات درست نہیں تھیں۔ یہ سیاست دان کہنے کو تو روحانی برادری کے اعلیٰ مقاصد اور آئیڈیل کی بات کرتے تھے لیکن عمل کی دنیا میں فلسطینیوں کے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتیوں پر خاموش تماشائی بن جاتے تھے۔ (۱۴)

فلسطین کے مسئلہ کے حوالے سے عبداللہ یوسف علی کے دلائل ایک وکیل اور فاضل قانون داں کی فنی مہارت سے مرتب کیے گئے تھے۔ انہوں نے اپنا مقدمہ ان شرائط اور ضوابط کی روشنی میں تیار کیا تھا جو پیرس کی امن کانفرنس کے دوران میں ان کو انتداب اور اس سے متعلقہ امور کے بارے میں براہ راست معلوم ہوئے تھے۔ انہوں نے دلائل کے آغاز میں ہی یہ کہا تھا کہ '' لیگ آف نیشنز نے کسی بھی ملک کو انتداب کی ذمہ داری دیتے ہوئے حقوق ملکیت نہیں دیئے تھے۔ اس طرح برطانیا کو فلسطین کے معاملہ میں بھی ملکیت یا قبضہ کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

''فلسطین کو انتداب (A) اے کے ماتحت رکھا گیا تھا جو خصوصی طور پر اس لیے بنایا گیا تھا کہ اس ملک کے باشندے جنہیں انتداب کے تحت رکھا گیا ہے مساوی طور پر مہذب اور متمدن ہیں۔ لیکن چونکہ وہ سلطنت ترکیہ سے علیحدہ ہو گئے ہیں لہٰذا انہیں حکومت اور نظم و نسق کے لیے کچھ تجربہ درکار ہے۔ یہ 'انتداب' صرف اس وقت تک ہے جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو جائیں۔ جن ملکوں کے انتداب میں انہیں دیا جا رہا ہے یہ ان کا فرض ہے کہ وہ مسلسل

Marfat.com

مشورہ کے ذریعہ انہیں خود حکومت چلانے کے لیے تیار کریں۔ وہ ایک آزاد قوم ہیں۔ عراق اور شام، دونوں ممالک جنہیں انتداب میں دیا گیا تھا، اگر ان کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا تو پھر آخر فلسطین کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے؟ لارڈ بالفور نے اپنی حدود سے آگے جا کر یہ کہا ہے کہ انگلستان یہودیوں کے لیے فلسطین میں اپنا وطن قائم کرنے کے لیے اپنا اثر رسوخ استعمال کرے گا بشرطیکہ ایسا کرتے ہوئے وہاں کے غیر یہودی باشندوں کے حقوق پامال نہ ہوں"۔ (۱۵)

عبداللہ یوسف علی نے اپنے برطانوی سامعین پر بہرطور یہ بات واضح کر دی کہ فلسطین کی تقسیم صریح ناانصافی ہوگی۔ تحریک خلافت کے علمبرداروں کو یہ بات حیران کن لگے گی کہ عبداللہ یوسف علی کو مسلمانوں کے ساتھ کی گئی وعدہ خلافیوں کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ پر لانے میں اٹھارہ برس کیوں لگے؟ لیکن بہر صورت یوسف علی نے اپنے اوپر لگنے والے الزام سے خود کو اس طرح بری کرا لیا کہ انہوں نے اس مقصد کے لیے ایک ایسے وقت آواز بلند کی جب نہ جوہر موجود تھے اور نہ امیر علی جو اس مسئلہ کی تشہیر اور اشاعت کے لیے آگے آتے۔ ان کی طاقت لسانی، اور مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر گرفت ایسی تھی کہ ایک موقع پر کیمبرج میں ان کو فلسطینی رہنما جمال حسینی کی جگہ تقریر کرنی پڑی۔ (۱۶)

"لیگ آف نیشنز" کا جو آئیڈیل یوسف علی کے ذہن میں بنا تھا وہ انہوں نے ختم کر دیا لیکن برطانیا اور بادشاہ سے وفاداری اور محبت کا معاملہ ان کی شخصیت کی تشکیل میں گہرا جاگزیں تھا اور اتنی آسانی سے چھوٹ نہیں سکتا تھا جس طرح انہوں نے لیگ کے آئیڈیل کو ترک کیا تھا۔ حکام اور حکومت پر ان کی تنقید محدود اور نپی تلی رہتی تھی اور اس قسم کے بیان سے آگے نہیں جاتی تھی جیسے" امپیریل گورنمنٹ نے تقسیم (فلسطین) کے اصول کو تسلیم کر کے مسلمانوں کے لیے حیرت اور دکھ

Marfat.com

دینے کا سامان کیا ہے''(۱۷)

انہوں نے ایک نظم فلسطین کے عنوان سے لکھی جو کیفیت کے اعتبار سے لطیف اور اشاراتی تھی اس طرح انہوں نے تیز وتند لہجہ سے احتراز کو برقرار رکھنے میں استقلال کا مظاہرہ کیا تھا۔نظم کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

''کتنی عجیب مسرتیں اور المیے ہیں اور کیسے آنسو اور قہقہے ہیں
جو زندگی کے تانے بانے میں بُن دیئے گئے ہیں
آرزوں اور اندیشوں کی آمیزش نے کیسے سنسنی خیز ہمت شکن واقعات کو جنم دیا ہے
محبت اور جنگ کے کیسے المناک خواب دیکھے جاتے ہیں؟
سیاسی سازشوں نے تیری پیشانی کو کس طرح زخموں سے داغ دار کر دیا ہے؟
''اے مقدس ارضِ فلسطین اے امن وسکون کی سرزمین مجھے بتا
ان تکلیف دہ ایام میں کب اور کیسے امن تیرے حصے میں آئے گا؟
صرف ایک ہی وہ طریقہ اور راستہ ہے جو تیری زمین پر امن وسکون لاسکتا ہے۔
اور وہ یہ ہے کہ قدیم زمانے سے حاصل شدہ حقوق کو غصب نہ کیا جائے۔
باہر والے اپنا غاصبانہ قبضہ ختم کر دیں
سکون کی زندگی فراہم کر دی جائے جس کی وہ جائز حقدار ہے''۔(۱۸)

اس کے برعکس جناح نے شاعری سے مبرا صاف لفظوں میں اپنی برہمی کا اظہار کیا تھا۔ ان کے الفاظ ہیں کہ'' حالیہ زمانے میں برطانیا نے اپنے دوستوں کو بھیڑیوں کے سپرد کر دیا ہے اور اپنے کیے ہوئے سارے وعدے اور عہد پامال کر ڈالے ہیں۔ برطانیا کے لوگوں سے معاملات طے کرنے میں صرف وہی کامیاب ہو سکتے ہیں جن کے پاس قوت و طاقت ہے اور وہ اس کا

Marfat.com

استعمال بھی کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شرقِ اوسط میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہوسکتا جب تک فلسطین کے عربوں کے ساتھ دیانت داری کے اصول پر صاف صاف معاملہ نہیں کیا جاتا''۔(۱۹)

۱۹۳۷ء میں ہونے والے عالمی سطح پر احتجاج کے طوفان نے پیل کمیشن کی تجاویز کو عارضی طور پر معطل کردیا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۳ء تک چلتا رہا یہاں تک کہ صیہونی لابی نے اپنی کوششوں سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں فلسطین میں یہودی ریاست کے تصور کو دوبارہ زندہ کردیا۔

۱۹۳۷ء کے دسمبر میں عبداللہ یوسف علی نے عیدالفطر لاہور میں منائی۔ انہوں نے اپنے مکمل ترجمہ وتفسیر قرآن کی فہرست مضامین تیار کرلی تھی جو محمد اشرف کے سپرد کردی گئی۔ انہوں نے تازہ ایڈیشن کی طباعت کی تیاری کو بھی دیکھا بھالا۔ اس موقع پر اپنے لاہور میں قیام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے انجمن حمایت اسلام سے راہ ورسم اور تعلقات کی بحالی کے لیے بھی کوشش کی اور ایک جلسہ میں انجمن کی ان حالیہ کوششوں کی بھی تعریف کی جو انہوں نے قرآن مجید کی اشاعت کے لیے کی تھیں۔(۲۰) بہت سے تقسیم انعامات کے جلسے ہوئے جس میں انہوں نے شرکت کی یا صدارت کی۔ ان جلسوں میں اکثر و بیشتر شیخ عبدالقادر ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ دونوں نے یوم اقبال کی تقریب میں بھی شرکت کی جو انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ نے منعقد کروایا تھا۔ ایک عوامی جلسہ وائی ایم سی اے ہال میں ہوا جس کی صدارت شیخ عبدالقادر نے کی تھی اور عبداللہ یوسف علی نے ''طالب علمی کے زمانے کی مراعات اور ذمہ داریاں'' پر تقریر کی تھی۔ لاہور آرٹ سرکل سے بھی انہوں نے اپنا رابطہ بحال کرلیا اور فرانسیسی مصور میلت (Millet) کے فن پر تقریر کی جس میں انہوں نے وہ تمام مواد استعمال کیا جو گزشتہ سال دورۂ فرانس کے موقع پر جمع کیا تھا۔ یوسف علی کے پاس لالٹین کی مدد سے دکھائے جانے والے وہ سلائیڈ بھی تھے جن میں، میلت کے

Marfat.com

اسٹوڈیو اور اس کی اہم تصاویر کو دکھایا گیا تھا۔ (۲۱)

اس دوران میں عبداللہ یوسف علی کی اقبال سے بھی آخری ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک ساتھ ایک مصور کاظمی کی تصویروں کی نمائش دیکھی۔ اقبال نے کاظمی کو بعد میں ایک تعریفی خط بھی لکھا۔ اس خط میں یوسف علی کا ذکر بھی بڑے اچھے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''میں نے علامہ یوسف علی کی معیت میں آپ کے فن کے وہ نمونے دیکھے جو ''شکوہ اور جواب شکوہ'' کے موضوع پر آپ نے مولانا حالی کی یاد میں ہونے والی نمائش پر پیش کیے تھے۔ میرا اور مبصر زمانہ علامہ یوسف علی دونوں کا یہ خیال ہے کہ اگر آپ مزید محنت اور مشقت سے اس فن پر اپنی گرفت بڑھا لیتے ہیں اور اس پر قدرت کاملہ حاصل کر کے اپنا فن عالم اسلام کے سامنے لائیں گے تو آپ مصوری کے نئے اسلوب کو متعارف کرا سکیں گے اور ایک نئے مدرسۂ فن کے بانی ہوں گے۔ (۲۲)

اقبال کی وفات ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ کو ہوئی اور یہ خط اس سے چند روز پہلے بھیجا گیا تھا۔ علامہ اقبال اور علامہ عبداللہ یوسف علی کے باہمی راہ ورسم اور لطف و کرم کے انداز ہمیشہ کی طرح برقرار تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دونوں کے سیاسی اختلافات کی خلیج بڑی گہری تھی۔ اقبال کے انتقال پر عبداللہ یوسف علی نے ''دی ٹائمز'' میں تعزیتی نوٹ لکھا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں:

''علامہ اقبال کی وفات سے ہندوستان اپنے دو عظیم شاعروں میں سے ایک سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ دونوں شاعر فلسفی بھی ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا فلسفہ گیان دھیان پر مبنی اور متصوفانہ ہے لیکن اقبال کا فلسفہ صوفیانہ انداز ہی میں تصوف سے بغاوت پر مبنی ہے۔ اقبال کے نزدیک صوفیوں کا تصوف اسلامی سیاست کے زوال کا سبب ہے۔ اس نقطۂ نظر کا تاریخی اعتبار سے دفاع کرنا مشکل ہے۔ اگرچہ آخری زمانے میں خود تصوف کا انحطاط و زوال اس رائے کو کچھ تقویت ضرور فراہم کرتا ہے۔ مغربی تہذیب کے کمزور پہلوؤں پر ان کی مضبوط تنقید مزید موثر ثابت ہو سکتی

Marfat.com

تھی اگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوئی ایسی تعمیری بنیاد بھی فراہم کر دیتے جس پر وہ ایک متحد جدید ہندوستان کی تعمیر کے عمل میں فعال کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتے''۔ (۲۳)

فروری ۱۹۳۸ء میں عبداللہ یوسف علی نے لاہور سے یو پی کی جانب سفر کیا۔ وہ علی گڑھ آئے کہ یونیورسٹی کورٹ کے معاملات کی طرف توجہ دے سکیں۔ ۱۰ رفروری ۱۹۳۸ء کو وہ گورنمنٹ ہاؤس گئے اور بعدازاں کانگریس کے صدر جواہر لال نہرو سے ملاقات کی۔ یوسف علی نے نہرو سے ملاقات میں آزادی کے حصول میں جلد بازی سے اجتناب پر زور دیا۔ ان کا ہمیشہ کی طرح روشن رجائیت کا انداز اس صوبہ میں بھی قابل تعریف چیزوں کو دیکھ رہا تھا جہاں فرقہ وارانہ کشیدگی نے ماحول کو داغدار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا ''بعض قوتیں (ان کا اشارہ کانگریس حکومت کی پالیسیوں کی جانب تھا) حرکت پذیر ہو گئی ہیں جن کے نتیجہ میں مکمل سیاسی وسماجی زندگی بروئے کار آئے گی اور ہندوستان میں پہلے سے زیادہ سماجی و معاشی عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ وجود میں آسکے گا''۔ (۲۴)

اس دوران میں جناح بھی یو پی میں تھے۔ لیکن دونوں کی ملاقات کا کوئی ریکارڈ نہیں ملا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کے نام جناح کا پیغام بالکل مختلف تھا ان کا کہنا تھا کہ برطانیا کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی سے نجات کے بعد ہندوؤں کی حکومت کے ہاتھوں تذلیل کا ایک نیا دور سامنے آسکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ۳۸-۱۹۳۷ کے فسادات ایک مختلف عنوان سے سہی ایک نوع کی خانہ جنگی ہی کہے جا سکتے تھے جن سے تحفظ کی صرف ایک ہی راہ تھی۔ ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان شریعت کی رہنمائی میں ایک فطری سیاسی وحدت بن جائیں۔ (۲۵) جبکہ عبداللہ یوسف علی کی رائے میں اقبال اور جناح دونوں کے پاس ہندوستان کے حوالے سے کوئی بھی تعمیری تجاویز موجود نہیں تھیں۔

Marfat.com

جب عبداللہ یوسف علی کی اپریل میں لندن واپسی ہوئی تو یہ اُن کا پہلا ہوائی سفر تھا۔ کراچی سے لندن تک کا سفر ڈھائی دن کا تھا جب کہ ۱۸۹۳ء میں جب وہ بمبئی سے لندن آئے تھے تو سفر میں چار ہفتے لگے تھے۔ برطانوی حکومت عبداللہ یوسف علی کو ابھی تک مسلمانوں کا ممتاز ترین نمائندہ تسلیم کرتی تھی۔ ایک صاف ستھری مسلمان شخصیت جن پر عوامی اجتماعات میں ہندوستان اور سلطنت کے تعلقات کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے ہمیشہ اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ جب اگست میں سعودی فرمانروا امیر سعود ابن عبدالعزیز لندن تشریف لائے تو ان کے افسر تقریبات کے طور پر عبداللہ یوسف علی ہی کا انتخاب کیا گیا تھا۔ وکٹوریہ اسٹیشن پر استقبال کے لیے کمیٹی میں لارڈ فریڈرک کیمبرج، مصری سفارت خانہ کے ناظم الامور اور افغانی وزیر شامل تھے۔

عبداللہ یوسف علی دلی کیفیات ظاہر نہ ہونے دینے کے ماہر تھے۔ باطن میں وہ کیسی ہی جذباتی کشمکش یا بحرانی کیفیت میں کیوں نہ ہوں، پبلک کے سامنے ان کا چہرہ ہمیشہ اعتماد سے بھرپور نظر آتا تھا اور وہ مسلمانوں کے معاملات کے چیمپئن اور ممتاز ادیب اور عالم کی حیثیت سے اپنا کردار بخوبی نبھاتے تھے۔ لندن میں پال مال پر واقع نیشنل لبرل کلب ان کے مشاغل کا مرکز تھا۔ ومبلڈن میں ان کی اقامت گاہ کو یہ حیثیت حاصل نہیں تھی۔ اپنی پہلی بیوی کے بچوں سے وہ مستقلاً کشیدہ ہی رہے تھے اور آخر کار کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے انتہائی سخت اور درشت الفاظ میں اپنے وصیت نامہ میں ان بچوں کا ذکر بھی کیا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس کے کچھ عرصہ بعد معصومہ یعنی ان کی دوسری بیوی سے بھی ان کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اپنی بیوی کے صبر و تحمل اور تعاون کے بغیر جس کا مظاہرہ اس نے ان کے بیٹے راشد کی دیکھ بھال کی شکل میں کیا تھا ان کے لیے یکسوئی کے ساتھ قرآن کے فاضلانہ مطالعہ اور اس کی تفسیر و ترجمہ کا کام کرنا ممکن نہ ہوتا۔ عبداللہ یوسف علی انسانی تعلقات اور جذبات و احساسات کے بارے میں فاضلانہ گفتگو کر سکتے تھے اور لکھ بھی سکتے تھے لیکن ذاتی طور پر طویل مدت کے پائیدار روابط قائم کرنا ان کے لیے

Marfat.com

آسان ثابت نہیں ہوا۔ ایک بار طلبہ کے ایک گروپ سے خطاب کرتے ہوئے یوسف علی نے کہا تھا ''یہ بات یاد رکھیئے کہ روزگار اور زندگی کے مشاغل سے کہیں بڑھ کر اہمیت کردار کی ہے''۔ میں ایک تعلیم یافتہ شخص کا امتحان اس کی معلومات کے حوالہ سے نہیں لیتا ہوں بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ اس کے اندر دوسرے لوگوں سے محبت کرنے، انہیں سمجھنے پرکھنے اور ان کی خوبیوں کا اعتراف کرنے کی کتنی صلاحیت ہے اور پھر یہ بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کس درجہ اپنی صلاحیتوں کو نکھار کر دوسروں کو ان کا معترف بنا سکتا ہے''۔ (۲۶)

عبداللہ یوسف علی تحریر وتقریر کے ذریعہ اپنی بات مؤثر طریقے سے کہنے میں ماہر تھے اور اس حوالہ سے ان کی ذہانت اور جولانیِ طبع اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ لیکن ان کی شخصیت میں کہیں کبھی نہ جھکنے والا صلبی عنصر بھی تھا جو خاندانی تعلقات اور گھریلو زندگی کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا تھا۔ عرفان ذات اور دوسروں سے محبت کرنے کے عمل میں جو تعلق ہے وہ ایک خوبصورت فکری خیال تو ضرور ہے لیکن اپنی حد تک وہ اس کو ایک خیال سے آگے نہ لے جا سکے۔ وہ انگریزی کا ایک لفظ (Intimacy) یعنی دلی قربت کا اکثر استعمال کرتے تھے۔ گویا کہ یہ کوئی شاعرانہ آئیڈیل ہو۔ لیکن خاندانی رشتوں میں جو قربت پائی جانی چاہیے وہ یوسف علی کو بچپن میں حاصل ہو سکی اور نہ وہ کبر سنی میں اسے تلاش کر سکے۔ راشد جواب ۱۶ برس کا ہو گیا تھا اپنے ممتاز و مشہور باپ کو حالیہ برسوں میں بہت کم دیکھ پایا تھا۔ عبداللہ یوسف علی کا سابقہ تنہائی اور مایوسی کے احساسات سے تھا۔ یہ وہ احساس مایوسی نہ تھا جو مسلمانوں کی حالت زار کو دیکھ کر یا ہٹلر کے جنگی جنون کو دیکھ کر پیدا ہوا ہو۔ بلکہ ایک قسم کی ذہنی تکان اور پژمردگی تھی جو کسی کام میں عدم دلچسپی یا ناکام کوشش کی وجہ سے طاری ہو جاتی ہے۔ اس پژمردگی سے ترجمہ وتفسیر قرآن کی تکمیل کا عظیم کام بھی انہیں نجات نہیں دلا سکا تھا۔ نومبر ۱۹۳۸ میں انہیں لندن کی سوسائٹی برائے مطالعۂ مذاہب کے سامنے ایک مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں انہوں نے اپنے اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ''ہماری روح

Marfat.com

بدن میں مقید ہے اور ہمارا ذہن صرف مادی چیزوں کی تصویر کشی کر سکتا ہے۔ ہمارے گردوپیش میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو ناپائیدار اور مدہم پڑ جانے والی ہیں۔ بدشکل یا بدوضع ہیں یا سچائی سے بہت دور ہوتی ہیں۔ نزاع، ناانصافی، ناہمواری، درد و اذیت کی بھی کمی نہیں۔ دکھ اور مایوسیاں بھی ان گنت ہیں۔ انسان کبھی تو یہ سمجھنے لگتا ہے کہ گویا وہ ساری مخلوقات کا آقا اور مالک ہے لیکن جوں جوں اس کے فہم اور شعور میں اضافہ ہوتا ہے وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش موجود کائنات میں جاری و ساری قوتوں کے درمیان ایک موہوم سے نقطہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ تب اسے یہ احساس ستاتا ہے کہ وہ اس لامحدود اور وسیع کائنات میں ایک بے یارو مددگار مضطرب وجود ہے جس کا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ کوئی حقیقی ہمدم و دمساز۔ اس کائنات کی ان گنت اور لامحدود جہتوں میں سے وہ بہ مشکل تین جہتوں کو اپنی گرفت میں لاتا ہے۔ کائنات کا معمہ اس کے دماغ پر اس درجہ حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ چیخ پڑتا ہے اور کہنے لگتا ہے' سب کچھ لایعنی اور بے مقصد ہے'۔ اور اس طرح کی الزام تراشی میں خود اپنی ذات کو بھی شامل کر لیتا ہے''(۲۷) عبداللہ یوسف علی کی خودنگہی و دروں بینی ان کی نفسیاتی ساخت کا ایک حصہ تھی جو اپنی ذات کا ایک مثالی تصور رکھتی تھی۔

۹ نومبر ۱۹۳۸ کو عبداللہ یوسف علی نے رائل سوسائٹی آف لٹریچر میں ایک لیکچر دیا جس میں وہ بظاہر اپنے اور اقبال کے فلسفہ حیات کے فرق کو نمایاں کرتے نظر آتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

''اقبال کی تشکیل کردہ کائنات میں ہم کشمکش اور جدوجہد کی تلاش میں رہتے ہیں، وہاں سکون اور اطمینان کا وجود نہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں ان کے فلسفۂ شعری کا مفہوم و مدعا ایک مسلسل اور جامع حرکت پذیری ہے جو زندگی کو کشاں کشاں آگے بڑھاتی ہے۔ شخصیت کشمکش کی کیفیت سے عبارت ہے۔ اور یہی کشمکش کی کیفیت زندگی کو دوام بخشتی اور اسے لافانی بناتی ہے۔

Marfat.com

ہمیں اس جدوجہد میں شریک ہونا چاہیے جو اس کشمکش کی کیفیت کو برقرار رکھنے میں مددگار ہو۔ اس طرح کہ عالم ہمارے اندر جذب ہو جائے، ہم اس میں جذب نہ ہوں۔ عشق اپنے اندر سمیٹ لینے اور جذب کر لینے کا نام ہے، اپنی محبت کے مرکز میں جذب ہو کر فنا ہو جانے کا نام نہیں۔ اقبال ٹینی سن سے متفق معلوم نہیں ہوتے۔ کہ اس انگریزی شاعر کا تو کہنا تھا:

> محبت نے زندگی کے ساز پر پوری قوت سے مضراب استعمال کر ڈالا اور پھر اپنی ''خودی'' کے تار پر بھی نغمہ چھیڑا اور آخر کار کپکپاتے ہوئے وجود کے ساتھ موسیقی میں شامل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

''اس طرح اقبال صوفیوں کے اس تصور سے بھی متفق نظر نہیں آتے جس میں ذات باری تعالیٰ میں 'فنا' کا مقام آتا ہے۔ وہ مابعد الطبیعاتی تصوف کے علم بردار صوفیاء سے کھلی جنگ کرتے دکھائی دیتے ہیں بالخصوص حافظ اور سعدی سے تو انہیں بنیادی اختلاف ہے جو خدا تک پہنچنے کے لیے 'خودی' کی نفی کرنے کی دعوت دیتے ہیں''۔ (۲۸)

عبداللہ یوسف علی نے صوفیاء کی غائت کی تعبیر نفیٔ ذات سے کی ہے جس کا طریقہ اپنی 'انا' سے دستبردار ہو جانا تھا۔ ان کے نزدیک 'تصوف' کی یہ تعبیر شخصیت میں توازن قائم رکھنے کے لیے ضروری تھی جس میں 'انا' پوری شدت سے موجود تھی اور ساتھ ہی 'تقدیر' کے وجود کا بھی بہت قوی شعور تھا۔ اپنے خوشگوار لمحوں میں انہوں نے صوفیاء کے بارے میں نسبتاً زیادہ متوازن نقطۂ نظر پیش کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا'' وہ معاشرہ میں چلتے پھرتے ہیں اور لوگوں سے ربط وضبط قائم کرتے ہیں۔ وہ تاجر بھی ہیں اور حکمرانی بھی کرتے ہیں، سیاحت میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور گوناگوں پیشہ ورانہ مصروفیتوں میں انہماک بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا مقصد دوسروں کی مدد کرنا اور انسانیت سے روابط کو قائم کرنا ہوتا ہے''۔ (۲۹) لیکن بہر صورت یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ

Marfat.com

یوسف علی کی پیچیدہ اور گھمبیر شخصیت میں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی درجہ میں ایک منفی رواقیت کا عنصر ضرور موجود تھا جو کسی اصول اور ضابطہ کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا اور کسی عظیم تر کل میں اپنی ذات کو غرق کردینے کا متلاشی رہتا تھا، جس کا ایک مظہر شخصیت پرستی کا وہ رویہ بھی ہوسکتا ہے جو ۱۹۱۴ میں جارج پنجم سے ان کی والہانہ وابستگی کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔

سیر وسفر عبداللہ یوسف علی کو اس افسردگی اور حزنیہ کیفیت سے نجات دلانے کا بہترین وسیلہ تھا۔ ۱۹۳۸ء میں بحیثیت ایک اسلامی اسکالر ان کی شہرت بحرِ اوقیانوس کے دوسرے سرے تک پہنچ گئی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ ان کا ترجمہ وتفسیر قرآن امریکا میں نیویارک کے ناشر ''ہیفنر'' اور کیمبرج -میساچوسٹس میں ''مرے'' نے شائع کیا تھا۔ وہ ۱۲ر نومبر ۱۹۳۸ء کو لندن سے کناڈا کے دورہ پر روانہ ہوئے۔ اس کا اہتمام کناڈا کی ''نیشنل کونسل آف ایجوکیشن'' نے کیا تھا۔ اسی ادارہ نے ۱۹۳۲ میں بھی ان کے سفر کا اہتمام کیا تھا۔ وِنی پیگ کے شہر میں ان کا استقبال تعلیم کے نائب وزیر نے کیا۔ اور اگلے تین مہینوں کے دوران انہوں نے متعدد لیکچرز دیئے اور پریس اور ریڈیو کو کئی انٹرویو بھی دیئے جو بالخصوص ہندوستان کے امور سے متعلق تھے۔ ایسے بہت سے مواقع بھی میسر آئے جہاں انہوں نے اسلام اور فلسطین وغیرہ کے مسائل کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ انہوں نے ان خطرات پر بھی گفتگو کی جو برطانوی سلطنت کو جرمنی اور جاپان کی جانب سے لاحق تھے۔ اور کناڈا کے بین الاقوامی امور کے ادارے میں بھی کئی اجتماعات سے خطاب کیا۔ کناڈا کی پہلی مسجد جو ایڈمنٹن میں واقع ہے اس کا افتتاح بھی عبداللہ یوسف علی نے دسمبر ۱۹۳۸ء میں کیا۔ یوسف علی کو اس کا نام تجویز کرنا تھا اور غالباً اپنے بیٹے کے نام کی نسبت سے انہوں نے اس کا نام ''مسجد راشد'' تجویز کیا۔

ان کے دورہ کا پروگرام بھرپور تھا۔ مانٹریال میں ان کے خطاب کا موضوع ''عقیدہ

Marfat.com

اسلام'' تھا۔ دوسرے کئی شہروں میں انہوں نے ''نئے حکمرانوں کے زیر اثر ہندوستان'' کے موضوع پر تقریر کی۔ فورٹ ولیمز میں انہوں نے جو تقریر کی اس کا عنوان ''عصر حاضر میں اسلام کا مقام'' تھا۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کے آتے آتے یوسف علی کناڈا کے وسطی علاقوں میں پہنچ گئے تھے اور منی ٹوبا اور سسکیچیون کے سامعین کے سامنے ''اخلاقی ارتقاء اور سائنسی اور مادی ترقی'' جیسے موضوعات پر خطاب کر رہے تھے۔ یہ سردی کی شدت کا زمانہ تھا۔ اخبارات میں ان کے حوالے سے گرما گرم روداد یں شائع ہو رہی تھیں۔ ان رپورٹوں میں ان کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا گیا تھا ''وہ متوسط قد و قامت اور مضبوط جسم کے مالک ہیں، بال سفید اور خوبصورت ہیں اور کچھ کچھ چھدرے ہو رہے ہیں ان کا انداز گفتگو قدرے تیز اور ذرا سی گھبراہٹ کا مظہر ہے۔ وہ انتہا درجہ کی نرمی کے ساتھ بہت صاف بات کہتے ہیں۔ ان کی انگریزی باوجود اس کے کہ یہ ان کی مادری زبان نہیں ہے انتہائی خوبصورت ہے۔ ان کے الفاظ کا انتخاب بڑا نپا تلا ہوتا ہے اور ساتھ ہی فصاحت کا بھرپور مظہر بھی۔ انگریزی ادب کے بارے میں ان کا دائرہ علم بہت عمیق اور وسیع ہے اور انہوں نے ذاتی طور پر انگریزی ادب کو اپنے انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن کے علاوہ بھی بہت کچھ دیا ہے''۔ (۳۰)

وہ سلطنت برطانیا کی جانب سے ہندوستان کے انتہائی اچھے سفیر ثابت ہوئے۔ ان کی دلکش عوامی شخصیت اور اس پر مستزاد ان کی خطابت کے کمالات کا نتیجہ تھا کہ مختلف افراد اور تنظیموں کی جانب سے ان کے نام بے شمار خطوط آئے جن میں ان کی مدح و ستائش کی گئی تھی۔ نووا اسکوشیا (Nova Scotia) کی اکیڈیا (Acadia) یونیورسٹی کے صدر نے ان کے نام اپنے خط میں لکھا ''شاید ہی اس سے پہلے کسی کے لیکچرز اور خطاب کو سامعین نے آپ کی تقریر سے بڑھ کر پسند کیا ہوگا'' ٹورانٹو کے ایک ادارے نے ان کو اپنے وقیع مجلّے کا سالنامہ ارسال کیا جس میں ان کے دورے کے بارے میں یہ لکھا گیا تھا۔ ''ان کی شخصیت انتہائی پر کشش تھی۔ جونہی اسٹیج پر آ کر وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر مسکرائے ہم ان سے مسحور ہو کر رہ گئے۔ لیکن جب انہوں نے تقریر شروع کی تو ہمیں

Marfat.com

اندازہ ہوا کہ جو شخص ہمارے سامنے کھڑا ہے وہ کیسی عظیم المرتبت شخصیت ہے اور اس کا علم و فہم کتنا بلند ہے۔ اور اس کے باوجود وہ کتنا سادا اور بے ساختگی کا انداز رکھتا ہے''۔ عبداللہ یوسف علی اپنی تعریف و توصیف سے بہت محظوظ ہوتے تھے اور ایسے تمام اخباری تراشے بڑی حفاظت سے رکھتے تھے۔ کناڈا ان کو بہت پسند آیا تھا۔ ایک تنظیم کے نام خط کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا ''کناڈا میں جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا ہے وہ یہاں کی شباب سے بھرپور توانائی اور تازگی کا احساس ہے۔ ہم سب ایک ہی سلطنت کے اجزاء ہیں۔ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ ہمارے اپنے مختلف ممالک بھی اسی طرح محسوس کرنا سیکھیں گے اور اس طرح دوستی کے روابط رکھیں گے جس کا اظہار ہم انفرادی طور پر کرتے ہیں''۔ (۳۱) حیرت اور تعجب اس امر پر ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف بڑے بڑے جلسوں کے سامعین ان کی شخصیت سے متاثر ہوتے تھے اور اجنبی لوگ بھی ان کے سامنے لطف و راحت محسوس کرتے تھے لیکن یہ ساری کیفیت صرف عوامی تقریبات تک ہی محدود تھی۔ دوسری جانب تنہائی کے لمحات میں وہ حقیقتاً بالکل تنہا ہوتے تھے۔

عبداللہ یوسف علی کی ہندوستان میں دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے لاہور کے اخبار ''ایسٹرن ٹائمز'' کے لیے اپنے کناڈا کے دورے کے تجربات اور مشاہدات پر مشتمل سلسلہ وار مضامین لکھے جس میں انہوں نے کناڈا کے انگریزی اور فرانسیسی بولنے والوں کی تقسیم کا ہندوستان کے ہندو مسلم روابط سے موازنہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک کناڈا میں اختلاف کے باوجود ہم آہنگی اور توازن تھا جب کہ ہندوستان میں اختلاف فرقہ واریت کا رنگ لیے ہوئے تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو بحیثیت اقلیت (اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے اور منوانے کے لیے) بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت تھی۔ کناڈا کے فرانسیسی منظم تھے اور ان کا نظم مذہبی اور سیاسی دونوں دائروں میں موجود تھا جبکہ یوسف علی کے مطابق ''ہمارے مسلمان غیر منظم ہی نہیں ہیں بلکہ انا پرستی کا بھی شکار ہیں''۔ (۳۲)

Marfat.com

جب عبداللہ یوسف علی فروری ۱۹۳۹ء میں لندن واپس آئے تو گویا ہجرت کرنے والے موسمی پرندوں کی طرح لندن میں ان کا قیام بھی مختصر تھا۔ اگلے چھ ماہ کے بعد وہ ایک بار پھر سمندری سفر پر روانہ ہو گئے۔ پہلے کی طرح وہ زیادہ تر عرصہ سنٹرل لندن میں نیشنل لبرل کلب میں قیام پذیر رہے اور ومبلڈن میں نمبر ۳ مینسل روڈ کے مکان میں قیام نہیں کیا۔ مئی کے مہینے میں برطانیا عظمیٰ کی مسلم سوسائٹی نے بیکر اسٹریٹ پر واقع ''پورٹمین رومز'' میں عید میلاد النبی کی تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ ایک بھرپور تقریب تھی جس میں عبداللہ یوسف علی مہمان مقرر تھے۔ (۳۳)

عبداللہ یوسف علی کا اضطراب طبع اور سیمابیت اب ایک ایسے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھی جو ان کو چند مہینوں سے زیادہ کسی ایک مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتی تھی۔ ستمبر میں برطانیا کے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ سے صرف دو دن پہلے وہ لندن سے روانہ ہوئے۔ اس وقت وہ سڑسٹھ برس کے تھے لیکن پھر بھی مہم جوئی کے لیے آمادہ تھے۔ وہ بحری جہاز ایس۔ ایس سڑیتھیڈن سے سفر کر رہے تھے جو بحر ہند پہنچنے تک ہر رات 'بلیک آؤٹ' میں سفر کرتا رہا۔ کئی دن تک تو مسافروں کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ کسی بندرگاہ کی جانب جا رہے ہیں اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ ان کا سفر نہر سوئز کے راستے سے ہوگا یا وہ جنوبی افریقہ کے گرد چکر لگا کر ہندوستان پہنچیں گے۔ ایک سے زیادہ بار ان کا سامنا آبدوز کشتیوں سے بھی ہوا۔ (۳۴) اس دوران میں انہوں نے ایک نظم بھی لکھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اِس صورتِ حال میں کس کشمکش سے گزر رہے تھے۔ نظم کا مفہوم ملاحظہ ہو۔

''ہم کو اس بندرگاہ کی خبر نہ تھی جس کی جانب ہم سرگرم سفر تھے
نہ ہمیں اپنے راستہ کا کوئی علم تھا
ہم سیاہ گہری تاریکی میں لپٹے سمندر میں چلے جا رہے تھے

Marfat.com

اور ایک چالاک وعیار اور چھپے ہوئے دشمن کے مقابلہ کے لیے مستعد تھے

ہم کبھی ہمہ وقت اور کبھی بار بار اپنی حفاظتی پٹیاں باندھتے تھے

اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے کے دوران میں اور کھانے پینے اور تفریح کے اوقات میں بھی

نو پونڈ وزنی گولوں والی توپ پر ہمہ وقت کسی آدمی کی ڈیوٹی لگی رہتی تھی

دن یا رات ہم سب دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھتے رہتے تھے

ایک مہینہ تک مسلسل ہم دنیا سے اوجھل رہے جیسے کسی بادل نے ہمیں نگل لیا ہو

ہم سب ایک ہزار کے لگ بھگ پریشان حال افراد تھے جن میں عورتیں بھی تھیں مرد بھی، جوان بھی اور بوڑھے بھی

ہم جہاں سمندر میں جا رہے تھے وہاں کوئی اور جہاز نہ تھا اور ہم چھپتے چھپاتے آگے بڑھ رہے تھے

روشنیاں گل کر دی گئی تھیں، نقشے لپیٹ دیے گئے تھے اور ہماری خبر کسی کو نہ تھی

آخر ہم نے سکون کا سانس لیا اور خوش قسمتی سے ایک بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئے اور روشنیاں واپس آ گئیں

ہم نے اس نقرئی شاہراہ والی آبنائے کی روشنی میں سفر شروع کیا جو مشرق و مغرب کو ملاتی ہے

اور قدیم سیناء کی وادی کے اتنے قریب سے گزرے کہ

ہماری خوشی کی آوازیں وہاں پہنچ سکتی تھیں۔

ہمارے جہاز کے جوانمرد اور جراءت مند ملاحوں کو سلام ہو

جہاز کے قائد اور کپتان کو بھی ہمارا سلام

Marfat.com

جس نے مہارت اور جرأت سے یہ سفر طے کیا۔

ہم چمکیلی دھوپ والے ساحلوں کے قریب آ گئے ہیں اور

پورے انکسار اور عاجزی سے اپنے پرچم سے وفاداری کے اعلان کی تجدید کرتے ہیں۔

ہم صداقت کے علم بردار اور ہمہ وقت تیار اور مستعد رہیں گے'' (۳۵)

اس سے پہلے عبداللہ یوسف علی پہلی جنگ عظیم کے دوران بھی اسکینڈے نیویا کا ایک خطرناک سفر دفتر خارجہ کی درخواست پر کر چکے تھے۔ اس بار بھی اس امر کا قطعی کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ جنگ سے چند دن پہلے ان کو یونہی بلا سبب سفر کی اجازت دی گئی ہو سوائے اس کے کہ ان کا سفر پروپیگنڈے اور فوجی بھرتی کے مقاصد کے لیے ہوا ہو۔

دہلی میں ان کی ایک ملاقات سر سکندر حیات سے ہوئی جو ابھی تک پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ سکندر کا رابطہ براہ راست ونسٹن چرچل سے تھا جس کا مقصد فوج میں ہندوستانیوں کی بھرتی تھا۔ اس سلسلے میں وہ ہوائی سفر کر کے قاہرہ بھی پہنچے تھے تا کہ وہاں چرچل سے مذاکرات کر سکیں۔

دوسری عالمی جنگ نے پچیس سال پہلے ہونے والی جنگ عظیم کی طرح عبداللہ یوسف علی پر اس طرح اثر کیا جیسے ان کے دل و دماغ میں بجلیاں بھر گئی ہوں۔ وہ آگے بڑھنے اور ایک مقصد کے لیے کھڑے ہونے کے لیے مستعد نظر آتے تھے۔ وہ علی گڑھ بھی گئے اور دہلی میں اینگلو عربک کالج میں بھی انہوں نے ۱۴؍ اکتوبر کو تقریر کی جس میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کو جنگ کی مساعی میں برطانیا کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ (۳۶) ۱۶؍ اکتوبر کو وہ لاہور آئے اور دس دن یہاں رہے۔ اس کے بعد وہ برطانیا واپس جانے کے لیے بمبئی روانہ ہو گئے۔

واپس جا کر انہوں نے وزارت اطلاعات کی فرمائش پر پروپیگنڈے کے مواد کے بطور

Marfat.com

دو مضامین لکھے۔ پہلی تحریر کا عنوان تھا ''ہندوستان کے مسلمان جمہوری ممالک کے ساتھ ہیں'' اور دوسری تحریر کا عنوان تھا ''جنگ کے بارے میں ہندوستان کا رویہ''۔ دوسری تحریر میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ کا حوالہ دیا جو ان کے حالیہ سفر میں پیش آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا ''اکتوبر ۱۹۳۹ء میں میں پنجاب میں تھا اور وہاں ایک چھوٹے سے واقعہ نے مجھے بے حد متاثر کیا جو میرے ذاتی تجربہ کی بات تھی۔ میرے ایک پرانے شاگرد نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھے اپنی زرعی زمینوں پر لے گیا اور کہنے لگا ''سر یہ بڑے ہنگامہ خیز دن ہیں، میں نے زمینوں پر کچھ کام کرنے کا پروگرام بنایا ہے لیکن یہ ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ میں آپ کے پاس آپ کی آشیرباد اور دعائیں لینے آیا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں جنگ میں مار دیا جاؤں اور آپ جب دوبارہ یہاں آئیں تو پھر نہ مل سکوں۔ میں اپنے گاؤں کے ساتھیوں کے ساتھ فوج میں شمولیت کے لیے جا رہا ہوں تاکہ اس پرچم کو سربلند رکھنے اور عزت و ناموس، آزادی اور اخلاص کے ان اصولوں پر لفظی اور معنوی طور پر عمل کر سکوں جو آپ نے ہمیں سکھانے کی کوشش کی تھی'' میں نے اس کو دل سے دعائیں دیں اور مجھے اندازہ ہوا کہ ہندوستان کے عوام کی کثیر تعداد کے دلوں میں یہی جذبہ موجزن ہے۔ یہ واقعہ کسی حد تک جنگ کے بارے میں ہندوستان کے نقطۂ نظر اور رویہ کی وضاحت کرتا ہے۔ (۳۷)

ان کا ایک اور مضمون جس کا عنوان ''ہندوستان اور جنگ'' تھا اس سے اگلے برس ٹوکیو میں برطانوی سفارت خانہ نے شائع کیا جو برطانوی اطلاعات کے سلسلہ کا ایک حصہ تھا۔

۸ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوسف علی نے کاکسٹن ہال ویسٹ منسٹر میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ سے خطاب کیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ۱۹۱۴ میں بھی انہوں نے خطاب کیا تھا اور ہندوستان کے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ یونین جیک کے گرد جمع ہو جائیں۔ ٹھیک اسی انداز میں جو انہوں نے پہلی عالمی جنگ کے موقع پر اختیار کیا تھا۔ انہوں نے ہندوستان کے لوگوں پر زور دیا

Marfat.com

کہ سیاسی تبدیلی کے اپنے مطالبات پر وہ اس وقت تحمل کا مظاہرہ کریں۔ ان کا کہنا تھا ''میری درخواست یہ ہے کہ ہمارے انفرادی نظریات اور نقطہ ہائے نظر خواہ کچھ بھی ہوں ہمیں فی الوقت صرف ایک امر پر اپنی توانائیوں کو مرتکز کرنا چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ پوری قوت اور تندہی سے سلطنت کا تحفظ کیا جائے۔ ایک طاقتور اور صحیح وسلامت سلطنت کے سایہ میں ہم اپنے وہ اعلی مقاصد زیادہ بہتر طور پر حاصل کر سکیں گے جو ہندوستان اور برطانیا دونوں کو یکساں عزیز ہیں''۔ (۳۸)

پہلی جنگ عظیم کے دوران یوسف علی کی صبر و تحمل اختیار کرنے کی اپیلیں ان لوگوں کی جانب سے کچھ تعاون حاصل کرنے میں مددگار ہو سکتی تھیں جو دستوری تبدیلیوں کے راستے اصلاح کی کوشش کرنے کے حامی تھے۔ لیکن اب صورت حال اتنی زیادہ ابتر ہو چکی تھی کہ ان کی اپیل کارگر نہ ہو سکی۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں برطانیا نے ہندوستان میں جاری دستوری مذاکرات کو ملتوی اور معطل کر دیا۔ اگر چہ گاندھی جی اس کے لیے تیار تھے مگر کانگریس کی قیادت نے برطانیا کے اس فیصلہ کو رد کر دیا۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں مستعفی ہوگئیں۔ مسلم لیگ کو اچھوتوں کی جانب سے مضبوط تعاون میسر تھا جو، ذات پات میں عقیدہ رکھنے والے ہندوؤں کے سبب، ہندوستان کے معتوب طبقے میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے ۴ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو یو پی جیسے صوبوں میں کانگریس کی آمریت سے چھٹکارا پانے پر ''یوم نجات'' منایا۔ نہرو اور جناح کے مابین بالکل ایسی شدید جنگ چھڑ گئی تھی جیسی کہ جرمنی اور اتحادیوں کے درمیان چھڑی ہوئی تھی۔ عبداللہ یوسف علی نے اس کیفیت پر گہرے دکھ اور غم کا اظہار کیا۔ ان کے الفاظ تھے ''کانگرس کی جانب سے پنڈت جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس اور مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کے مابین ہونے والی خط و کتابت نے ہمیں ایک ایسی تاریک گلی میں پہنچا دیا ہے اور صورت حال اتنی مایوس کن ہے کہ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ سوائے اس کے کہ ہمارے مختلف فرقوں

اور جماعتوں کے رہنما اپنے اپنے نقطۂ نظر میں ایک انقلابی تبدیلی لانے کا مظاہرہ کریں''۔ (۳۹)

یہ وہ پس منظر تھا جس میں عبداللہ یوسف علی نے فروری ۱۹۴۰ء میں ایک اور جلسہ سے خطاب کیا، مقام وہی کاکسٹن ہال تھا اور موضوع تھا: ''ہندوستان کے مسلمان، جنگ اور سیاسی میدان''، (۴۰) اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے امکانی طور پر مسئلے کا ایک تعمیری حل پیش کرنے کی کوشش کی۔ یوسف علی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں علیحدہ علاقوں کے تعین کے تصور کو رد کر دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اس طرح نقل آبادی کے مسائل کا سامنا کرنا ہوگا جن کا آسان حل ممکن نہیں ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے ایک متبادل نقشۂ کار پیش کیا جس میں اقلیتوں کو بے دست و پا کر کے اکثریت کے دباؤ میں تحلیل ہونے سے بچایا جا سکے۔ ان کی تجویز تھی ایک ایسی مخلوط جماعت کی تشکیل کی جائے جس میں مسلمانوں کے ساتھ اچھوت قومیں اور وہ ہندو شامل ہوں جو کانگریس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ایسی مخلوط جماعت حجم میں خاصی بڑی ہوگی اور کانگریس کے مقابلے میں خاصی مؤثر ثابت ہو کر ہندوستان میں دو جماعتی نظام کی راہ ہموار کر سکے گی۔ یہ اسی تجویز کا اعادہ تھا جن پر مبنی خیالات کا اظہار ۱۹۳۳ء میں ہندوستان کی دستوری اصلاحات کے لیے قائم جوائنٹ کمیٹی کے سامنے وہ کر چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو مسلم اختلافات کے علاوہ دوسرے مسائل بھی اس طرح حل کئے جا سکتے ہیں۔ ان مسائل میں شہری اور دیہاتی کی تقسیم، زراعت پیشہ افراد اور غیر زراعت پیشہ لوگوں کے اور سرمایہ دار اور مزدوروں کے مفادات کے مابین چپقلش شامل تھے۔ نئی سیاسی جماعتوں کی تشکیل میں تفریق و تقسیم کی ان بنیادوں کو بھی پیش نظر رکھا جا سکتا تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان کو اس اندھی گلی سے نکالنے کے لیے مدد مہیا کریں جہاں جامد قسم کی فرقہ وارانہ جماعتیں بن گئی ہیں اور مستقل نوعیت کی بے اثر اقلیتیں وجود میں آ گئی ہیں۔ ان کا اب بھی یہی نقطہ نظر تھا کہ ہندوستان ایک قوم ہے۔ مسلمانوں کو ایسی مخلوط جماعت کی تشکیل کی تجویز میں تعاون کرنا چاہیے جو

Marfat.com

مذہبی اختلافات سے بلند اور ماورا ہو۔ عبداللہ یوسف علی کی اس اسکیم پر کسی بھی جانب سے کسی درجہ میں بھی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اور کسی نے بھی اس میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ (۴۱) اب وہ وقت بدل چکا تھا جب سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان کے کان میں خاموشی سے کچھ کہہ دینے سے ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بدل جایا کرتا تھا۔

مسلم لیگ کا اجلاس مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں ہوا۔ جس میں مشہور و معروف ''قرار داد پاکستان'' منظور کی گئی۔ ہندوستان میں جس تیزی سے حالات و واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے اس نے عبداللہ یوسف علی کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہندوستان کی آزادی کے تو وہ اب بھی حامی نہ تھے لیکن مسلمانوں کو کانگریس کی جانب سے جو خطرات درپیش تھے اور مسلم لیگ نے اس کا جو تجزیہ کیا تھا اسے عبداللہ یوسف علی تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مئی ۱۹۴۰ء میں جب وہ ۶۸ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے انہوں نے ساؤتھ ہیمپٹن یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے ایک مباحثہ میں کرشنا مینن کو جو نہرو کے خاص آدمی شمار ہوتے تھے گھیر لیا۔ مباحثہ کی مجوزہ قرارداد یہ تھی کہ دونوں اقوام کے حق میں یہی ہے کہ ہندوستان کو فی الفور مکمل آزادی دے دی جائے۔ جیسا کہ توقع کی جانی چاہیے تھی یوسف علی قرارداد کے خلاف دلائل دے رہے تھے۔ مباحثہ میں انہوں نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کا ترجمان قرار دیا تھا اور تنبیہ کی تھی کہ ہندوستان کو اقلیتوں پر مطلق بالادستی قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔''(۴۲)

۱۹۴۰ء کے موسم گرما میں برطانیا کے افق پر جنگ کی گونج اور گرج کی آوازیں چھائی رہیں جرمنوں کی بمباری روز کا معمول بن گئی تھی۔ ''ورلڈ کانگریس آف فیتھس'' کے مستقل مزاج منتظمین نے جولائی میں اپنی سالانہ تقریب کے انعقاد کا بندوبست کر لیا جس میں عبداللہ یوسف علی نے بھی خطاب کیا۔ رائل سوسائٹی آف آرٹ نے بھی حالات کی سنگینی کے علی الرغم عبداللہ یوسف

Marfat.com

علی کو "ہندوستان میں تعلیم بالغاں" پر ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دے ڈالی۔ ایک مرتبہ ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کا اجلاس جس کی صدارت سکریٹری آف اسٹیٹ کر رہے تھے جاری تھا کہ ہوائی حملہ ہو گیا۔ لیکن اجلاس جاری رہا۔ کبھی کبھی غیر متوقع طور پر کسی جانب سے جوش وخروش میں اضافے کا سبب پیدا ہو جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ایک دوسرے جلسے میں عبداللہ یوسف علی کی موجودگی میں ایک سکھ نے پنجاب کے سابق گورنر مائیکل اوڈائر کو قریب سے گولی ماردی۔ اس واقعہ کے بارے میں ان کا یہ بیان پریس میں نقل کیا گیا "پہلی قطار میں جہاں میں کھڑا تھا میں نے سر لوئیس ڈین کو جو میرے دوست ہیں گرتے ہوئے دیکھا۔ میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچا انہوں نے کہا کہ "میں زخمی ہو گیا ہوں"۔ وہ گھبرائے ہوئے اور بدحواس نظر آ رہے تھے۔ اور میں بھی بھونچکا رہ گیا تھا۔ میں نے سہارا دے کر ان کو کھڑا کیا اور دیکھا کہ ان کے بازو سے خون بہہ رہا ہے۔ میں نے مقدور بھر ان کو مدد فراہم کی۔ ایک ایسے جلسہ میں جہاں ہر چیز بڑے پرسکون انداز میں جاری تھی اور بڑا دوستانہ ماحول تھا۔ یہ ایک ناقابل یقین سا اختتامیہ تھا۔ دوران جلسہ کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوا اور ہر شخص نے جلسہ میں سرپرسی سائیک کے خطاب کو جوش وجذبہ کے ساتھ سنا تھا"۔ (۴۳)

ان پر خطر لمحات میں عبداللہ یوسف علی کو اپنی وصیت لکھنے کا خیال آیا ہو گا جس کی تکمیل انہوں نے ستمبر ۱۹۴۰ء میں کی۔ سات سال قبل انہوں نے اپنے مکان نمبر ۳ رمینسل روڈ کی ملکیت کے حقوق معصومہ کے نام منتقل کر دیے تھے۔ راشد سمیت کسی بھی بچے کے معاملہ میں ان کی وصیت میں ذرا بھی فراخ دلی کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ بالخصوص ان کی پہلی شادی سے جو بچے تھے ان کو بالکل ہی خارج کر دیا گیا تھا۔ وصیت کے الفاظ میں "ان بچوں نے اپنی مستقل مخاصمت اور بدسلوکی کے سبب میری محبت کو جوان کے لیے ہو سکتی تھی بالکل ختم کر دیا ہے اور یہ بات اب اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اب اس وصیت میں میں نے ان کے کسی فائدہ کا خیال نہیں رکھا ہے"۔ اس کے ساتھ ہی

Marfat.com

انہوں نے یہ ہدایت کی کہ ان کی جائیداد کا بڑا حصہ معصومہ یا راشد کے بجائے ایک ایسے فنڈ میں دیا جائے جس کو یونیورسٹی آف لندن کی کورٹ قائم کرے اور جو یونیورسٹی کے ہندوستانی طلبہ کی مالی امداد کے لیے استعمال کیا جائے۔ معصومہ کے لیے گھر کے سازوسامان کے علاوہ عبداللہ یوسف علی کی تحریریں، کاغذات اور وہ کتابیں تھیں جو اگر وہ چاہتیں تو لے سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب تک وہ دوبارہ شادی نہیں کریں تو ۴۰ پونڈ ہر سہ ماہی پر اُن کو ملنا تھا۔ راشد کو بھی ہر ۳ ماہ بعد ۴۰ پونڈ اور یکمشت ۳۰۰۰ پونڈ کی رقم ادا کی جانی تھی۔ ان کی ذاتی کتب میں سے جو بچ رہتیں وہ اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کے لیے بھیجی جانی تھیں۔ انہوں نے اپنے روزناموں کے سلسلہ میں خصوصی ہدایات بھی وصیت میں درج کردی تھیں۔

معصومہ سے ان کی علیحدگی اگلے سال ہوئی۔ ان کے باہمی تعلقات ۱۹۴۰ سے کشیدہ معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے کہ اس سال کے دوران میں وہ بیشتر وقت نیشنل لبرل کلب میں قیام پذیر رہنے کو ترجیح دیتے رہے تھے۔ ان کو اپنی آئی سی ایس کی پنشن کے آٹھ سو پونڈ ان کی وفات کے وقت تک یعنی ۱۹۵۳ء تک ملتے رہے۔ جو جائیداد انہوں نے چھوڑی تھی اس کی مالیت ۲۰,۵۷۸ پونڈ تھی جو ڈیتھ ٹیکس کی کٹوتی کے بعد بھی ایک بڑی رقم تھی۔

۱۹۴۰ء کے موسم خزاں میں بھی عبداللہ یوسف علی بڑھاپے کے باوجود ایک مضبوط حواس رکھنے والے انسان تھے اور لندن پر ہونے والے ہوائی حملوں کی بوچھاڑ میں مقابلہ آرائی کے لیے مستعد نظر آتے تھے۔ ان کی اصل دلچسپی پروپیگنڈے کے کام میں تھی۔ انہوں نے اس جنگ میں نازیوں کی فتح کے امکان کو اسلام اور انسانیت کے لیے تاریخ کی سب سے بڑی تباہی اور مصیبت قرار دیا تھا۔ [۴۴] اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی خاطر انہوں نے لندن سے دور واقع شہروں مثلاً ہارٹل پول، برسٹل اور ہل میں جا کر لوگوں سے خطاب کیا۔ برسٹل شہر میں اکتوبر کے

مہینے میں ایک دن دو تقریریں کیں۔ ایک تقریر برسٹل راونڈ ٹیبلرز کے سامعین کے لیے اور دوسری رائل ایمپائر سوسائٹی کی مقامی شاخ میں۔ وزارت اطلاعات نے جلسوں کے منتظمین کو عبداللہ یوسف علی کے بارے میں بہت اچھی طرح معلومات فراہم کر دی تھیں، بمقابلہ سابقہ جنگ عظیم کے جب کئی موقعوں پر وزارت اطلاعات یقین سے یہ بات بتانے سے قاصر رہی کہ وہ مسلمان ہیں یا ان کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔ ہارٹل پول میں ان کا صحیح تعارف کرایا گیا جب ان کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کا سابق صدر بتایا گیا۔(۴۵) ان کا پیغام اس یقین دہانی پر مبنی بھی تھا کہ ہندوستان اور مسلمان پوری طرح برطانوی سلطنت کے وفادار رہیں گے۔ برسٹل میں ہونے والے ایک لکچر کا عنوان ہی ''اسلام اور جنگ'' تھا۔ اگرچہ انہیں کسی نے یہ اختیار نہیں دیا تھا لیکن وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ''جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے تو وہ اتحادیوں کے پوری طرح ساتھ ہیں کیونکہ انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے امن کا دارومدار ان آزاد اداروں کی بقاء واستحکام سے وابستہ ہے جن کا دوسرا نام برطانیا عظمیٰ ہے۔ سلطنت برطانیا پوری دنیا میں واحد مضبوط عنصر ہے اور مسلمان برے اور بھلے ہر طرح کے حالات میں اس کے ساتھ ضرور تعاون کریں گے۔(۴۶)

عبداللہ یوسف علی نے ۱۹۴۱ء کے پورے سال اپنی نوع بہ نوع مشغولیات جاری رکھیں جن کا نقشہ حسب معمول اس طرح تھا کہ ایک طرف وہ سیاسی پروپیگنڈے کا کام کرتے تھے تو دوسری جانب ہمہ جہت علمی وادبی کاموں میں بھی شریک ہوتے تھے اور ساتھ ہی ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں اور تبدیلیوں پر بھی تنقید وتبصرہ کرتے رہتے تھے۔ ادبی وعلمی کاموں کے سلسلے میں ان کا کارنامہ ''رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز'' کی مرتب کی ہوئی کتاب ''ماڈرن انڈیا اینڈ دی ویسٹ'' کے لیے ایک باب تحریر کرنا تھا جس کا موضوع اور عنوان ''مسلم کلچر اینڈ ریلیجس تھاٹ'' یعنی مسلمانوں کی ثقافت اور مذہبی فکر'' تھا۔ اس کتاب کا مقدمہ لارڈ میسٹن نے لکھا تھا جن سے

Marfat.com

یوسف علی کے روابط چار دہائیوں پر محیط تھے۔ان کے ساتھ تعاون کا غالباً یہ آخری نمونہ تھا۔میسٹن کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی اور ۱۹۴۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔عبداللہ یوسف علی نے اس دوران ایک جریدے ''Religions'' کے لیے کئی طویل مضامین اور بعض کتابوں پر مختصر تبصرے بھی تحریر کیے۔سیاسی سطح پر ان کے علم میں یہ بات اچھی طرح آ چکی تھی کہ مسلم لیگ کی مقبولیت اب بہت بڑھ چکی ہے۔انہوں نے جناح کی حمایت میں ''دی ٹائمز'' میں لکھا تھا کہ ''آپ کسی قوم کی حمایت اور تائید اس طرح حاصل نہیں کر سکتے کہ اس کے لیڈر کو مستقل گالیوں سے نوازتے رہیں'' یوسف علی کا ذہن ہندوستان کے ایک قوم ہونے کے نظریہ کی شکست کو بھی قبول کر چکا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''جتنی جلد لوگ اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ ہندوستان پورے یورپ کی مانند ہے، یورپ کے کسی ایک چھوٹے سے ملک مثلاً چیکوسلواکیہ کی طرح نہیں ہے، اتنا ہی آسانی سے وہ مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ سکیں گے۔''(۴۷) ان کو بہر حال اب بھی یہ توقع ضرور تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کسی قسم کے تعاون اور مفاہمت کا جذبہ ضرور بیدار ہو سکتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوا تو یہ نہ صرف اس عظیم ملک کے لیے بلکہ سلطنت برطانیا کے لیے بھی بہت برے نتائج کا پیش خیمہ ہوگا۔

عبداللہ یوسف علی بڑی پابندی سے ہالبرن کے ایک چوک میں واقع ''کانوے ہال'' میں ساؤتھ پیلس آتھیکل سوسائٹی کے اجتماعات میں بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ آزاد خیال عیسائیوں، انسانیت نواز لوگوں اور اسی قسم کے خیالات رکھنے والوں کی ایک ایسی انجمن تھی جو زندگی سے بھرپور تھی۔سوسائٹی کے ایک اجتماع میں جو مئی ۱۹۴۱ء میں منعقد ہوا تھا یوسف علی نے ایک مقالہ پیش کیا جس کا عنوان ''مرکزی مطلق العنانیت اور اخلاقیات'' تھا اس میں انہوں نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا تھا کہ سلطنت برطانیا کی اخلاقیات نازی اور بالشویک اخلاقی اصولوں کے مقابلہ میں بہتر اور اعلیٰ ہیں۔ان کا خیال تھا کہ ''شاہی نوآبادیاتی نظام کا مقصد'' یہ ہے کہ سلطنت کے زیر اثر خود مختار اقوام کے درمیان ایسا رابطہ قائم کر دیا جائے کہ وہ سب اپنے وسائل سلطنت کے مجموعی مفاد

کے لیے یکجا کر کے استعمال کر سکیں۔ یہ گویا مستقبل میں پوری انسانیت کی تنظیم واتحاد کے لیے ایک بنیاد فراہم کرے گی۔ اس طرح اگر دنیا کی ساری اقوام ایک وفاقی نظام میں شامل ہونے پر رضا مند ہو جائیں جیسی کہ سلطنت برطانیہ ہے تو مستقبل میں ایسا وفاق جنگ کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر سکے گا۔ (۴۸) ان کا مذہبی تفکر ایسا نہ تھا جس میں اس کا قابل ذکر تعلق باہر کی دنیا سے ہوتا ہے اور جہاں حکومت اور معاشرہ کی تنظیم کے کام کیے جاتے ہیں۔

۱۹۴۱ء کے موسم گرما میں کچھ عرصہ کے لیے وہ بیمار بھی رہے۔ غالباً یہ وہی ایام تھے جب وہ اور معصومہ شادی کے بندھن سے علیحدہ ہوئے تھے۔ معصومہ نے نمبر ۳ مینسل روڈ چھوڑ کر ومبلڈن ہی میں کہیں اور سکونت اختیار کر لی تھی اگرچہ ابھی یہ مکان انہی کی ملکیت تھا۔ عبداللہ یوسف علی نے کچھ عرصہ برسٹل میں گزارا، جہاں ان کو وزارت اطلاعات سے خط ملا جس میں ایک پیش کش کی گئی تھی اور بات چیت کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا:

۳۱ر جولائی ۱۹۴۱ء

اے۔ یوسف علی اسکوائر سی بی ای

۲۔ سینٹ ایڈورڈز روڈ۔ کلفٹن۔ برسٹل ۸

ڈیر یوسف علی

ایس/ایس (سیکریٹری اسٹیٹ فار انڈیا) نے مجھے بتایا ہے کہ گزشتہ روز جب ان کی آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے ان سے پوچھا تھا کہ اب جبکہ آپ کی صحت پوری طرح بحال ہو چکی ہے تو کیا آپ کو امریکہ کا دورہ کرنے کے بارے میں دوبارہ سوچنا چاہیے یا پھر آپ کی خدمات سے فائدہ اٹھائے جانے کا کوئی اور طریقہ ہو سکتا ہے۔ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ آپ اگلے ہفتہ کسی دن مثلاً بدھ کے روز میرے پاس تشریف لے آئیں اور مجھ سے اس سوال کے

Marfat.com

حوالہ سے تبادلۂ خیال کرلیں۔

آپ کا مخلص

اے-ایچ-جوائس (۴۹)

یہ واقعی بڑی غیر معمولی بات ہے کہ وزارتِ اطلاعات اب بھی یوسف علی سے مشورہ کی طلب گار رہتی تھی حالانکہ اب وہ ہندوستان کے حالات وواقعات سے بہت زیادہ رابطہ میں نہیں تھے۔

جنگ عظیم کے بقیہ عرصہ میں عبداللہ یوسف علی کی سرگرمیوں کے بارے میں مکمل تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں انہوں نے آکسفرڈ میں ہونے والی ''ورلڈ کانگریس آف فیتھس'' میں شریک ہوکر خطاب بھی کیا تھا اور رائل سوسائٹی آف آرٹس کے اجتماعات میں بھی شرکت کی تھی۔ ۱۹۴۲ میں انہوں نے نازی ازم کے خلاف ایک فیچر آرٹیکل لکھا جس کا عنوان ''مسلم ممالک میں استبداد'' تھا۔ انڈیا آفس کے ریکارڈ میں موجود ان کی فائل کے اوپری صفحہ پر ایک نوٹ موجود ہے جس کے الفاظ ہیں'' پی اینڈ جے (ایس) فائل بھی ملاحظہ فرمایئے'' لیکن تمام ''ایس'' فائلیں ۱۹۸۲ میں دفتر خارجہ کے ''حساس معاملات کا جائزہ لینے والے یونٹ نے انڈیا آفس کے ریکارڈ سے الگ کردی تھیں۔ ان چند سالوں کی مکمل روداد ان غیر موجود دستاویزات ہی میں مل سکتی ہے۔ (۵۰) بہرحال وہ فروری ۱۹۴۳ء میں ٹھیک اور صحت مند تھے اور اس سال انہوں نے ووکنگ کی شاہجہاں مسجد میں عیدالفطر کی نماز کی امامت بھی کی تھی۔ وہ اس مسجد کے ٹرسٹ کے رکن بھی تھے۔ ان کا خطبہ 'حزن والم' کا تاثر رکھتا تھا انہوں نے کہا ''اس سال عالم اسلام اور دنیا کے باقی حصوں میں ایسے واقعات نہیں ہوئے جس پر ہم خوشی کا اظہار کر سکیں۔ لیکن ہماری مذہبی تقاریب اور تہواروں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بیرونی دنیا کے حالات سے آزاد رہتے ہیں اور متاثر نہیں ہوا کرتے۔ مذہب ایک باطنی اور داخلی دنیا سے تعلق رکھتا ہے یہ

Marfat.com

بات فرد اور انسانیت دونوں کے بارے میں درست ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی کو دانش وحکمت کی بنیاد پر منظم کر لیں تو خارجی دنیا کے تاریک بادل ہمارے باطن کی دنیا کی روشنی کو روپوش نہیں ہونے دیں گے بلکہ ہمارے اندر سے روشنی کی وہ طاقت ور شعائیں پھوٹتی رہیں گی جو مایوسی، غم، شکوک اور بے یقینی کو دور کر سکتی ہیں''۔ (۵۱) ذاتی حوالہ سے جو کچھ ریکارڈ پر ہے اور معلوم ہو سکا وہ یہ ہے کہ ۱۹۴۴ء کے آتے آتے بائیس سالہ راشد کو انڈین آرمی کی ساتویں راجپوت رجمنٹ میں کمیشن مل گیا تھا۔ (۵۲) ایسی خبر سے عبداللہ یوسف علی کو یقیناً خوشی ہوتی مگر زیادہ امکان اس بات کا معلوم ہوتا ہے کہ اب باپ اور بیٹے کے درمیان براہ راست رابطہ موجود ہی نہیں تھا۔

جب ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو عبداللہ یوسف علی بدستور مکان نمبر ۳ رمینسل روڈ ومبلڈن میں سکونت پذیر تھے۔ بیوی سے علیحدہ اور بچوں سے دور اور منقطع۔ ان کی شمع حیات بجھنے کے قریب محسوس ہوتی تھی۔ زندگی کی شام آ گئی تھی۔ دیرینہ دوست جیسے کہ اکبر حیدری، لیمنگٹن ، میسٹن، اور ینگ ھسبنڈ وغیرہ سب وفات پا چکے تھے۔ بعض دوسرے جیسے سر عبدالقادر وغیرہ، ہندوستان واپس جا چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد عبداللہ یوسف علی کو ان کے کاموں کا کوئی مناسب صلہ نہیں دیا گیا حالانکہ مسلمانوں کی سیاسی اور تعلیمی کامیابیوں میں ان کا حصہ بہت وقیع تھا، بالخصوص پنجاب کے لیے تو ان کی خدمات غیر معمولی تھیں۔ پنجاب کی یونینسٹ لیڈر شپ کو جواب بڑے آرام سے مسلم لیگ میں شامل ہو گئی تھی ان کے کارناموں کا پورا علم تھا لیکن وہ سب ان کے حوالے سے لب بستہ رہے۔ جناح جو ایسے انسان نہیں تھے کہ کسی کے پرانے ہتک آمیز رویہ کو فراموش کر دیں اپنے بچپن کے انجمن اسلام اسکول کے ساتھی سے بے تعلق رہے۔ (۵۲ الف) البتہ پاکستانی ہائی کمیشن کے اہل کاروں نے ان سے رابطہ برقرار رکھا جس سے ان کی خدمات کا حکومتی سطح پر قدرے اعتراف کیے جانے کا اشارہ ملتا ہے۔ ہائی کمیشن نے اقبال ایسوسی ایشن کے بارے میں تفصیلات بھی شائع کیں جو ان کی صدارت میں قائم کی گئی تھی۔ (۵۳) نومبر ۱۹۴۸ میں معصومہ نے

Marfat.com

مکان نمبر ۳ مینسل روڈ مبلغ چار ہزار پونڈ میں فروخت کر دیا خواہ اس کا سبب ان کی مالی ضروریات ہوں یا پھر وجہ یہ رہی ہو کہ عبداللہ یوسف علی خود اپنی مرضی سے مکان چھوڑ کر جا چکے تھے۔

کچھ عرصہ تو عبداللہ یوسف علی نمبر ۲ مونسیل سٹریٹ، سٹریٹن گراونڈ میں رہتے رہے جو وسطی لندن میں ویسٹ منسٹر کا ایک پرانا بوسیدہ اور خستہ حال ڈسٹرکٹ تھا۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ان کے کتابوں کے زبردست ذخیرہ کا کیا حشر ہوا اور وہ سیاہ فولادی صندوق جس میں ان کی ڈائریاں رکھی تھیں کہاں گیا۔ جو چیز ان کے قبضہ میں آخر تک تھی وہ اخباری تراشوں اور دوسرے ذاتی کاغذات پر مشتمل کتابی البم تھا۔ یہ اخباری تراشے ان کی شخصیت کے بارے میں تھے۔ انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے ان کاغذات کی فہرست تیار کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ماضی کی کامیابیوں اور اعزازات کو یاد کر کے تنہائی کے اوقات گزارتے ہوں۔ ان کے اب سکڑتے ہوئے شناساؤں کے حلقہ میں ایک ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر تھے جو لندن کے اسلامک کلچرل سنٹر کے ڈائریکٹر تھے۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنا یہ آخری سرمایۂ حیات ہدیہ کے طور انہیں کو دے دیا ہو۔ ذاتی تحریروں اور اخباری تراشوں پر مشتمل یہ اسکریپ بک کئی سال بعد اسلامک کلچرل سنٹر کی لائبریری میں دستیاب ہوئی۔ ''دی ٹائمز'' لندن میں ان کی وفات پر جو تعزیتی نوٹ شائع ہوا اس سے تعزیت نگار کی عبداللہ یوسف علی سے گہری واقفیت نظر آتی ہے: ''عمر کے آخری سالوں میں وہ شدید ذہنی انتشار اور مایوسی کا شکار نظر آتے تھے۔ غالباً اس کی وجہ تھی کہ ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے جو کچھ بھی کام کیا وہ محض تسکین انا اور روح کے اضطراب کا شاخسانہ تھا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ عبداللہ یوسف علی کی عمر عزیز کے آخری کئی سال ذہنی انحطاط سے عبارت دکھائی دیتے ہیں۔ خاندانی اور عائلی ذمہ داریوں کو انہوں نے کلی طور پر فراموش کر دیا تھا اور اپنے رہے سہے برائے نام سے گھر کی مالی ضرورتوں سے کاملاً لاتعلق ہو گئے تھے۔ اپنی آئی سی ایس کی مستقل پنشن کے علاوہ ان کے دوسرے ذاتی ذرائع آمدنی بھی تھے۔ لیکن وہ بظاہر افلاس و تنگ دستی کی ایک

بہت نچلی سطح پر اپنے زندگی کے دن گزارنے لگے تھے جس میں نفاست ونظافت کا اہتمام بھی ختم ہو گیا تھا اور یہ سب ان کے پرانے دوستوں کے لیے بڑی تشویش کا سبب تھا۔ آخر میں تو یہ عالم تھا کہ وہ تنہا گھوما کرتے تھے۔ایک ایسی مضطرب روح اور بے چین وجود جس کا کوئی مستقل ٹھکانا نہ ہو"۔ (۵۴)

کوموریس سے آئے ہوئے ایک نوجوان مسلم اسکالر عمر عبداللہ نے "اسلامک ریویو" کے مدیر جناب عبدالماجد کے تعاون سے ۱۹۵۱ میں ان کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ان کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ٹرافلگر اسکوائر کے قریب واقع ایمپائر کلب جا کر ان کے بارے میں پتا کریں۔ (۵۵) یہ کلب رائل ایمپائر سوسائٹی نور تھمبر لینڈ ایونیو کا ایک حصہ تھا۔عمر عبداللہ کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب انہوں نے کلب کے اسٹاف سے عبداللہ یوسف علی کے بارے میں دریافت کیا تھا تو ان کا ردعمل کیسا تھا: "اچھا تو آپ اس بوڑھے آدمی کو تلاش کر رہے ہیں جو اُدھر خاموش بیٹھا رہتا ہے، کسی سے بات کرتا ہے اور نہ کچھ کرتا ہے"! (۵۶)

عمر عبداللہ نے کسی نہ کسی طرح عبداللہ یوسف علی کو کچھ باتیں کرنے پر آمادہ کر لیا۔ایک موضوع قرآن کے بارے میں تھا۔ان کا فوری جواب یوں تھا "اچھا وہ ترجمہ۔ہاں مجھے اس میں تین سال لگ گئے تھے اور میں نے یہ ترجمہ سارے براعظموں کے سفر کے دوران کیا تھا۔میں خود ہر اس جگہ گیا تھا جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے"۔عبداللہ یوسف علی نے صحیح کہا تھا۔ترجمہ کی ۳۰ قسطیں تین سالوں میں (1937-1934) شائع ہوئی تھیں۔لیکن یہ اس محنت کا ثمر تھا جس کو وہ ۱۹۲۰ کی دہائی میں شروع کر چکے تھے۔ان کی ذہنی حالت منتشر اور الجھی ہوئی تھی اور ان کو ماضی کے بارے میں تفصیلات کو ذہن میں لانے میں دشواری اور مسائل کا سامنا تھا۔

دونوں (یعنی عمر عبداللہ اور یوسف علی) کی ایک اور ملاقات ۱۹۵۳ میں ہوئی جس سال

Marfat.com

یوسف علی کا انتقال ہوا تھا۔ عمر عبداللہ نے اثنائے گفتگو میں یوسف علی سے کہا کہ لاہور ایک مسلمان کے لیے رہنے کی کبھی مثالی جگہ ہوا کرتا تھا۔ یوسف علی نے جواب دیا کہ "اب ایسا نہیں ہے۔ میں یہاں بالکل خوش اور مطمئن ہوں"۔ عمر عبداللہ نے ملاقات سے واپسی کے بعد سوچا تھا کہ یہ وہ مسلمان شخصیت ہے جو ایک وقت میں روحانیت کی بلندیوں کو چھو چکی ہے۔ اس وقت تو عبداللہ یوسف علی ذہنی مریض تھے اور شدت سے ان کی دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

دسمبر ۱۹۵۳ء کا پہلا ہفتہ لندن میں شدید ترین سردی کا تھا۔ کہر نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور چلنا پھرنا دشوار تھا۔ اخبارات کی سرخیوں میں کوریا کی جنگ کا ذکر ہوتا تھا۔ معصومہ نے (جواب اپنے آپ کو مسز گرٹروڈ علی کہلانا پسند کرتی تھیں) مصنف کے استفسار پر بتایا کہ وہ ان کے علم کے مطابق رائل ایمپائر سوسائٹی میں وقت گزارتے تھے۔ لیکن ۱۲ سال علیحدگی کو ہونے آئے ہیں اس لیے ان کو نہیں معلوم کہ ان کا قیام کہاں ہے۔ ۹ دسمبر کو بدھ کا دن تھا۔ شام کے وقت پولیس نے عبداللہ یوسف علی کو ویسٹ منسٹر کے علاقہ میں ایک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ انہیں ویسٹ منسٹر کے اسپتال لے جایا گیا جہاں انہوں نے رات گزاری۔ دوسرے دن ہسپتال کے ڈاکٹروں نے ان کو فارغ کر دیا اور پولیس نے عبداللہ یوسف علی کو لندن کاونٹی کونسل کے ایک ادارے میں پہنچا دیا جہاں بوڑھے لوگوں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی اور جو چیلسی میں ڈوہاؤس اسٹریٹ پر واقع تھا۔

غالباً اسپتال سے یا پھر اولڈ پیپلز ہوم کے منتظم کی جانب سے فون کیا گیا، جس کے نتیجہ میں پاکستان ہائی کمیشن کے افسر برائے امور تعلیم جناب جی۔ایم۔ ممتاز عبداللہ یوسف علی کو دیکھنے آئے تھے۔ ان کا بیان ہے "ان کی حالت افسوس ناک تھی۔ میں ان کو ان دنوں سے جانتا ہوں جب وہ ایک عظیم شخصیت تھے، مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس حالت کو کیونکر پہنچے۔ وہ ایک دولت مند شخص تھے اور اس ملک میں ان کے بڑے اچھے دوست احباب تھے، بعض تو دارالامراء کے ارکان

Marfat.com

تھے''(۵۷)

غالباً عبداللہ یوسف علی کی حالت زار کی جو خبر ہائی کمیشن کے بالائی حلقوں تک پہنچی تو اس میں زیب داستان کے طور پر کچھ نہ کچھ اضافہ ہو چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ اس وقت کے پاکستان کے ہائی کمشنر مرزا ابوالحسن اصفہانی نے وزیر اعظم محمد علی بوگرا کو ایک فوری توجہ کا مراسلہ روانہ کیا اس کا مضمون یہ تھا۔

''مائی ڈیر محمد علی

میں یہ خط آپ کو ایک ایسے شخص کے حوالے سے لکھ رہا ہوں جس کو میں جانتا ہوں اور جو میرے عہد شباب کے مسلمانوں کے لیے قابل احترام تھا۔ بلکہ دنیا بھر کے مسلمان اس کی عزت کرتے تھے اس لیے کہ اس نے ساری زندگی اسلام کی زبردست خدمت کی تھی اور قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا نام عبداللہ یوسف علی ہے جو اب سے ۸۱ برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ کتاب ''ہواز ہو'' "Who's Who" کے ۱۹۵۳ کے ایڈیشن میں صفحہ ۳۰۶ پر پورا ایک کالم ان کی صفات، کارگزاریوں اور کارناموں کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ مجھے ابھی معلوم ہوا کہ یہ صاحب سخت مالی دشواریوں سے دوچار ہیں۔ ایک روز وہ ٹریفالگر اسکوائر میں اس حال میں پائے گئے کہ ایک صندوق پر بوسیدہ لباس میں بیٹھے تھے اور جیب میں پیسے بھی نہیں تھے۔ انہیں لندن کاونٹی کونسل کی غریبوں کے لیے مخصوص قیام گاہ میں لے جایا گیا ہے اور پھر ان کی اس بدحالی کے بارے میں (پاکستان ہائی کمیشن کو) اطلاع دی گئی ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا حکومت پاکستان سفارتی مشن کے سربراہوں کو ایسے فنڈ مہیا نہیں کرتی ہے جو مستحق لوگوں کی فوری نوعیت کی ضرورت پوری کرسکیں۔ لیکن میں نے اپنی ذمہ داری پر اپنے کونسلر حیدر سے کہا ہے کہ وہ یوسف علی کو مناسب اور ضروری مدد فراہم کریں تاکہ کم از کم قیمت میں ان کے لیے کمرے اور کھانے پینے کا

Marfat.com

انتظام ہو سکے۔

''میری آپ سے درخواست ہے کہ اس معاملہ میں ہمدردی سے غور فرمائیں ۔اس لیے کہ یہ کیس واقعی ہمدردی کا متقاضی ہے۔حکومت کی جانب سے ایک چھوٹا سا وظیفہ منظور کر دیں جو ان کو ایک کم قیمت بورڈنگ ہاؤس میں قیام کے لیے کافی ہو جائے اور ان کی زندگی کے چند سال جو بچ گئے ہیں وہ قدرے مناسب آرام سے گزر جائیں''۔

''انہیں کچھ کپڑوں کی بھی ضرورت ہوگی ۔آپ اتفاق کریں گے کہ تھوڑی سی رقم مثلاً ۲۰ پونڈ ماہانہ کا وظیفہ حکومت کے لیے کوئی خاص مالی بوجھ ثابت نہیں ہوگا۔علامہ یوسف علی نے اسلام اور مسلمانوں کی زبردست خدمت انجام دی ہے اور اس کے پیش نظر مناسب ہے کہ حکومت کسی حد تک سخاوت کا مظاہرہ کرے۔اگر کسی قسم کی سابقہ نظیر کی ضرورت محسوس ہو تو میں مشرقی پاکستان کے شاعر نذرالاسلام کی مثال دوں گا جنہیں پچھلے کئی سال سے ان کی شعر و ادب کے حوالے سے خدمات پر حکومت کی جانب سے معقول پنشن دی جا رہی ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ یوسف علی کے پاس نہ پیسہ ہے اور نہ کوئی ان کی مدد کے لیے آمادہ ہے۔

''چونکہ یہ درخواست فوری توجہ چاہتی ہے میں شکر گزار ہوں گا اگر اس امر کی منظوری کی اطلاع مجھے ممکن ہو تو (ڈپلومیٹک) بیگ کی ڈاک کے ذریعہ بھجوا دی جائے''(۵۸)

عبداللہ یوسف علی کی حالت ہر گھنٹہ بگڑتی جا رہی تھی ۔وہ دوبارہ بیمار ہوئے اور ۱۰ دسمبر کو فلہم کے سینٹ اسٹیفن ہاسپٹل میں ان کا انتقال ہو گیا۔اصفہانی نے ایک دوسرے مراسلے میں کراچی پیغام بھیجا جس میں انتقال کے وقت کی ٹھیک اطلاع دی گئی تھی۔

۱۱ر دسمبر ۱۹۵۳ء

''مائی ڈیر محمد علی

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

Marfat.com

کل جو خط میں علامہ عبداللہ یوسف علی کے بارے میں لکھ چکا ہوں اسی حوالے سے یہ اطلاع بڑے گہرے دکھ کے ساتھ دے رہا ہوں کہ بیچارے اس شخص کا کل رات ۸ بجے اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ مجھے سوچ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اتنی فاضل اور صاحب امتیاز ہستی کا انجام اتنا پر الم ہوا۔ خدا ان کی روح کو سکون و راحت سے نوازے''(۵۹)

ان کی زندگی کے سفر کا دائرہ آخر کار مکمل ہو گیا۔ انہوں نے اپنی نوجوانی کا بیشتر حصہ بھی مختلف اداروں میں گزارا اور ظلم یہ ہوا کہ زندگی کے آخری ایام بھی اداروں میں گزارنے پڑے۔ سلطنت برطانیا کا تھکا ہارا بوڑھا جرنیل آخر کار خاموشی سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔ محمد علی بوگرا نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بعد میں خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا ''اگر ان کا معاملہ اس درجہ خراب تھا تو کیا اچھا ہوتا کہ کوئی مجھے اس سے پہلے بروقت اطلاع دیتا تا کہ حکومت پاکستان کوئی کارروائی کرتی اور ان کی زندگی کے آخری ایام کچھ آسودگی اور سلیقہ سے گزر سکتے''۔(۶۰)

لندن کاونٹی کے کرونر نے ۱۴ اور ۱۶ دسمبر کو باقاعدہ قانونی تفتیش کی تا کہ ان کی بیوہ اور اسپتال کے عملے کا معاملہ صاف ہو جائے۔(۶۱) کاونٹی کے افسر تفتیش نے جو نتائج اخذ کیے اس کے مطابق ان کے لیے (آخری ایام میں) جو کچھ کرنا ممکن تھا وہ کیا گیا تھا۔ وفات کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا جس میں موت کا سبب ذہنی اور قلبی انحطاط درج تھا۔ پاکستان ہائی کمیشن کے اسٹاف نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ وہ ووکنگ مسجد سے قریب بروک ووڈ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کی قبر کے قریب ہی مار ماڈیوک پکتھال کی قبر ہے جو قرآن پاک کے ایک اور ممتاز اسکالر تھے۔

عبداللہ یوسف علی نے اپنی وصیت میں جو ۱۹۴۰ء میں تیار کروائی گئی۔ لائیڈز بینک، اپنے بیٹے راشد اور اپنے وکیل ہیرالڈ سمز کو اپنا ٹرسٹی اور وصیت کی تنفیذ کا ذمہ قرار دیا تھا۔ وصیت کی شرائط

Marfat.com

کے مطابق بینک نے فی الفورلندن یونیورسٹی کواس فنڈ کے بارے میں مطلع کیا جو ہندوستانی طلبہ کے لیے انہوں نے وقف کیا تھا۔ یوسف علی نے خاص طور پراس فنڈ کواپنے نام سے منسوب کرنے کے بارے میں کہا تھا۔ لیکن ۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی کورٹ نے اپنی میٹنگ میں اس کو ''وائس چانسلر کے صوابدیدی فنڈ برائے ہندوستانی طلبہ'' کے نام سے موسوم کردیا۔ (۶۳) عبداللہ یوسف علی نے اپنی ڈائریوں کے بارے میں بھی خصوصی ہدایات چھوڑی تھیں۔ وصیت کے الفاظ میں ''میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ یوپی انڈیا کے لیے اپنی یہ ساری ڈائریاں بغیر کسی ڈیوٹی کے ہدیہ کرتا ہوں (جو اس وقت سیاہ فولادی صندوق میں مقفل رکھی ہوئی ہیں۔ میں یہ بھی ہدایت دیتا ہوں کہ یہ ڈائریاں یونیورسٹی لائبریری میں جمع کردی جائیں۔ میری وفات کے بعد ۳ سال گزرنے سے پہلے نہ کھولی جائیں''۔ یہ ڈائریاں علی گڑھ نہیں پہنچ سکیں۔ ان ڈائریوں کا کیا حشر ہوا یہ بھی ان رازوں میں سے ایک ہے جو معصومہ ۱۹۶۲ء میں اپنے ساتھ قبر میں لے گئیں۔

حواشی باب ششم

۱- ایڈورڈ ہشتم نے ۱۹۳۷ء کے موسم سرما میں ہندوستان کے دورہ کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان کا پہلا سفر پرنس آف ویلز کی حیثیت سے ۱۹۲۱ میں ہوا تھا۔ اس موقع پر جو خطوط انہوں نے وطن روانہ کیے تھے ان میں اصلاحات کے حامی سیاست دانوں مثلاً مانٹیگیو پر شدید تنقید کی تھی جنہوں نے ان کے بقول مقامی باشندوں کے سحر میں گرفتار ہو کر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ملاحظہ ہو ''کنگ ایڈورڈ ہشتم'' مصنفہ فلپ زیگلر، صفحہ ۱۳۹۔ ایڈورڈ ہشتم کے تین بھائیوں میں سے جنہیں ان کی جگہ لینے کے لیے منتخب کیا گیا تھا وہ ڈیوک آف یارک تھے۔ دوسرے بھائی ڈیوک آف کنیٹ کے کردار پر بلیک میل کے ایک اسکینڈل میں ملوث ہونے کا الزام تھا جس میں ایک فرانسیسی نوجوان بھی شامل تھا اور ڈیوک آف کلاسٹر کو ناقابل اعتماد قرار دیا گیا تھا۔

۲- ملاحظہ ہو خطاب کیکسٹن ھال لندن ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء۔ اس کا اقتباس تیسرے باب میں دیا جا چکا ہے۔

۳- مونارکسٹ لیگ کے جلسہ میں یوسف علی کی تقریر جس کی روداد ''کنزنگٹن نیوز'' لندن میں ۳ر جولائی ۱۹۳۷ء کو شائع ہوئی تھی۔

۴- ایضاً

۵- ''ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ گویا ہم ایک عظیم الشان عالمی تحریک شروع کرنے والے ہیں۔ میں نے ان مساعی کا ذکر کیا ہے جو حکومت برطانیا عظمیٰ نے رائے عامہ

Marfat.com

کے زیر اثر شروع کی ہیں اور جن کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ ان کو تعلیم دی جائے اور ہر طریقہ سے ان کے حالات میں بہتری پیدا کی جائے۔ حکومت کی ان کوششوں کے علاوہ بہت سے رضا کارانہ کام کرنے والوں کی زبردست مساعی بھی ہیں جو مغربی اقوام کے لوگوں سے کروائی گئی ہیں۔ ہم یقیناً کسی زبردست اور طاقتور روحانی جذبہ کے زیر اثر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ خود ہندوستان میں بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ ان حالات میں روحانی اور مادی اصلاح و ترقی کا ایک جذبہ بیدار ہو رہا ہے۔ یورپ کے لوگ اور ہندوستانی سب مل کر یکساں طور پر اعلیٰ روحانی مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے لگے ہیں۔ اس جدوجہد کی آخری منزل ہندوستان کی روحانی بالیدگی اور رفعت معلوم ہوتی ہے'': فرانس ینگ ہسبنڈ کی تالیف ''ہندوستان میں طلوع سحر'' صفحہ ۳۱۷۔ سر فرانس یوسف علی کے لیے ایک مکمل اور اعلیٰ ترین مثالی انگریز کا کردار رکھنے والی شخصیت تھے۔ ان کے خاندان نے ہندوستان کی نوآبادیاتی انتظامیہ میں کئی نسلوں تک خدمات انجام دی ہیں۔ اور بعد میں وہ اس روائت کو برقرار رکھتے ہوئے لیڈر شپ کے مقام پر بھی پہنچے۔ خود سر فرانس کی پیدائش شمالی مغربی ہندوستان میں ۱۸۶۳ء میں مری کے پرفضا پہاڑی مقام پر ہوئی۔ ۱۹۰۳ء تک وہ تبت میں سلطنت کے نمائندے کی حیثیت سے شاہ ایڈورڈ کے عہد سلطنت میں کافی معروف حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ پورا خاندان ہی شاہی خاندان کے دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ بعد میں سر فرانس نے کشمیر میں راج کے ریذیڈنٹ (نمائندے) کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیئے۔ اور ہندوستان میں اپنے کام اور کیریئر کے دوران ایک مرحلہ پر ایک عیسائی صوفی بن جانے کے مرحلے

سے بھی گزرے۔ وہ بعد میں عالم اسلام کے بارے میں سرکاری طور پر مستند ماہر بھی تسلیم کیے گئے اور انہوں نے انڈیا آفس کے سیاسی اور خفیہ شعبہ کے لیے خلافت کے بارے میں پہلی عالمی جنگ کے بعد ایک رپورٹ بھی تحریر کی۔ ملاحظہ ہو مخطوطہ نمبر (IOL:L/P&S/11/119)۔ یوسف علی کا تعزیتی نوٹ ان کے بارے میں ''دی ٹائمز'' میں ۴/ اگست ۱۹۴۲ کو شائع ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں ''ایک طرف وہ اپنے انگریزی ورثہ اور روائت کے بارے میں سچے اور مخلص تھے۔ دوسری جانب وہ مشرقی فکر میں جو بہترین اجزاء ہیں ان کو بھی پوری طرح سمجھتے تھے۔ حقیقت میں وہ مشرق اور مغرب کے درمیان صحیح رابطہ کا ذریعہ تھے۔ وہ اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے اور اس عظیم کام کی وجہ سے بھی ان کا نام باقی رہے گا جو وہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان رشتوں کی مستحکم کرنے کے لیے کر رہے تھے''

۶۔ IOL:MSS Eur F197/119: فرانسس ینگ ہسبینڈ کے کاغذات میں ''ورلڈ کانگریس آف فیتھس'' کی پوری تاریخ موجود ہے۔ ہندوستان کے ایک سوامی جی جنہوں نے اس خیال کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا، کیدار ناتھ گپتا تھے، جنہوں نے شکاگو میں ۱۹۳۳ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس برائے مذاہب منعقد کرائی تھی۔ ینگ ہسبینڈ کو اس سلسلے کی دوسری کانفرنس میں تقریر کرنے کے لیے دعوت دی گئی تھی جو اگلے سال مئی ۱۹۳۴ء نیویارک میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے اگلے سال ایک بار پھر منعقد ہونے والی کانفرنس میں بھی انہیں خطاب کی دعوت دی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں وہ ایک ایسوسی ایشن کی برٹش کمیٹی کے صدر ہو گئے جو تھری فولڈ موومنٹ یعنی سہ رخی تحریک کہلاتی تھی۔ یعنی یونین آف ایسٹ اینڈ ویسٹ (مشرق و مغرب کا اتحاد)، لیگ آف

Marfat.com

نیبرز (پڑوسیوں کا اتحاد) اور فیلوشپ آف فیتھس (مذہبی بھائی چارہ)۔

۷- گزشتہ سال کی کانفرنس میں مسلمان مقررین صرف دو تھے۔ عبدالقادر اور عبداللہ یوسف علی۔ شیخ المراغی کو جامعہ الازہر سے مدعو کیا گیا تھا مگر وہ آنہ سکے تھے۔ شیخ عبدالقادر نے اپنی تقریر میں یوسف علی کے ترجمۂ قرآن اور ان کے علم و فضل کی بڑے شاندار الفاظ میں تعریف کی تھی۔ عبداللہ یوسف علی نے بھی اپنی جوابی تقریر میں عبدالقادر کو جدید مسلم فکر کا مستند نمائندہ قرار دیا تھا۔ ملاحظہ ہو "دے وینچر آف فیتھ" مصنفہ ینگ ہسبینڈ صفحہ ۱۴۵

۸- یہ اقتباس ورلڈ کانگریس آف فیتھس کی جانب سے بطور دستاویز "دی ورلڈس نیڈ آف ریلیجن -- دنیا میں مذہب کی ضرورت" سے لیا گیا ہے جو ۱۹۳۷ میں شائع ہوا تھا۔

۹- جرنل ڈہ نیشنز - جنیوا ۲ ستمبر ۱۹۳۷ (YA 65): ینگ ہسبینڈ کی برٹش نیشنل کونسل کے بہت سے ارکان لیگ آف نیشنز سے وابستہ تھے۔ چند نام یہ تھے: الفریڈ زمرن، لارڈ ایلن آف ہرٹ ووڈ، ڈیم الزبتھ کیڈ بری اور ڈیم ایڈتھ لٹلٹن۔

۱۰- قرآن مجید متن، ترجمہ اور تفسیر تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء، نوٹ نمبر ۲۹۹۲: "اگرچہ جدید اقوام نے عمومی طور پر غلامی کو ختم کر دیا ہے لیکن کسی عورت کو فریب دے کر یا جبراً کسی غیر ملک لے جا کر کسبی بنا دینا اب بھی ایک بڑا سماجی مسئلہ ہے جو بعض ریاستوں اور لیگ آف نیشنز کو درپیش ہے"

۱۱- ایضاً نوٹ نمبر ۴۹۲۷ "انفرادی تنازعات کا حل کرنا اجتماعی جھگڑوں کے مقابلہ میں آسان ہوتا ہے۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کے مفادات اقوام اور گروہوں کے مقابلہ میں

Marfat.com

اعلیٰ تر اور ارفع اور مقدم ہونے چاہییں۔ اس بات کی توقع کی جانی چاہیے کہ اس کے فیصلے عادلانہ ہونگے اور تنازعات کو حل کیا جائے گا اس لیے کہ امن فساد سے بہر صورت بہتر ہے۔ لیکن اگر ایک فریق جارحانہ رویہ پر تل جائے تو پوری دنیا کی اجتماعی قوت کو یکجا کر کے اس کا انسداد ضروری ہے۔ بلاشبہ ضروری شرائط یہ ہیں کہ معاملات میں کاملاً صفائی، عدل اور اعلیٰ اصولوں کا پورا احترام ملحوظ رہے۔ لیگ آف نیشنز اسی لیے ناکام ہوگئی ہے کہ یہ ضروری شرائط پوری نہیں کی گئی ہیں"۔

۱۲- جرنل ڈہ نیشنز، جنیوا: ۵ ستمبر ۱۹۳۷ (YA 65)

۱۳- ملاحظہ ہو "گریٹ برٹین اینڈ دی ایسٹ" رپورٹ ۴ نومبر ۱۹۳۷ (YA 79)۔ عبداللہ یوسف علی کا جسٹس امیر علی کے صاحبزادے وارث نے ساتھ دیا تھا۔ دونوں میں کئی چیزیں قدر مشترک تھیں: دونوں آئی سی ایس تھے اور دونوں نے یو پی میں لارڈ میسٹن کے ماتحت ملازمت کی تھی۔ دونوں نے دو دو بار انگریز خواتین سے شادی کی تھی۔

۱۴- ہربرٹ سموئیل، فلسطین میں برطانیا کا ہائی کمشنر رہ چکا تھا۔ لبرل پارٹی کا ایک رہنما اور صہیونی تھا لیکن "کانگریس آف فیتھس" میں اس کی حیثیت اتنی نمایاں تھی کہ ینگ ہسبینڈ کے بعد وہی اس کا کرتا دھرتا ہوگیا۔ لارڈ ریڈنگ کی طرح اس نے بھی فلسطین میں الیکٹرک کارپوریشن کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں جس کو خاص طور پر یہودیوں کے وطن میں "بجلی مہیا کرنے کے منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے قائم کیا گیا تھا"۔ وہ چار فعال اور متحرک افراد جن کے نام تاریخ میں صیہونیت کے حوالہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے یہ ہیں: تھیوڈور ہرزل جس نے فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کا خواب دیکھا۔ چائم ویزمین جس نے موقع کو صحیح وقت پر اپنی گرفت میں لیا۔

Marfat.com

آرتھر بالفور جس نے دنیا کو آمادہ کیا کہ وہ ایک پرانے عہد کی جدید معاہدہ کی شکل میں تجدید قبول کرے اور ہربرٹ سموئیل جس نے ایک خیال کو عملی شکل دے دی اور الفاظ کو حقیقت کا جامہ پہنایا'' ملاحظہ ہو رونالڈ اسٹارز کی یادداشتیں بعنوان اور نیٹیشنز'' صفحہ ۴۳۷۔ ہربرٹ سیموئل فلسطین میں ایک یہودی ریاست کا حامی تھا لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی اس جدوجہد کا مخالف تھا جو وہ قیام پاکستان کے حصول کے لیے کر رہے تھے۔ کیونکہ اس کے نزدیک دنیا میں پہلے ہی بہت سی خودمختار ریاستیں ہیں جن سے عالمی امن متأثر ہو سکتا ہے'' ملاحظہ ہو کے عزیز کی تالیف ''برٹین اینڈ مسلم انڈیا'' صفحہ ۱۴۷۔

۱۵- یہ بیان یوسف علی کی ان تقریروں کی بنیاد پر ہے جو ''دی سسکس ڈیلی نیوز'' مورخہ ۷/اکتوبر ۱۹۳۷ (YA 70) اور ''دی براٹن اینڈ ہووہیرالڈ'' مورخہ ۹/اکتوبر ۱۹۳۷ (YA 72) میں شائع ہوئی تھیں۔

۱۶- ''کیمرج ریویو'' ۱۴/نومبر ۱۹۳۷ (YA 80)

۱۷- ''انٹرنیشنل افیرز'' شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۳۷ صفحہ ۷۷۹ (YA 62)

۱۸- ''دی مسلمان'' کلکتہ، ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ (YA 95)

۱۹- ملاحظہ ہو ایم-ایچ سید کی تالیف ''محمد علی جناح-اے پولیٹیکل اسٹڈی'' صفحہ ۲۰۵

۲۰- بیدار ملک کی تصنیف ''تحریک پاکستان اور اسلامیہ کالج'' صفحہ ۲۹۶

۲۱- ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور ۱۸/جنوری ۱۹۳۸ (YA 93)

۲۲- محمد عبداللہ چغتائی کی تالیف ''اقبال کی صحبت میں'' صفحہ ۴۸۹

Marfat.com

اقبال نے جو ''مبصر زمانہ'' کی اصطلاح استعمال کی تھی اور جس کے لیے انگریزی لفظ ''Erudite'' استعمال کیا گیا، وہ بڑا معنی خیز ہے اس لیے کہ اردو ترکیب میں فراست وبصیرت کا مفہوم شامل ہے۔

۲۳۔ ''دی ٹائمز'' ۱۵راپریل ۱۹۳۸ء

۲۴۔ ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور ۱۴رمئی ۱۹۳۸ (YA 105)

۲۵۔ اقبال نے جناح کو کئی خطوط تحریر کیے تھے جس میں اپنے مسلم قومیت کے تصور کی تشریح کی تھی ایسے ہی ایک خط میں جو ۱۹۳۷ میں لکھا گیا انہوں نے جناح کو یہ رائے دی تھی'' مسلمانوں کی غربت کے مسئلہ کو حل کرنا کس طرح ممکن ہے؟ اگر (مسلم) لیگ ان سے اس قسم کے کوئی وعدے نہیں کر سکتی تو مجھے یقین ہے کہ مسلمان عوام پہلے ہی کی طرح اب بھی اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا ایک حل یہ ہے کہ اس کے بارے میں اسلام کے قوانین کو نافذ کیا جائے اور ان قوانین کو جدید عہد کے افکار کی روشنی میں مزید ترقی دی جائے۔ اسلام کے قانون کے طویل، عمیق اور بڑے محتاط مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کی بقدر ضرورت کفالت کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں اسلامی شریعت کی تائید وتقویت اور اس کا ارتقاء ممکن نہیں ہے جب تک مسلمانوں کی آزاد ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ آجائیں۔ اگر ہندوستان کے اندر ایسا ممکن نہ ہو سکا تو دوسرا متبادل صرف یہی رہ جاتا ہے کہ یہاں خانہ جنگی ہو جو فی الحقیقت کچھ عرصہ سے ہندو مسلم فسادات کی شکل میں چل ہی رہی ہے'' ملاحظہ ہو ایم-ایچ سید کی تالیف ''محمد علی جناح'' صفحہ ۱۸۳۔

Marfat.com

۲۶- یوسف علی نے برطانیا میں اسکاؤٹ جمبوری'' میں شریک ہندوستان کے طلبہ کے ایک گروپ سے خطاب کیا تھا جس کی رپورٹ ''ساؤتھ پورٹ وزیٹر'' میں ۲۱/اکتوبر ۱۹۳۷ کو شائع ہوئی تھی (YA 73)

۲۷- اس کا عنوان ''اسلام میں نجات اور فلاح کا تصور'' تھا۔ بعد میں یہ پروگریسو اسلام کے سلسلہ کے چودھویں پمفلٹ کے طور پر شائع ہوا تھا۔

۲۸- ملاحظہ ہو عبداللہ یوسف علی کا مضمون ''ڈاکٹرن آف ہیومن پرسنلٹی ان اقبالز پوئٹری۔ یعنی اقبال کی شاعری میں انسانی شخصیت کا تصور'' یہ مضمون ''ٹرانسز یکشنز آف دی رائل سوسائٹی آف لٹریچر نیو سیریز جلد XVIII مطبوعہ ۱۹۴۰ء میں شامل ہے۔

۲۹- ''کریسنٹ'' اسلامیہ کالج لاہور کا مجلّہ اکتوبر ۱۹۳۶ء۔ یہ اقتباس عبداللہ یوسف علی کے آرٹیکل "Social Equality in Islam: A summary of Principal's sermon on 31 May 1936" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ تقریر ۳۱ مئی ۱۹۳۶ کو کالج میں ہوئی تھی عنوان کا مطلب ہے ''اسلام میں سماجی مساوات، پرنسپل کے وعظ کا خلاصہ''

۳۰- ''ایڈمنٹن جرنل'' ۸/دسمبر ۱۹۳۸ (YA 239)

۳۱- ''اوک وڈ اوریکل'' ۱۹۳۹۔ اوک وڈ کالجیٹ انسٹی ٹیوٹ۔ ٹورانٹو کا جریدہ (YA300)

۳۲- ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور ملاحظہ ہو مضمون ''میرا کناڈا کا تیسرا سفر'' ۷/ اپریل ۱۹۳۷ (YA 297)

۳۳- برطانیا کی مسلم سوسائٹی کچھ روش عام سے ہٹے ہوئے انگریزوں کے ایک کلب سے

Marfat.com

مماثلت رکھتی تھی۔اس کلب کے ممتاز ارکان میں سے ایک سر ارنسٹ بینٹ تھے جو اُمّ درمان ۱۸۹۸ میں ہونے والے جنگی معرکہ میں شامل تھے۔ان کا نام ''ہواز ہو'' میں اس طرح ہے کہ یہ صاحب آسیب زدہ مکانات اور جگہوں پر تحقیق کرتے تھے اور یہ ان کا مشغلہ تھا۔دوسرے چند خطاب یافتہ حضرات میں لیڈی ہیڈ لے اور لارڈ ہیرنگٹن بھی تھے جو اس کلب سے وابستہ تھے۔لارڈ ہیرنگٹن اسکاٹ لینڈ میں بارہ ہزار ایکڑ زمین کے مالک تھے اور جب وہ ۱۹۰۳ سے ۱۹۰۷ کے درمیان بمبئی کے گورنر تھے تو اس دوران سارے اسکاٹ لینڈ کے فری میسنری کے موسٹ ورشپ فل گرینڈ ماسٹر کا منصب بھی ان کے پاس ہی رہا۔(اس معلومات کا مصدر ہے اخبار ''فری میسن اینڈ میسانک السٹریٹڈ'' بابت ۲۳ رفروری ۱۹۰۷)۔مئی ۱۹۳۷ کی میٹنگ کا صدر اسماعیل ڈی یورک تھا جو سوسائٹی کا بھی صدر تھا۔اس واقعہ کی خبر ''دی ایسٹرن ٹائمز'' لاہور میں ۲۶ مئی ۱۹۳۹ء کو چھپی تھی(YA 304)

۳۴- لاہور سے شائع ہونے والے ''ٹریبون، اخبار کے ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۹ء کے شمارہ میں یوسف علی کا انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے برطانیا سے ہندوستان کی جانب اپنے بیرونی سفر کی روداد کا ذکر کیا تھا۔

۳۵- یہ نظم ہاتھ سے تحریر کی گئی ہے اور اس پر "AYA" کے حروف سے دستخط کیے گئے ہیں اور اس پر ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء کی تاریخ درج ہے۔ایک نوٹ میں یہ وضاحت ہے کہ ''خوش قسمت بندرگاہ'' کے الفاظ پورٹ سعید کی جانب اشارہ ہے۔تیسرے بند کے تیسرے مصرع میں ایک لفظ صحیح پڑھا نہیں گیا لیکن مصنف نے اس سے انگریزی لفظ (bereft) مراد لیا ہے۔(YA 360)

Marfat.com

۳۶- ''اسٹیٹسمین''، دہلی۱۴/اکتوبر۱۹۳۹ء

۳۷- IOL:L/1/1/1268 فائل نمبرا: یہ یوسف علی کی ذاتی فائل ہے اور اس میں وہ خط و کتابت محفوظ ملتی ہے جو وزارت اطلاعات اور انڈیا آفس کے مابین یوسف علی کی ان خدمات کے بارے میں کی گئی تھی: جس کا تعلق پروپیگنڈے سے تھا۔ اسی فائل میں وہ مضمون موجود ہے جس کا عنوان ''برطانوی جمہوریت ایک مسلمان کی نظر میں'' تھا اس پر دسمبر ۱۹۳۹ لکھا ہے اس فائل میں ایک خط موجود ہے جو ۱۸/اگست ۱۹۴۱ کو ڈی کلف کی جانب سے ایچ جے فیلس کے نام تحریر کیا گیا ہے۔ ڈی کلف کا تعلق وزارت اطلاعات کے ہندوستان سے متعلق شعبے سے تھا جبکہ فیلس ''انڈیا آفس'' سے متعلق تھا۔ اس خط میں پانچ ایسے فیچر مضامین کی فہرست ہے جو یوسف علی نے تیار کیے تھے۔ جو مندرجہ ذیل ہے۔

صفحہ ۷ ''مسلمانان ہند جمہوری حکومتوں کے ساتھ ہیں''

صفحہ ۱۰ ''جنگ کے بارے میں ہندوستان کا رویہ''

صفحہ ۳۶ تا ۴۰ ''برطانوی جمہوریت ایک مسلمان کی نگاہ میں''

صفحہ ۶۸ تا ۷۰ ''ہندوستان میں برطانوی حکومت''

کلف نے لکھا تھا ''یہ سوال بھی اٹھا کہ انہوں نے اپنا کوئی قلمی نام استعمال کیا تھا یا نہیں، لیکن فیصلہ یہ ہوا تھا کہ وہ کوئی قلمی نام استعمال نہیں کرتے تھے۔ میں تمام آرٹیکلز اس دوران روانہ کر رہا ہوں تا کہ مزید تاخیر نہ ہو''

۳۸- ''دی ایشیاٹک ریویو'' جلد XXXVI ۱۹۴۰ صفحہ 74-75 (YA 316)

Marfat.com

۳۹- ملاحظہ ہو "اے کلچرل ہسٹری آف انڈیا ڈیورنگ دی برٹش پیریڈ" یعنی عہد برطانیا میں ہندوستان کی ثقافتی تاریخ - اقتباس میں ۳۸-۱۹۳۷ کے سالوں کا بیان ہے۔ اس کتاب کا اردو متن ستمبر ۱۹۳۱ میں مکمل ہو گیا تھا۔ انگریزی ایڈیشن ۱۹۴۰ء میں بمبئی سے طبع ہوا جس میں ۱۹۳۱ سے بعد کے سالوں میں ہونے والے واقعات وحوادث کا ذکر بھی اضافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

۴۰- "دی ایشیاٹک ریویو" نمبر XXXVI مطبوعہ ۱۹۴۰، صفحہ ۲۲۹-۲۲۶ عبداللہ یوسف علی نے اپنا منصوبہ ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ میں پیش کیا تھا جو ۶ رفروری ۱۹۴۰ کو کاکسٹن ہال میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت سر ہیرالڈ ولبرفورس بیل نے کی تھی۔ اگلے روز "دی ٹائمز" میں جلسہ کی روداد چھپی تھی۔

۴۱- کے-کے-عزیز نے یوسف علی کی مخلوط سیاسی جماعت کی تجویز پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "بہت اچھے وقتوں میں بھی ان کے اس منصوبہ میں پیش کردہ تجویز کا روبہ عمل لانا اور اس کی تکمیل دشوار اور دور از کار بات تھی۔ لیکن اس موقع پر تو وہ تکلیف دہ حد تک بے وقت کی راگنی تھی" ملاحظہ ہو کے-کے عزیز کی کتاب "اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان" صفحہ ۶۱۲-۶۰۹

۴۲- "ڈیسکس نیوز" ساؤتھمپٹن" مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۴۰ء (YA 331)

۴۳- "ڈیلی میل" لندن، ۱۳ رمارچ ۱۹۴۰، (YA 325) اوڈائر، "O'Dwyer" کا قتل ایک سکھ کے ہاتھوں انتقاماً ہوا تھا جس کا سبب اس کے گورنری کے زمانہ میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام تھا۔ لیکن بہر صورت جو افسر ۱۹۱۹ کے المیہ کا ذمہ دار تھا وہ جنرل ڈائر (General Dyer) تھا۔

Marfat.com

۴۴- ملاحظہ ہو مخطوطہ نمبر IOL:/L/y/1/1268 فائل نمبرا آرٹیکل ''اسلام اینڈ دی نازیز''

۴۵- ''ناردرن ڈیلی میل'' ویسٹ ہارٹل پول مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۰ (YA 343)

۴۶- ''ویسٹرن ڈیلی پریس'' برسٹل، ۲ اکتوبر ۱۹۴۰ (YA 346)

۴۷- مراسلہ ''دی ٹائمز'' ۱۵ جنوری ۱۹۴۱ (YA 352)

۴۸- ''ساوتھ پلیس اتھیکل سوسائٹی منتھلی ریکارڈر'' جولائی ۱۹۴۱ (YA 361)

۴۹- ایضاً IOL:L/J.J/1268

۵۰ ایضاً۔ یہ نوٹ فائل کے اوپری کور پر درج ہے۔ مصنف (ایم-اے شریف) نے یہ مسئلہ انڈیا آفس لائبریری کے اسٹاف کے سامنے ۱۹۸۹ء میں رکھا تھا لیکن ان کو یہ بتایا گیا کہ دفتر خارجہ سے یہ بات معلوم نہیں ہوسکی کہ آیا ''ایس'' سلسلہ کے کاغذات جو ۱۹۸۲ء میں فائل سے ہٹا لیے گئے تھے، کے بارے میں شدت احتیاط میں کچھ کمی یا نرمی ممکن ہے یا نہیں۔ ان کاغذات کی حساس نوعیت کا معاملہ غالباً کچھ ایسے ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق رہا ہوگا جن سے عبداللہ یوسف علی کے دیرینہ روابط تھے۔ ان میں سر فیروز خان نون بھی شامل تھے جو ۱۹۴۱ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر تھے۔ اور وراث علی تھے جو جنگ کے امور کے سلسلے میں ان کے مشیر تھے۔ اول الذکر یعنی فیروز خاں نون ممکن ہے فلسطین میں صہیونی ریاست کی تخلیق کی تجویز کے سلسلے میں شریک رہے ہوں۔ ملاحظہ ہو ''امپیکٹ انٹرنیشنل'' جلد ۲۱: شمارہ ۳۲۴، ۱۹۹۱ فیروز خاں نون بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بھی رہے تھے۔

۵۱- ''دی اسلامک ریویو'' ووکنگ جلد ۳۱ نمبر ۲۔ فروری ۱۹۴۳ء صفحہ ۱۰۱-۱۰۰ اس جریدہ

کے ایک تعزیتی نوٹس میں جو فروری ۱۹۵۴ کے شمارہ میں شائع ہوا درج ہے کہ عبداللہ یوسف علی اس مسجد کے ایک ٹرسٹی رہے تھے۔

۵۲- ملاحظہ ہو انڈین آرمی لسٹ'' اکتوبر ۱۹۴۴۔ ان کے بیٹے کا پورا نام ''راشد یوسف علی'' درج ہے۔

۵۲ الف۔ مصنف کی یہ رائے بے جواز نظر آتی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح قیام پاکستان کے بعد صرف ایک سال زندہ رہے۔ اس دوران نوزائیدہ ملک طرح طرح کے مسائل سے دوچار تھا، ان کی صحت تیزی سے گر رہی تھی اور عبداللہ یوسف علی پاکستان کے منظر نامے سے بہت دور انگلستان میں مقیم تھے۔ مدیر

۵۳- سائیکلو اسٹائل کے ذریعہ طبع شدہ اقبال ایسوسی ایشن'' کے بارے میں چھ صفحوں پر مشتمل دستاویز جو پاکستان ہائی کمیشن لندن نے جاری کی تھی۔ اس کا تذکرہ ایس۔اے درانی کی کتاب ''اقبال یورپ میں'' کے صفحہ ۶۵ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

۵۴- ''دی ٹائمز'' ۱۵ر دسمبر ۱۹۵۳ء کے پہلے ایڈیشن میں دو تہائی کالم پر مشتمل عبداللہ یوسف علی کے بارے میں تعزیتی نوٹ شائع ہوا تھا۔ اس دن کے اخبار کے دوسرے ایڈیشنوں میں یہ نوٹ بالکل موجود نہیں تھا۔

۵۵- عبداللہ یوسف علی رائل ایمپائر سوسائٹی کے ایک قدیم رکن تھے۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۲۹ کو چرچ کی ایک شخصیت ریورنڈ اسٹیوارٹ گورڈن یونسنی کی جانب سے نامزدگی پر سوسائٹی کے فیلو منتخب ہو گئے تھے جو سٹی آف لندن کے سینٹ میری لی بو کے ریکٹر تھے۔ اس وقت سر جارج بو گھے نے جو یوپی میں آئی سی ایس افسر رہ چکے تھے اس تجویز

Marfat.com

کی تائید کی تھی۔اس سوسائٹی کی ملکیت میں ٹرافالگر اسکوائر کے قریب ایک خوبصورت لائبریری تھی اور کچھ ایسے کمرے بھی تھے جن میں ارکان جگہ محفوظ کروا لینے کی صورت میں رات بھر ٹھہر بھی سکتے تھے۔

۵۶- ''الیفر کا ایونٹس'' لندن نومبر ۱۹۸۵ء

۵۷- ''دی ڈیلی ٹیلیگراف'' لندن ۱۷دسمبر ۱۹۵۳ء

۵۸- اصفہانی کا مراسلہ بنام محمد علی بوگرا مورخہ ۱۰/دسمبر ۱۹۵۳ء ملاحظہ ہوں محمد علی بوگرا پیپرز، انٹرنیشنل سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز، لندن

۵۹- ایضاً۔اصفہانی کا مراسلہ بنام محمد علی بوگرا۔۱۱/دسمبر ۱۹۵۳

۶۰- ایضاً۔بوگرا کا خط بنام اصفہانی۔۱۴/دسمبر ۱۹۵۳

۶۱- تحقیقاتی رپورٹ کا نمبر ۸۶ تھا اور اس کا اندراج ویسٹرن ڈسٹرکٹ آف لندن (بشمول ویسٹ منسٹر) کے رجسٹر میں ہوا تھا۔لیکن تحقیقاتی افسر (کرونر) کے کاغذات محفوظ نہیں رہے۔

۶۲- ہنری، میسپ اینڈ سمز وکلاء کی کمپنی تھی جس کا دفتر نمبر ۱۱، لنکنز ان فیلڈز میں تھا۔اس کی جانب سے ''ومبلڈن بر و نیوز'' میں ۲۲/جنوری ۱۹۵۴ء کو نوٹس شائع ہوا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ جس کسی کو بھی متوفی کی جائیداد کے حوالے سے کوئی دعویٰ ہو تو وہ ان سے یا لائیڈز بنک سے رابطہ کرے جن کا ایگزیکٹو اور ٹرسٹی ڈیپارٹمنٹ ان کی ویسٹ اینڈ برانچ میں ہے۔راشد کا نام اس نوٹس میں شاید اس لیے نہیں تھا کہ غالباً وہ ملک میں نہیں تھے۔

اس عارضی منظوری کا حکم نامہ پرنسپل پروبیٹ رجسٹری کی جانب سے بینک کے نام ۲/

Marfat.com

اپریل ۱۹۵۴ء کو جاری ہو گیا تھا۔ اس انتہائی پیچیدہ قسم کے وصیت نامہ میں یوسف علی کی بیوی اور بیٹے کو ٹرسٹ کے سرمایہ میں سے کچھ آمدنی مقرر کی گئی تھی۔ ان کی وصیت کے الفاظ کے مطابق ''میری بقیہ جائیداد کی آمدنی میں سے ٹرسٹیوں کی جانب سے سہ ماہی کے آغاز میں ۴۰ پونڈ کی رقم میری بیوی معصومہ گرٹریوڈ یوسف علی کو زندگی بھر یا پھر اگر وہ دوسری شادی کر لیتی ہے تو اس وقت تک دی جائے اور اس طرح ۴۰ پونڈ کی ایک رقم میرے بیٹے راشد کو بھی ادا کی جائے۔ اگر اس کے بعد کچھ آمدنی باقی رہے تو اصل سرمایہ میں شامل کر دی جائے اور یہ کارروائی ہر سال اپریل کی پہلی تاریخ کو کی جائے۔ پہلی سہ ماہی کی یہ ادائیگیاں میری وفات کے بعد جلد از جلد کر دی جائیں اور اس کے ہر تین ماہ بعد سہ ماہی ادائیگیوں کو باقاعدگی سے کیا جائے۔ جب تک میرے ٹرسٹیوں کی جانب سے میری بقیہ جائیداد کی آمدنی کا تعین نہیں ہو جاتا اور وہ انہیں وصول نہیں ہو جاتی سہ ماہی ادائیگیاں اصل سرمایہ سے کی جائیں''۔

۱۹۹۱ میں مصنف (ایم-ایم شریف) نے بینک سے رابطہ کیا تھا لیکن بینک نے یوسف علی کی فیملی کے متعلق کسی بھی قسم کی معلومات فراہم کرنے کے لیے رضامندی ظاہر نہیں کی۔ لیکن مصنف کا گمان ہے کہ راشد علی نے دوسری جنگ عظیم کے بعد حیدرآباد پولیس میں ملازمت کر لی تھی۔

۶۳- ۱۹۵۴ میں کورٹ آف یونیورسٹی نے ایک میٹنگ میں اس مسئلہ پر گفتگو کی کہ ۲۰ ہزار پونڈ مالیت کی جائیداد میں سے کتنا حصہ علیحدہ رکھ دیا جائے تاکہ معصومہ اور راشد علی کی سہ ماہی ادائیگی باقاعدگی سے جاری رکھی جا سکے۔ تین ہزار پونڈ کی وفات کی ڈیوٹیاں ادا کرنے کے بعد یہ تجویز کیا گیا کہ چھ ہزار پونڈ وائس چانسلر کے صوابدیدی فنڈ کے

Marfat.com

لیے فوری طور پر مہیا کیا جا سکتا ہے۔ بقیہ گیارہ ہزار پونڈ ٹرسٹ کے نگراں اپنے پاس رکھیں گے جس کے ذریعہ یوسف علی کی فیملی کے لیے زندگی بھر وہ آمدنی برقرار رکھی جا سکے جو وصیت میں رکھی گئی ہے۔

۶۴۔ گرٹروڈ معصومہ علی کا انتقال 67 سال کی عمر میں لورپول میں ہوا۔ عبداللہ یوسف علی کی پہلی بیوی ٹیریسا شیلڈرز کا انتقال برن ماؤتھ میں ۱۹۵۶ میں ۸۴ سال کی عمر میں ہوا تھا۔

Marfat.com

حصہ دوم

مساعیٔ جلیلہ

Marfat.com

Marfat.com

باب ہفتم

تعلیمی مقاصد اور اہداف

عبداللہ یوسف علی کی شہرت بلاشبہ ان کے ترجمہ اور تفسیر قرآن کی وجہ سے ہے اور وہ اس کے بجا طور پر مستحق بھی ہیں لیکن ان کا دوسرا بڑا کارنامہ تعلیم کے میدان میں ہے۔ متعدد تعلیمی کانفرنسوں میں ان کا کردار مرکزی رہا تھا اور وہ پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کی انتظامیہ کمیٹی کے فیلو اور رکن بھی تھے۔ ساتھ ہی علی گڑھ یونیورسٹی کی کورٹ میں بھی ان کی خدمات ریکارڈ پر ہیں۔ وہ ایک ایسی علمی شخصیت تھے جنہوں نے لندن یونیورسٹی میں لیکچر دیے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے دو بار پرنسپل رہے اور کئی نصابی کتابیں بھی لکھیں۔ وہ فی الحقیقت ایک عملی ماہر تعلیم تھے۔ اور سکنڈری اسکولوں کے نظام الاوقات کی جدول سے لے کر اساتذہ کی تنخواہوں کے مسائل اور تعلیم بالغاں کی مہموں تک ہر کام بڑے سکون اور دلچسپی سے کر سکتے تھے۔ ۱۹۳۰ کی دہائی میں پنجاب کی یونینسٹ حکومت ان سے مشورہ کی طلب گار ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ کام تقسیم ہند سے قبل کیا تھا لیکن اس طرح انہوں نے پنجاب کے طویل مدت کے تعلیمی پروگرام کے خدوخال کی تشکیل میں مدد کی جس کا فائدہ بالآخر پاکستان کو پہنچا تھا۔ ان کاموں نے ان کو برصغیر ہند کا نئی صدی میں ایک ممتاز ماہر تعلیم تسلیم کروا دیا تھا۔ تعلیمی مسائل کے حوالے سے ان کی تقریروں اور تحریروں کا موضوع تین اساسی خیالات سے ضرور بحث کرتا تھا جس کی اضافی تشریح ضروری ہے: مذہبی تعلیم اور مسلکی سکول؛ ثانوی مدارس، جامعات اور تعلیم بالغاں کے لیے حکمت عملی اور منصوبہ ہائے کار؛ اور زبان کا مسئلہ۔

عبداللہ یوسف علی کی اپنی ابتدائی تعلیم بمبئی کے پہلے مسلم پرائمری اسکول میں ہوئی تھی

Marfat.com

جس میں دینی تعلیم کے ساتھ برطانوی نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم کا انتظام تھا۔ تقریباً دس سال کی عمر سے سات برس بعد تک جو انہوں نے بمبئی میں گزارے وہ ایک اسکاٹش مشنریوں کے زیر اہتمام چلنے والے اسکول اور کالج میں زیر تعلیم رہے۔ بعدازاں تین سال کیمبرج میں رہے۔ ان کو تعلیمی زندگی سے والہانہ لگاؤ تھا اور انہوں نے اپنی جائیداد میں سے ایک حصہ ایک ایسے فنڈ کے قیام کے لیے چھوڑا تھا جس سے لندن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی طلبہ کو فائدہ پہنچ سکے۔ ان کو بلاشبہ یہ غیر معمولی اعزاز بھی حاصل ہوا تھا کہ ان کو انتہائی ممتاز اور مختلف قسم کے تعلیمی مشاہیر سے ذاتی طور پر ملنے کا خوشگوار تجربہ ہو چکا تھا جن میں سرسید احمد خاں اور ماڈام مانٹیسوری جیسی شخصیات شامل تھیں۔

اگرچہ انہوں نے خود کوئی نیا نظام تعلیم وضع نہیں کیا تھا لیکن تعلیم کے حوالے سے ان کا نقطۂ نظر ایسے طریق کار کی ہی اجازت دیتا تھا جس میں قابل عمل اور قابل حصول ہونے کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ جن اداروں سے وہ وابستہ رہے ان کو سیدھے اور صاف انداز میں مضبوط بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کو تعلیمی مسائل سے جو گہری وابستگی تھی اس نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ زمانے اور وقت کی رفتار کی مخالف سمت سفر کریں۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمان رہنما جو واقعی اہم تھے، مثلاً علی برادران، جناح اور اقبال وغیرہ، ان کے نزدیک سیاسی آزادی کی تحریک ہر چیز پر مقدم تھی۔ وہ خود ''متنازعہ یا اختلافی سیاست'' پر مبنی کام سے احتراز کرتے تھے جس سے انگریزوں کو پریشانی ہو یا ان پر الزام آتا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اختلافی سیاست ہندوستان کی ترقی کے لیے نقصان دہ ہے اور اصل مسائل سے ہماری توجہ ہٹا دیتی ہے۔ وہ حالات سے قطعاً صرف نظر کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر پر ثابت قدم تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۹ میں اینگلو عربک کالج دہلی میں تقریر کرتے انہوں نے طلبہ کی توجہ جن اہم مسائل کی طرف مبذول کرائی وہ اس کام کے بارے میں تھی جو تعلیم، صفائی ستھرائی اور مناسب رہائش کی فراہمی کے میدان میں کیے جانے ضروری تھے۔ یہ وہ مسائل تھے جن کی

طرف ملک کے نوجوانوں کو فوری توجہ دینی چاہیے۔[1] یہ ایک ایسا بیان تھا جو ایسے وقت میں دیا گیا جب ملک میں سیاسی کارروائی عروج پر تھی اور کانگریس، مسلم لیگ اور وائسرائے یعنی ہر فریق اس کوشش میں تھا کہ جنگ کی صورت حال سے اپنے اپنے مقاصد کے لیے فائدہ اٹھایا جائے۔ البتہ ان کے نقطۂ نظر کا یہ فرق و فاصلہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنی ان آرزوؤں اور جذبوں کو پس پشت ڈال دیتے جو ان کے دل میں مسلمانوں کے عزت و وقار کی بحالی کے لیے موجود تھا۔

یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۵ء میں علامہ محمد اقبال نے بہت سے لوگوں میں سے ان کو اسلامیہ کالج کی پرنسپلی کے لیے سب سے بہتر انتخاب قرار دیا۔ حالانکہ ان کو علم تھا کہ ان کے سیاسی عقائد بہت مختلف ہیں۔ عبداللہ یوسف علی نے بھی اس اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ ایک بار ایک طالب علم ان کے دفتر میں بڑی عاجزی اور مسکین شکل بنائے داخل ہوا۔ اس کے ایسے انداز اور رویہ کے نتیجہ میں اس پر ان الفاظ میں سرزنش ہوئی ''ایک مسلمان نوجوان اس طرح اپنے آپ کو جھکا کر عاجزی اور تواضع کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ سیدھے کھڑے ہو کر اعتماد سے بات کرو''[2] یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جو ان امیدوں اور تمناؤں کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے جو یوسف علی کو اگلی نسل سے تھیں۔

عبداللہ یوسف علی ہندوستان میں مذہبی فرقوں کے قائم کردہ اسکولوں کے ساتھ تعاون کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ غالباً ان کا محتاط رویہ ان کے اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر تھا۔ انہوں نے ایسے تعلیمی اداروں میں خود بھی پڑھا تھا اور ان میں پرنسپل بھی رہے تھے۔ ان کا پہلا اعتراض خالصتاً فنی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ علی گڑھ جیسے تعلیمی ادارے میں بھی ''مذہب کی تعلیم دینے والے اساتذہ ان ہی پرانے خطوط پر مقرر کیے جاتے ہیں جو والدین یا باہر کے معاشرہ کے لیے تو پسندیدہ ہوتے ہیں لیکن خود طلبہ کو قطعاً متاثر نہیں کرتے''[3] جب کبھی کوئی ایسی کمیٹی وغیرہ تشکیل دی جاتی ہے جو دین و مذہب کے معاملے میں ذرا وسعت نظری کی گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کرے تو

Marfat.com

ارکان مختلف اور متضاد نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور موافقت کی اگر کوئی صورت پیدا بھی ہو جائے تو ان کمیٹیوں کی رپورٹ کو صرف ریکارڈ میں محفوظ کر کے فراموش کر دیا جاتا ہے۔ عبداللہ یوسف علی اصل میں ان ''سفید ریش'' علماء پر نکتہ چیں تھے جو انتہائی دقیانوسی طریقہ سے مذہبی تعلیم دیتے تھے اور ''بحیثیت ایک طبقہ کے ان کو کسی بھی قسم کی دینی تعلیم و تدریس کا ذوق تھا اور نہ صلاحیت''۔ (۴)

مسلمانوں کے مابین دینی تعلیم کے مضامین اور ان میں شامل مواد کے حوالے سے اختلافات اور اچھے اساتذہ کی کمی کے علاوہ بھی یوسف علی کو دینی و مذہبی تعلیم کو بطور ایک رسمی مضمون نصاب میں شامل رکھنے پر بعض بڑے گہرے فلسفیانہ نوعیت کے ذہنی تحفظات تھے بالخصوص ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی سطح پر مذہبی تعلیم کے حوالے سے۔ ستمبر ۱۹۳۸ء میں آل سیلون مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ اس نوعیت کی تعلیم و تدریس سے ممکن ہے دینی علوم کے الفاظ پڑھا دیئے جائیں لیکن ان کے معانی و مفاہیم اور اصل روح کا ابلاغ ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے کہا تھا ''مجھ سے بار بار کہا گیا ہے اور اب آپ نے بھی کہا ہے کہ میں مذہبی تعلیم کے نصاب اور نظام تدریس کی تیاری میں مدد کروں۔ میری رائے میں دینی تعلیم کا نصاب تیار کرنے کا فائدہ بہت کم ہے۔ یہ کام اس وقت مفید ہو سکتا ہے جب ہم دینی علوم کے ماہرین تیار کرنا چاہتے ہوں جن کا اصل کام مذہبی امور کی ذمہ داری سنبھالنا ہو۔ اس کے لیے تو ضروری ہے دینی تاریخ، دینی فلسفہ و حکمت، ادب اور عربی زبان و ادب کا عالمانہ مطالعہ کروایا جائے جس کے لیے ماہرین کو پوری زندگی کھپانا پڑے گی۔ روزمرہ کی زندگی گزارنے کے لیے عام انسان کی ضرورت یہ نہیں ہے۔ بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ ہر بچہ کو زندگی گزارنے کے صحیح رویے اور اخلاق کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ اسلام ایک آفاقی دین ہے۔ اس لیے یہ تعلیم ہر جگہ دین کی مانند یکساں ہی ہو گی۔ ہماری دینی تعلیم کا مقصد یہ ہو کہ ہمارے بچے بہتر مرد اور عورت بن سکیں۔ نہ یہ کہ ان کی شخصیت اتنی ٹیڑھی میڑھی اور پیچیدہ ہو جائے کہ زندگی کے مختلف مرحلوں میں ٹھیک مقام حاصل کر پائیں اور نہ قومی

Marfat.com

زندگی میں کوئی کردار ادا کر سکیں''۔ اس کے بعد غالباً خود اپنی پرورش کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے اپنی بات میں یہ اضافہ کیا ''اس قسم کی تعلیم و تربیت کے لیے سب سے بہتر زمانہ بچپن کا ابتدائی حصہ ہے اور سب سے بہتر جگہ گھر ہے''۔ (۵) عبداللہ یوسف علی کے سیاسی نظریات ان کا نقطۂ نظر یہ بنا چکے تھے کہ مذہبی تعلیمی ادارے تقسیم در تقسیم کے عمل کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ مسلمان والدین اپنے بچوں کے لیے بے خدا اور بے روح تعلیم کے روادار نہیں ہوں گے۔ دیکھا یہ گیا تھا کہ مذہبی فکر کی بنیاد پر دی جانے والی تعلیم میں جب شدت پسندی جگہ پا جاتی ہے تو یہ فی نفسہ مذہب میں فرقہ واریت کو تقویت اور دوام عطا کرتی ہے۔ پھر یہ فرقہ واریت سماجی اور معاشرتی زندگی میں داخل ہونے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ سیاست پر اثر انداز ہو کر نوع بہ نوع تلخیوں کو جنم دیتی ہے جس کے نتیجہ میں معاشرہ کا سیاسی ارتقاء جمود کا شکار ہو جاتا ہے'' ان خیالات کا اظہار انہوں نے ۱۹۲۵ میں بھی کیا تھا جب وہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کے وکیل تھے۔ انہوں نے کہا ''بہر صورت جب دو فرقے جیسے کہ ہندو اور مسلمان ہیں مخالف کیمپوں میں آ کر اپنے آپ کو منظم کر چکے ہیں اور ان کا اجتماعی شعور جو صرف مذہب کے حوالے سے ہی علیحدہ نہیں ہے بلکہ سماجی، نسلی اور معاشی وجوہات سے بھی بالکل علیحدہ ہے اور پھر تعداد اور وسائل کے اعتبار سے وہ مختلف درجوں پر ہیں تو پھر اس کے علاوہ اور کوئی متبادل نہیں کہ کچھ لو اور دو کی بنیاد پر ایک سے زیادہ بین الجماعتی معاہدے کیے جائیں۔ خوش قسمتی سے سرکاری اسکول غیر مذہبی ہیں اس لیے مذہبی مدارس کو محدود پیمانے پر اور آزمائش کے لیے تجرباتاً اس طرح قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ قومی زندگی پر غیر ضروری طور بار نہ ہوں'' (۶)

اس وضاحت کے ساتھ عبداللہ یوسف علی نے اسلامیہ کالج لاہور کی پرنسپل شپ ۱۹۲۵ میں قبول کی تھی۔ اس کے ایک عشرہ کے بعد ۱۹۳۶ میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر آل انڈیا مسلم کانفرنس میں اس وقت دہرایا جب وہ دوبارہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہو چکے تھے۔ انہوں نے

کہا کہ مسلمانوں کی جماعت کو ایک وسیع البنیاد تعلیمی حکمت عملی اپنانی چاہیے اور اپنے لیے تنہائی اور علیحدگی کے مخصوص گوشوں کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے کانفرنس کے شرکاء کو متنبہ کیا تھا کہ ''کوئی بھی کمیونٹی جو اپنے ہم عصر دوسری قوموں کے ساتھ وقت کے دریا میں اترنے اور تیرنے سے خوفزدہ ہو کر اجتناب کرتی ہے تو تاریخ کا آخری فیصلہ اس کے حق میں مایوسی، ناامیدی اور انتشار کے علاوہ کچھ نہیں لاتا''۔ (۷)

عبداللہ یوسف علی کی تجویز یہ نہیں تھی کہ سرکاری سکولوں میں دینی تعلیم نہیں ہونی چاہیے۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ مذہبی تعلیم ایک ایسی مقبول عام اسکیم ہو جس سے فرقہ واریت بہت کم ہو جائے۔ ۱۹۳۷ء کی پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس میں انہوں نے اپنی تجویز کی یہ وضاحت کی تھی ''کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ کچھ زیادہ آزاد ذہن کی مالک مذہبی شخصیات جن کا تعلق مختلف مسالک سے ہو ایسے صاحب صلاحیت افراد کی تربیت کا بندوبست کر سکیں جو مذہبی تعلیم دے سکیں۔ ایسے اساتذہ جو زیادہ قانونی اور رسمی باتوں سے بچ کر اخلاقیات پر زور دیں، کردار کی تعمیر اور تربیت پر توجہ دیں اور طلبہ کو اس ضرورت سے آگاہ کریں کہ ہمیں قومی سطح پر مختلف فرقوں اور جماعتوں کے درمیان تعاون اور اتحاد کی ضرورت ہے''۔ (۸) دراصل یہ وہ جذبات تھے جو ہر سال موسم گرما میں برطانیا میں منعقد ہونے والی ''ورلڈ کانگریس آف فیتھس'' کی کانفرنسوں میں ظاہر کیے جاتے تھے۔ عبداللہ یوسف علی بڑی پابندی سے ان کانفرنسوں میں شریک ہوتے تھے۔

مذہبی نقطۂ نظر کے حامل لوگوں کے قائم کیے ہوئے تعلیمی اداروں کے بارے میں اپنے ذہنی تحفظات کے علی الرغم یوسف علی نے اسلامیہ کالج کی حد تک اپنا رویہ بڑا ہی مثبت رکھا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کمیونٹی کے لیے قائم علیحدہ کالج کے وجود کا جواز صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کا معیار تعلیم دوسرے کالجوں کی طرح بلند ہو اور ساتھ ہی اپنی کمیونٹی کی مخصوص ضروریات کو بھی پورا

کرتا رہے۔(۹) انہوں نے اس مقصد میں کامیابی حاصل کر کے دکھائی۔ان کے انگریزی (آنرز) کی کلاس کے ستر فیصد طلبہ کامیاب ہوئے اور ایک پورے صوبہ میں دوسری پوزیشن لے کر پاس ہوا۔اپنی مذہبی تعلیم کے تصور کو روبہ عمل لانے کے لیے عبداللہ یوسف علی نے اتوار کی چھٹی کے دن ''وعظ و نصیحت'' کے خصوصی پیریڈ کا اہتمام کروایا جس میں اسٹاف کے لوگ باری باری لیکچر دیتے تھے اور دینی نقطۂ نظر کے حوالے سے سائنس، ادب، فلسفہ، ریاضیات یا کسی بھی دوسرے موضوع پر جس پر مقرر بولنے کی صلاحیت رکھتا تھا گفتگو کرتے تھے۔(۱۰) ہر اعتبار سے عبداللہ یوسف علی ایک مقبول پرنسپل تھے جس کا ثبوت وہ تلخ واقعہ ہے جب انجمن حمایت اسلام کے ایک گروپ سے ان کا اختلاف ہوا تھا اور وہ مستعفی ہو گئے تھے تو طلبہ کا اصرار اور مطالبہ تھا کہ ان کو بحال کیا جائے۔یہ دسمبر ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے۔

وہ کالج کے ''اسپورٹس ڈے'' پر کھیل میں حصہ لینے کے بھی قابل تھے اور انہوں نے اسٹاف کی جانب سے دوڑ میں حصہ بھی لیا تھا اور جیت کر بھی دکھایا تھا۔ادارہ سے ان کا تعلق اور وابستگی کاملاً اخلاص پر مبنی تھی۔ملاحظہ ہو ان کی ایک انگریزی نظم کا مفہوم:۔

لاہور کے نوجوان دوستو میں تمہیں کس طرح بھلا سکتا ہوں
میرے خواب تمہارے مستقبل سے مربوط اور منسلک ہیں
اور تم سے میری محبت ہمیشہ پہلے سے بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی ہے

کیا تم نے اپنے دل کی دھڑکنوں میں مجھے شامل نہیں کیا؟
کیا تمہاری خوشیاں میری خوشیوں سے جڑی ہوئی نہیں؟
کیا ہم کھیل ہو یا کام ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ نہیں رہے
کیا ہماری خوشیاں سمندر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کی مانند مشترک نہیں!

جب شباب اپنی تازگی اور کامیابیوں کے ساتھ
اس پختہ عمر کا ساتھی بن جائے جس نے تجربہ کی آہنی
عصا کی سرزنش برداشت کی ہو
تو زندگی ہماری جھولی میں اپنی قیمتی متاع کی تازگی انڈیل دیتی ہے
ہم نے کتابوں کی دنیا اور فطرت کے نظاروں کی سیر کی
اور جوش و جذبہ کے ساتھ مل کر محنت بھی کی
اور اس وقت خوب قہقہے بھی لگائے جب ہم
نے لطیفوں اور مزاح کے درمیان چھپی ہوئی سچائی کو دریافت کر لیا

اب ہم ان دنوں کو پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں
تو ہمیں رنگا رنگ قسم کا قیمتی خزانہ دکھائی دیتا ہے
لاہور کے عزیز نوجوان دوستو
میں تمہاری محبتیں کیسے بھلا سکتا ہوں (۱۱)

عبداللہ یوسف علی نے ان تعلیمی پالیسیوں کی تشکیل میں پیشہ ورانہ حصہ لیا جن کا تعلق ثانوی اور اس سے اوپر تیسرے مرحلہ کی تعلیم یا تعلیم بالغاں سے تھا۔ اگرچہ تعلیم بالغاں کا مسئلہ اور ثانوی تعلیم ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ نظر آتے تھے لیکن عبداللہ یوسف علی کا عقیدہ تھا کہ ثانوی تعلیم اور تعلیم بالغاں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو اچھا اصول یہ ہے کہ ہم ان کے والدین کو بھی تعلیم سے محروم نہ رکھیں۔ اس لئے کہ والدین بچوں کی تعلیم میں مددگار بھی ہوتے ہیں اور رکاوٹ بھی بن سکتے ہیں۔ (۱۲) ان کا خیال تھا

Marfat.com

کہ ثانوی تعلیم ہندوستان کے نظام تعلیم میں سب سے کمزور کڑی ہے۔اس کا مقصد یونیورسٹی کی تعلیم کے مرحلے میں داخل ہونے کے لیے بس ایک ذریعے جیسا ہے، جبکہ حقیقتاً اس مرحلہ میں ہمیں فنی اور پیشہ ورانہ تربیت کا بھی انتظام کرنا چاہیے تاکہ وہ لوگ بھی تعلیم سے فیضیاب ہوسکیں جن کے مقاصد میں یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنا نہیں ہے۔ ہماری آبادی کا بڑا حصہ زراعت پیشہ ہے اور اچھی زرعی تعلیم کے نتیجہ میں ہمارے دیہات ویران ہونے سے بچ جائیں گے اور آبادی کی شہروں کی جانب منتقلی کی بجائے دیہات کے ذہین لوگ دیہات میں ٹھہرنے کو پسند کرنے لگیں گے۔(۱۳) سن تیس کی دہائی میں بھی عبداللہ یوسف علی لوگوں کے اس رجحان سے باخبر تھے جو دیہات سے شہروں کی جانب ہجرت کے تعلق سے پایا جاتا تھا۔انہوں نے اہمیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت اس اچھی اور جدید تعلیم کو دی تھی جس کی بنیاد معاشی جغرافیہ پر رکھی جانی چاہیے۔عبداللہ یوسف علی کی دوسری ترجیح صنعت وحرفت اور فنی تعلیم تھی،اس لیے کہ صنعتی ارتقاء کی تحریک، جیسے کہ ۱۹ویں صدی میں نظر آئی تھی،اس کے ناقدین بہت تھے اور ہمنوا اور دفاع کرنے والے کمیاب تھے۔بڑے پیمانے پر صنعتوں کا فروغ تو مناسب نہیں تھا لیکن وہ اقدام کرنا ضروری تھے جس کے ذریعہ دستکاری اور ہاتھ سے کام کرنے کا فن جو نئی نسلوں سے مٹتا جارہا تھا دوبارہ زندہ ہوسکے۔اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک مناسب اور صحیح نظام تعلیم وضع کیا جائے۔عبداللہ یوسف علی پنجاب کی یونینسٹ حکومت کا ایک قیمتی اور بڑا اثاثہ تھے بالخصوص ایک ایسے وقت جب سرکاری ثانوی سکولوں کا ایک بڑا سرعت سے پھیلتا ہوا سلسلہ صوبہ میں قائم کیا جارہا تھا۔

عبداللہ یوسف علی کے بلند آہنگ الفاظ میں ہماری جامعات ان کارپوریشنوں کی مانند ہیں جن کا کام سچائی کی تلاش اور تفہیم ہے۔(۱۴) انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی اس انکوائری کمیٹی میں بھی خدمات انجام دی تھیں جس نے اکتوبر ۱۹۳۲ سے مارچ ۱۹۳۳ کے درمیانی عرصہ میں یونیورسٹی کی مالیاتی اور ترقیاتی پالیسوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔عبداللہ یوسف علی موجود ڈگری کالجوں

Marfat.com

کو، بغیر کسی جواز، یونیورسٹی بنانے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ موجودہ یونیورسٹی بھی ابھی تک مضبوط مالیاتی بنیاد پر قائم نہیں کی جا سکی تھی اور نہ ہی بڑی وقف املاک حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکی تھی۔ اگر آپ کئی یونیورسٹیاں مزید قائم کر دیں گے تو موجودہ یونیورسٹی کو مزید کمزور کرنے کا سبب پیدا کریں گے۔ (۱۵) لیکن ان کا یہ نقطۂ نظر اس وقت غیر مقبول سمجھا گیا اس لیے کہ ۲۲۔۱۹۲۱ کا زمانہ پنجاب میں فرقہ ورانہ کشمکش میں شدت کا وقت تھا اور مسلمانوں کی جانب سے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ ان کے کم از کم ایک کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔ عبداللہ یوسف علی کا ردعمل یہ تھا کہ یہ مسئلہ ذاتی یا گروہی مفاد حاصل کرنے کا نہیں بلکہ صوبہ کی فکری و علمی ترقی اور کردار کے تحفظ کا ہے۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ نئی یونیورسٹی کے قیام سے مسلمانوں کے لیے ملازمتوں کے نئے مواقع پیدا کیے جائیں بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ صوبہ کے تعلیمی اور فکری اداروں کو مثبت بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ (۱۶)

عبداللہ یوسف علی ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نظام کے سخت ناقد تھے اور اکثر اس بارے میں دلائل دیتے رہتے تھے کہ یہ نظام ہندوستان کے حالات کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہے اور ضرورت ہے کہ اس کو مکمل طور پر از سر نو ترتیب دیا جائے۔ (۱۷) ان کا یونیورسٹیوں کا تصور بہت کچھ آکسفرڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کے نمونہ کے مطابق تھا ان کا کہنا تھا ''یونیورسٹیاں ان منتخب قسم کے افراد کے لیے ہوتی ہیں جو آزادانہ طور پر سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جن کا عمل عقلیت پسندی کی بنیاد پر ہو۔ (۱۸) عبداللہ یوسف علی کی شہرت نے پریس میں اس حد تک جگہ بنالی کہ ۱۹۳۶ میں حکومت کو یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ ان کو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے لیے زیر غور لایا جائے۔ (۱۹) بدقسمتی سے یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر کے منصب کے لیے ابھی تک کسی ہندوستانی کے تقرر کا سلسلہ شروع نہیں ہوسکا تھا اور عبداللہ یوسف علی ان لوگوں میں سے نہیں تھے کہ کسی ذاتی منصب کے لیے کسی کی بے جا تعریف و توصیف کرتے۔ وہ برطانیا کی بالادستی تو تسلیم

Marfat.com

کرتے تھے لیکن غلامانہ جی حضوری ان کی سرشت میں نہیں تھی۔

وہ ہندوستان میں تعلیم بالغاں کو مقبول بنانے کی کوششوں کا آغاز کرنے والوں میں تھے۔ وہ اس نقطۂ نظر سے قطعاً متفق نہیں تھے کہ یونیورسٹیوں پر بوڑھے اور تھکے ہارے لوگوں کی تعلیم کا بوجھ بھی ڈالا جائے۔ معاشرہ کا یہ گروہ یقیناً تعلیم کے حصول کا حق رکھتا ہے مگر اس کے لیے دوسرے ادارے درکار ہیں۔ انہوں نے خود بھی پنجاب میں بہت سے تعلیم بالغاں کے پروگراموں کے تجربہ میں حصہ لیا تھا۔ ایسا ہی ایک ادارہ سوسائٹی فار دی پروموشن آف سائنٹفک نالج یعنی سائنسی علوم کے فروغ کی سوسائٹی تھی جس کے وہ ۱۹۳۶ء میں نائب صدر تھے۔ ۱۹۳۷ میں ایک کانفرنس میں جو برطانیا میں ہوئی تھی انہوں نے اپنے اس قسم کے تجربوں پر بحث کی تھی۔ (۲۰) ان میں سے ایک یہ پروگرام تھا کہ ان کے کالج کے طلبہ کے ایک گروپ نے اپنے اپنے محلوں میں خواندگی کی اشاعت کے لیے رات کو کلاسوں میں پڑھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ایک ہفت روزہ کلاس بھی شروع کی گئی تھی لیکن یہ زیادہ عرصہ نہ چل سکی کیونکہ کلاس میں شریک لوگوں نے کہا کہ وہ دن میں کام کرتے ہیں اور تھک جاتے ہیں۔ پھر عمر زیادہ ہونے کے سبب بھی رات کو پڑھنا دشوار ہوتا ہے۔ یوسف علی نے اپنا ایک اور تجربہ بھی بیان کیا جس میں انہوں نے رات کی کلاسوں کے انعقاد کے لیے اسکولوں کی عمارتوں کو استعمال کرنے کا انتظام کیا تھا۔ اساتذہ باقاعدہ تدریس کے پیشے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور دن میں عام اسکولوں میں فرائض انجام دیتے تھے لیکن ان پر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا اور بعض بیمار بھی ہو گئے۔ یوسف علی اس نتیجہ پر پہنچے کہ صرف خواندگی پر زور دینا کافی نہیں ہوگا بلکہ تعلیم بالغاں کے حوالہ سے اپنے ہاتھ سے کچھ بنانے کی تربیت بھی اس میں شامل ہونی چاہیے۔ ان کا مشاہدہ یہ تھا ''فی نفسہ صرف خواندگی ہماری ذہنی صلاحیتوں کو بیدار نہیں کرتی ہے۔ نہ ہمارے جذبات کو پاکیزگی عطا کرنے کے لیے یہ بنیادی ضرورت ہے اور نہ ہی خواندگی ہمارے باطنی اخلاقی و روحانی احساس کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے جو ہماری صحت منداور عقل

Marfat.com

وفراست پر مبنی زندگی کا اصل جز ہے۔

عبداللہ یوسف علی کی نگرانی میں ایک تیسرا پروجیکٹ تعلیم بالغاں کے ایک مفت سکول کا آغاز تھا۔ یہ اسکول مغلپورہ میں شروع کیا گیا تھا جو لاہور کا ایک صنعتی مضافات کا علاقہ ہے۔ انہوں نے خود ایک گروپ کے ساتھ کام شروع کیا جسے ''پنجاب کے نوجوان احباب'' کا نام دیا گیا تھا۔ یہ گروپ نہ صرف ان پڑھ لوگوں کو پڑھاتا تھا بلکہ خواندہ افراد بھی کلاسوں میں آتے تھے کیونکہ پروگرام میں کھیل کود، پکنک، لکچرز اور دوسرے مشاغل بھی شامل تھے۔ نوجوانوں کے اس گروپ کا امتیازی اصول (موٹو) یہ تھا کہ ''غیر فرقہ ورانہ بنیاد پر منظم نوجوان ہی ہندوستان کو حقیقی معنوں میں آزاد کرا سکتے ہیں''۔(۲۱) عبداللہ یوسف علی حقیقتاً تعلیم کے میدان میں فرقہ ورانہ نقطۂ نظر کو ناپسند کرتے تھے۔

زبان کا مسئلہ بھی بحث ومباحثہ کا ایک بڑا موضوع تھا جس میں عبداللہ یوسف علی نے بڑی یکسوئی اور استقامت سے اپنے آپ کو انگریزی زبان کی حمایت سے وابستہ کیا تھا کیونکہ ان کے نزدیک ہندوستان کے لیے واحد حقیقت پسند راستہ یہی تھا۔ تعلیمی نظام نے انگریزی کو ثقافت کی مشترکہ زبان کے مرتبے پر فائز کر دیا تھا۔(۲۲) اردو کو اختیار کرنے کے کئی نقصانات تھے جن کی نشاندھی یوسف علی نے کی تھی۔ ان کے نزدیک ایک کاریگر، مزدور یا دیہاتی کسان کے لیے اسے سمجھنا اتنا ہی مشکل یا دشوار تھا جتنی انگریزی کی سادی شکل کو سمجھنا اس کے لیے مشکل ہو سکتا تھا۔ ایک ایسی ہندوستانی زبان جو پورے ہندوستان کے عام آدمی کے لیے مناسب ہوا سے تخلیق کرنے کی ضرورت تھی۔ اور اس تخلیقی کام کے لیے بہت سے الفاظ اختراع کرنے تھے جو نئی اصطلاحات اور نئی ایجادات مثلاً سینما یا براڈ کاسٹنگ وغیرہ کے لیے اختیار کیے جا سکیں۔(۲۳) دوسری طرف انگریزی تھی جو پوری دنیا میں استعمال کی جانے والی معیاری زبان تھی۔ انگریزی

Marfat.com

زبان اور اس کے ادب کے ذریعہ ہم ہندوستان کی نہ صرف مختلف اقوام اور مختلف صوبوں کے درمیان بلکہ باہر کی دنیا سے بھی رابطہ قائم کر سکتے تھے۔(۲۴) صوبائی خودمختاری میں اضافہ اور شدت کی وجہ سے عبداللہ یوسف علی کو اندیشہ تھا کہ کہیں صوبائی زبانیں یونیورسٹیوں میں نہ آ جائیں جیسا کہ بنگال میں ہو رہا تھا اور نتیجتاً ہندوستانی معاشرہ مزید تقسیم ہو رہا تھا۔(۲۵) ۱۹۳۷ء میں انہوں نے علی گڑھ کے مسلمانوں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے متنبہ کیا تھا اور کہا تھا ''مسلمانوں کی ایک بڑی غلطی یہ ہوگی کہ وہ انگریزی سیکھنے کے سلسلہ میں تساہل کا مظاہرہ کریں جو نہ صرف فی الوقت ہندوستان کی انتظامی زبان ہے بلکہ مستقبل بعید میں بھی اس کی یہی حیثیت برقرار رہتی نظر آتی ہے''۔(۲۶)

عبداللہ یوسف علی ایک ذہین اور روشن دماغ رکھتے تھے جس کے بل بوتے پر وہ ایک بوسیدہ اور فرسودہ فکر و خیال کو بھی نئے در و بست کے ذریعہ فکر تازہ کی کے طور پر پیش کر سکتے تھے۔ جب وہ روزمرہ کے گھسے پٹے مسائل کا تجزیہ کر رہے ہوتے تھے اس وقت بھی ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ کچھ نئی بات ضرور ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر صورتوں میں ان کا داخلی جذبہ یہ ہوتا تھا کہ انسانی فطری صلاحیتوں کو متحرک کیا جائے۔ یہ زاویۂ نظر ایک ماہر تعلیم کے لیے تو از بس ضروری ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ایک موقع پر انہوں نے لکھا تھا ''ہمیں اپنے سارے کام میں خواہ وہ انتظامی نوعیت کے ہوں یا علم و ادب سے متعلق ہوں فطرت انسانی کے عنصر کو واضح طور پر اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو سارا کام بے معنی اور زندگی کی حرارت سے محروم ہو جائے گا''(۲۷)

عبداللہ یوسف علی جب دیہات میں تعلیم کے مسائل پر گفتگو کرتے تو اندازہ ہوتا تھا کہ ان کو اس قسم کے مسائل کے بارے میں کتنی تشویش ہے اور ان کا احساس کتنا شدید ہے۔ بچے اور بچیوں کو صرف فنی مہارت سے بہرہ ور کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہمیں گاؤں کے ایک نوجوان کو

Marfat.com

دیہات کے مناظر کے حسن و دلکشی سے جی بھر کے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ بھی سکھانا چاہیے اور یہ بھی کہ اسے فن زراعت کے جدید اور بہتر طریقوں کو استعمال کرنے پر فخر بھی محسوس ہونے لگے۔ ہمیں اپنے دیہات کی قدر و قیمت میں اضافہ کرنا چاہیے۔ نہ یہ کہ اسے اس کی طبعی اور فطری دلکشی سے بھی محروم کر دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ شہروں کی جانب نقل آبادی کے رجحان کی روک تھام کی جائے۔ (۲۸)

ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان کی گہری بصیرت کی ایک مثال استاد کے کردار کے بارے میں یہ کہنا تھا ''بچہ اپنی ساخت میں اس سانچہ سے قریب ترین ہوتا ہے جس میں خدا نے اُس کو تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ ایک استاد کے لیے یہ کتنے زبردست فائدہ کی بات ہے کہ اس کی دسترس میں فطرت الٰہی کی تخلیق کا ایک نمونہ ہے تاکہ وہ اس کی پیدائشی داخلی صلاحیتوں کا مطالعہ کر سکے اور اس سے پہلے کہ قابل اعتراض محرکات اس کی فطری خوبیوں کو مسخ کریں وہ اس کو ایک ایسی جہت دے سکے جس سے ہماری یہ دنیاوی زندگی اس شعلہ کے نور سے منور ہو جائے جو براہ راست جنت کی رعنائیوں سے مستعار ہوتا ہے''۔ (۲۹)

عبداللہ یوسف علی کو ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے جو کمال حاصل تھا اس کی سب سے بہتر مثال یہ تھی کہ اسلامیہ کالج میں اپنی پرنسپلی کے دوسرے دور میں کالج میں طلباء کی خود اعتمادی اور اولوالعزمی میں زبردست اضافہ دیکھنے میں آیا۔ جو تقریر آخری بار کالج میں انہوں نے کی تھی وہ ان کے تعلیم کے بارے میں نقطۂ نظر کا صحیح اظہار کرتی ہے اور اس کو ایک بنیادی دستاویز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے طلبہ کو پند و نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا

''میں اپنی گفتگو کے اختتام پر اپنے طلبہ سے چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے عزیز طلبہ آپ نے اور میں نے ایک ساتھ کام کیا ہے اور اس طرح کیا ہے کہ ہم سب میں مفاہمت تھی،

Marfat.com

اتفاق رائے تھا اور باہم محبت کا جذبہ بھی تھا۔ آپ میں سے بعض ذہنی اعتبار سے ممتاز تھے اور بہت سے امتیازات اور انعامات بھی حاصل کر چکے تھے۔ خدا آپ کو مزید بے شمار کامیابیوں سے نوازے۔ علم وادب کے میدان میں بھی اور زندگی میں بھی۔ اور آپ کو کردار کی خوبیاں بھی وافر میسر آئیں۔ آپ میں سے بعض نے کھیلوں میں کمالات دکھائے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ صحت و تندرستی کی دولت سے مالا مال ہوں لیکن ذہنی اور روحانی دلچسپیاں فراموش نہ کریں۔ آپ میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے کسی بھی میدان میں امتیازی پوزیشن تو حاصل نہیں کی لیکن ایک اوسط درجہ کے اچھے طالب علم رہے۔ آپ قطعاً ہمت نہ ہاریں۔ دنیا میں بیشتر لوگ آپ ہی کی طرح اوسط درجہ کے ہوتے ہیں۔ آپ کی خوبیاں آپ کے کردار کی پختگی اور آپ کے اخلاص اور سچائی سے نمایاں ہوں گی اور انہی حوالوں سے آپ کو زندگی میں پرکھا جائے گا۔ آپ میں سے بعض ناکام بھی رہے ہوں گے۔ یاد رکھیے جب تک آپ کے دل میں سچائی ہے اور آپ کے ذہنوں میں بدی نے جگہ نہیں بنائی ہے ناامیدی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ایک میدان میں ناکامی کسی دوسرے میدان میں کامیابی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق نئی راہیں تلاش کیجئے اور ان پر آگے قدم بڑھایئے بجائے اس کے کہ اس دشوار گزار دنیا میں پتھریلی دیواروں سے اپنا سر ٹکرائیں۔ ہم جو زندگی کے مراحل میں آپ سے آگے نکل چکے ہیں آپ کی ہر دم مدد کے لیے تیار ہیں۔ لیکن پیش قدمی، اور انتخاب اور ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر ہی رہیں گی۔ آپ میں سے کچھ نے غلطیاں بھی کی ہونگی اور ان پر سزا بھی پائی ہوگی۔ اگر آپ نے سزا کو صحیح جذبہ اور شعور کے ساتھ قبول اور برداشت کیا تو یہ آپ کے لیے ایک نعمت بن سکتی ہے اور یہ اس لیے کہ ہماری سزاؤں کا مقصد آپ کی اصلاح ہے، آپ سے انتقام لینا نہیں۔

''میرے عزیز طلبہ آپ سب مجھے بے حد عزیز ہیں خواہ آپ میں سے کوئی ذہین ہو یا کند ذہن ہو یا اوسط درجہ کا طالب علم، بہت اچھا ہو یا اس معیار سے کم اچھا ہو جس کا میں طلب گار اور

Marfat.com

خواہش مند ہوں۔ بہت سے طریقوں سے جن میں سے کچھ آپ کو معلوم ہوں گے اور کچھ کا پتہ نہیں ہوگا میں نے آپ کے کردار اور افکار کو ایک شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ کوشش کریں کہ اپنی کالج کی اس زندگی کے ورثے میں اپنے ساتھ زیادہ تہذیب یافتہ ذہانت، وسعت قلبی، پر امیدی، مضبوط ارادے اور سچی وجدانی صلاحیتیں لے کر جائیں''۔ (۳۰)

ان کے اسلامیہ کالج کے فارغ التحصیل گریجویٹ اگلی تین دہائیوں کے عرصہ میں پاکستان کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بہت اہم حصہ رہے ہیں۔ وہ سب اس عظیم ماہر تعلیم کے مقروض ہیں جس نے ان کے اندر علم وفکر کا جذبہ پیدا کیا تھا۔

Marfat.com

حواشی باب ۷

۱- ''اسٹیٹس مین'' دہلی ۱۴/ اکتوبر ۱۹۳۹

۲- عبداللہ یوسف علی کا اصل فقرہ اردو میں تھا۔ بیدار ملک نے اپنی تالیف ''یاران مکتب: تحریک پاکستان اور اسلامیہ کالج''۔ لاہور صفحہ ۲۱۶ میں یہ جملہ رقم کیا ہے۔

۳- ملاحظہ ہو ''ماڈرن انڈیا اینڈ دی ویسٹ'' رپورٹ بعنوان ''مسلم کلچر اینڈ ریلیجس تھاٹ'' صفحہ ۳۹۹

۴- '' پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس'' میں خطاب پر مبنی رپورٹ ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور ۲۵ اپریل ۱۹۳۷ء

۵- ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور ۱۵/ ستمبر ۱۹۳۰ء

۶- ملاحظہ ہو ''انڈیا اینڈ یورپ'' مصنف یوسف علی صفحہ ۱۰۴-۱۰۳

۷- آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس رامپور (۱۹۳۶) کے سیکنڈری اسکول سیکشن کے سامعین سے عبداللہ یوسف علی کا صدارتی خطاب: اس کی روداد ''انڈین جرنل آف ایجوکیشن'' جلد انمبر ۶-۵ بابت مئی- جون ۱۹۳۶ میں صفحہ ۱ تا ۱۰ شائع ہوئی تھی

۸- ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور ۲۵/ اپریل ۱۹۳۷

۹- ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور، ۱۲/ مئی ۱۹۳۸ء

۱۰- ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور ۹/ مارچ ۱۹۳۷ء

۱۱- یوسف علی کی نظم ''یادیں'' اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ کے نام، مطبوعہ ایسٹرن ٹائمز

لاہور مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۰ء۔ یہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی جب وہ نیشنل لبرل کلب میں جو پال مال لندن میں واقع تھا قیام پذیر تھے۔ نظم ان ایام میں لکھی گئی ہے جوان کی زندگی کا غم والم سے پُر وقت تھا۔ ۱۹۴۰ تک ان کے اپنی پہلی بیوی سے جو بچے تھے ان سے ناقابل تلافی حد تک تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے، دوسری بیوی سے بھی علیحدگی تقریباً ہونے والی تھی اور اپنے آخری بیٹے راشد سے رابطہ تقریباً منقطع ہونے والا تھا۔

۱۲- پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۹۲۳) لاہور میں یوسف علی کا صدارتی خطبہ۔ جسے ''مسلم آوٹ لک'' لاہور نے ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا تھا۔

۱۳- ایضاً۔ انڈین جرنل آف ایجوکیشن'' جلد ا

۱۴- ملاحظہ ہو یوسف علی کا انگریزی میں خطبہ ''یونیورسٹی کی حیثیت اور مقام - بدلتی ہوئی دنیا میں'' ایف سی کالج لاہور میں منعقد ہونے والے ہفتہ کے اختتام پر ہونے والی کانفرنس منعقدہ ۷ رستمبر ۱۹۳۶ کی کارروائی پر مشتمل ٹائپ شدہ نوٹ

۱۵- ملاحظہ ہو ''تاریخ جامعہ پنجاب'' مصنفہ غلام حسین ذوالفقار صفحہ ۱۹۱-۱۷۳

۱۶- ایضاً

۱۷- عبداللہ یوسف علی نے اپنے ایک خطاب میں جو روٹری کلب لاہور میں ہوا اور سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں ۱۷ مئی ۱۹۳۶ کو جس کی روداد شائع ہوئی تھی یہ مطالبہ کیا تھا کہ شروع سے آخری مرحلے تک پورے نظام تعلیم میں مکمل تعاون اور باہمی ربط ہونا چاہیے۔ 'دی ٹائمز' کے ۲۴ راگست ۱۹۳۷ء کے شمارے میں ان کا مراسلہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اس بات کے حق میں دلائل دیئے تھے کہ صوبوں کے بجائے

مرکزی اور قومی سطح پر تعلیمی پالیسی تشکیل دی جائے تا کہ ہندوستان پرانی دقیانوسی ، مقامی اور فرقہ ورانہ روایات اور مفادات کے شکنجہ سے آزاد ہو سکے۔

۱۸- ''دی یونیورسٹی ان دی چینجنگ ورلڈ'' ایضاً

۱۹- ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۶ء

۲۰- یوسف علی نے ''تعلیم بالغاں'' کے سلسلہ میں جو مساعی انجام دی تھیں ان کی تفصیل ان کے ایک آرٹیکل بعنوان ''تعلیم بالغاں'' جز II میں موجود ہے جو ''ہندوستان ریویو'' کے اپریل مئی ۱۹۳۸ کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔(YA 76)

۲۱- ''ٹریبیون'' لاہور ۱۹ر جنوری ۱۹۳۸ء

۲۲- ''قرآن مجید ترجمہ وتفسیر'' طبع سوم (۱۹۳۸) قرآن پاک کے تراجم کے متعلق ''نوٹ''

۲۳- ''ملاحظہ ہو'' اڈلٹ ایجوکیشن'' II (تعلیم بالغاں حصہ دوم) مطبوعہ ہندوستان ریویو۔ پٹنہ: اپریل-مئی ۱۹۳۸ء

۲۴- ایضاً

۲۵- آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے گولڈن جوبلی سیشن، منعقدہ ۲۷ مارچ ۱۹۳۷ء علی گڑھ میں یوسف علی کا صدارتی خطبہ جو انہوں نے یونیورسٹی سیکشن میں دیا تھا پمفلٹ

۲۶- ایضاً

۲۷- ڈبلیو ایچ مورلینڈ، کے بارے میں تعزیتی نوٹ، دی ٹائمز لندن ۴ر اکتوبر ۱۹۳۸ء

۲۸- ملاحظہ ہو'' یوسف علی کا لیکچر رام سکھ داس کالج فیروز پور'' ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۶۔

۲۹- ''پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس'' کے تاریخ اور مدنیت کے بارے میں سیکشن کے سامنے

Marfat.com

یوسف علی کا صدارتی خطبہ: کانفرنس دسمبر ۱۹۲۶ء۔ اس کی روداد کی ایک کاپی پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں موجود ہے۔

۳۰- اسلامیہ کالج لاہور میں ۷ مارچ ۱۹۳۷ کو منعقد ہونے والے جلسہ تقسیم انعامات میں یوسف علی کی تقریر۔

Marfat.com

باب ہشتم

ایک ہم آہنگ اور منظّم دنیا

۱۸۹۶ میں سلطنت برطانیا عظمیٰ کی مادر مملکت کا دارالحکومت ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات کی تیاریوں کی وجہ سے جوش و خروش کا زبردست مظہر و مرکز بنا ہوا تھا۔ پورے وثوق سے کہا جاتا تھا کہ سلطنت روما کے زوال کے بعد کوئی بھی حکمران اتنی بڑی سلطنت (جس میں دنیا کے دور دراز ممالک بھی شامل ہوں) پر حکومت کرنے پر قدرت حاصل نہیں کر سکا تھا۔

برطانیا اس وقت دنیا کی ناقابل شکست عالمی قوت بنا ہوا تھا اور اس کا حکمران طبقہ پورا یقین رکھتا تھا کہ ان کی طرح کی نسلی اور فکری بلندی دنیا میں کسی کو بھی میسر نہیں ہے۔ یہ تھا وہ ماحول اور وہ فضا جس میں عبداللہ یوسف علی لندن میں اپنی تعلیم کے مراحل کی تکمیل کر رہے تھے۔ متوسط طبقہ کے ایسے منتخب ہندوستانیوں کی طرح جو دولت و ثروت اور عہدہ و منصب کے بجائے اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر برطانیا پہنچے تھے یوسف علی بھی اب اس ہندوستانی اشرافیہ کا حصہ تھے جو اگر واپس وطن جاتے تو ہر آسائش اور ممتاز منصب و ملازمت حاصل کر سکتے تھے۔ وہ وقت کا ساتھ دیتے اور حالات سازگار رہتے تو سر کا خطاب بھی حاصل کر لیتے۔ لیکن منفرد اور مختلف بننے کے لیے شجاعت اور حوصلہ درکار تھے۔

نو آبادیاتی دور میں ایک خاص قسم کی مسلمان شخصیت کا تصور عام ہو گیا تھا جس میں ایک ایسا امتزاج اصل ہدف تھا جہاں کسی پر اسرار سے انداز میں حاکموں اور محکوموں دونوں کی

Marfat.com

خصوصیات اور اوصاف ایک فرد میں جمع ہو جائیں۔ عبداللہ یوسف علی کی شخصیت میں ایک بڑی گہری نفسیاتی امنگ تھی جس کے نتیجہ میں وہ مشرق اور مغرب کے مابین ایک پل اور رابطہ کا کام کرنا چاہتے تھے۔ اس امنگ نے ان کی زندگی کو بڑی شدت سے ہر سطح پر متاثر کیا تھا۔ عوامی زندگی میں بھی اور حد درجہ ذاتی اعتبار سے بھی۔ سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ انہوں نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی۔ ایک نہیں بلکہ دو بار۔ ان کی باطنی طلب نے ان کو بار بار متضاد اشیاء کو یکجا کرنے پر آمادہ کیا۔ لیکن یہ ایسی مہم جوئی ہوتی ہے جس میں المیے ہمیشہ پیش آتے ہیں۔ ان کے ناقد بہت تھے جو یہ کہتے تھے کہ سلطنت سے وفاداری کا ان کا جذبہ اور لیگ آف نیشنز جیسے اداروں سے والہانہ وابستگی کا انداز ان کی ابن الوقتی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے عمل کی بنیاد ان کے ذہنی رویہ کی گہرائیوں میں موجود تھی۔ وہ اتنی ہمت ضرور دکھا گئے کہ ان کے بارے میں کہا جا سکے کہ وہ ایک آئیڈیلسٹ یا مثالیت پسند انسان تھے۔

عبداللہ یوسف علی کے پیسمور لیکچرز (Passmore Lectures) جو انہوں نے ۱۹۰۶ میں دیے تھے دراصل پہلے موقع کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں انہوں نے اس تلاش اور جستجو کی بات کی جو وہ مشرق اور مغرب کے مابین توازن کے لیے کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان میں انہوں نے خود کو ان لوگوں کی طرح سمجھا اور پیش کیا جو مغرب کی یونیورسٹیوں بالخصوص آکسفرڈ اور کیمبرج سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور جن کے ذہنوں میں یہ کاوش رہتی ہے کہ مغربی آئیڈیلز یا مقاصد اور مشرقی روایات میں توازن اور ہم آہنگی تلاش کی جائے۔ (۱)

اس کوشش کے نتیجہ میں جس کتاب کی ترتیب سامنے آئی وہ ان کے خطبات پر مشتمل تھی جس کا انتساب جارج برڈووڈ کے نام اس طرح کیا گیا تھا: ''جو مشرق کے باطن کی روح کا خصوصی

عرفان وادراک رکھتے ہیں'' مشرق کا مستقل تشخص عبداللہ یوسف علی کے لیے ہمیشہ بہت اہم اور گہری معنویت کا حامل رہا۔ مشرق اور مغرب کی بہترین خصوصیات کو ایک وحدت میں پرو دینا ان کی زندگی کا اہم ترین مقصد معلوم ہوتا ہے اور ان کے زرخیز ذہن نے اس بام رفعت تک رسائی کے لیے جو دو راستے دریافت کیے تھے وہ انہوں نے فن (Art) اور مواخات (Fellowship) کے نام سے شناخت کیے تھے۔

آرٹ یا فن کا انتخاب غالباً یوں ہوا کہ یوسف علی کی علمی وادبی تربیت ایک ''کلاسیکیت پسند'' شخص کی طرح ہوئی تھی۔ وہ آخر عمر تک قدیم یونانی ''فنون'' کے دلدادہ رہے تھے۔(۲) ایک مضمون میں جو پمفلٹ کی شکل میں ۱۹۱۶ میں شائع ہوا تھا انہوں نے ''آرٹ'' کے ایک اعلیٰ کردار'' کی جانب اشارہ کیا تھا۔ روڈن (Rodin) اور مستر ووک (Mestrovic) کے فن پاروں کی ایک نمائش ان دنوں لندن میں ہو رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر وہ اس بات سے متاثر ہوئے کہ کس طرح ان کے مجسموں نے اتحادی اقوام کے اعلیٰ افکار کو فن کے وسیلہ سے مربوط بنا کر دکھایا ہے۔(۳) انہوں نے لکھا تھا ''آرٹ میں ایسی ہی غیر معمولی قوت اور توانائی ہوتی ہے۔ یہ قومی کردار اور خصوصیات کی اہمیت تو بتاتا ہے ہی لیکن ساتھ ہی اس میں مخفی سچائی ان تاریک گوشوں کو بھی منور کر دیتی ہے جس کو پا کر مختلف قومیں ایک دوسرے سے قریب آتی ہیں۔ خود عبداللہ یوسف علی کا فن سے محبت کا مزاج اور افتادِ طبع ان کو شاعری کی جانب لے گئے تھے۔ شاعری میں انہوں نے جنگ عظیم اور مستقبل کے بارے میں اپنی امنگوں کا اظہار ایک نظم میں کیا جو ۱۹۱۸ میں لکھی گئی تھی۔ مفہوم ملاحظہ ہو:۔

اگر تم مشرق اور مغرب کا جائزہ لے کر دیکھو

اور شمال اور جنوب کو آرٹ کی دنیا میں یکجا کرو

(تو محسوس ہوگا) کہ انسان کی روح

اب پہلے سے زیادہ کمزور کیوں ہے اور اس کی روشنی مدھم کیوں ہوگئی ہے؟

یقین رکھو یہ تخلیق کا کرب ہے جو پیش خیمہ ہے (اس بات کا)

کہ ساری انسانیت کے لیے ایک عظیم عہد نو شروع ہونے والا ہے۔ (۴)

بلاشبہ یہ عہد جنگ عظیم کے بعد شروع نہیں ہوا۔ لیکن عبداللہ یوسف علی کی رجائیت بھی کم نہیں ہوئی۔ ۱۹۲۵ میں انہوں نے پورے وثوق سے پھر کہا تھا ''بین الاقوامی بھائی چارہ کی تشکیل کے امکانات آرٹ کے وسیلہ سے اب بھی بھرپور انداز میں موجود ہیں'' (۵)

آرٹ کے علاوہ مشرق و مغرب کے مابین ہم آہنگی کے حصول کے لیے دوسرے ذرائع و وسائل مشترک روحانی آئیڈیلز اور اقدار کی شناخت اور ان کا اعتراف بھی ہوسکتا ہے وہ لکھتے ہیں ''میرے خیال میں تمام سوچنے اور غور و فکر کرنے والوں کا مذہب یکساں ہے خواہ ان کے روحانی داعیوں کی تشریح اور وضاحت کرنے والی فکر اور اس کا فلسفہ اور ان کی روحانی امنگوں کی تشکیل کے پیمانے مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ (۶)

عبداللہ یوسف علی کا وہ مطمح فکر و نظر جو وہ بین المللی اتحاد و تعاون کے باب میں رکھتے تھے اور جس کا ذریعہ ان کے نزدیک آرٹ کی عالمگیر زبان اور روحانی مقاصد پر مبنی بھائی چارہ تھا ان کو کئی قسم کے اداروں اور تنظیموں کے قریب لے گیا۔ انہوں نے لاہور آرٹ سرکل قائم کیا اور ۱۹۳۷ء میں وہ خود اس کے صدر رہے۔ وہ ''ورلڈ کانگریس آف فیتھس'' میں ۱۹۳۴ سے ۱۹۴۱ تک بڑے فعال رہے اور اس قبیل کی ایک دوسری تنظیم جس کا نام اخلاقی اتحاد تھا (Ethical

Marfat.com

(Union) میں بھی شریک تھے۔ وہ لاہور روٹری کلب کے رکن بھی تھے اور انہوں نے گول میز کانفرنسوں اور روٹری کلب کے برطانیا میں منعقدہ اجتماعات پر تقریریں بھی کی تھیں۔ وہ لیگ آف نیشنز کے بڑے زوردار حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسا ادارہ بن سکتا ہے جس کے ذریعہ سے انسانیت کی ترقی اور فروغ ممکن ہوگا۔ اس لیے غالباً انہوں نے لیگ کے ''امن براستہ مذہب'' کے پروگرام میں حصہ بھی لیا تھا۔

عالمی اخوت کے آئیڈیل کی جستجو میں وہ یہاں تک آ گئے کہ ہندوستان میں فری میسنری کی تحریک کی بھی تائید کر ڈالی تھی۔ ان کی کتاب ''اے کلچرل ہسٹری آف انڈیا ڈیورنگ برٹش پیریڈ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مبصر یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ''اس کتاب میں سب سے بہتر حصہ وہ باب ہے جس میں انہوں نے ہندوستان کے ثقافتی اداروں پر مغرب کے قانونی، معاشرتی، ادبی، فلسفیانہ اور سائنٹفک افکار کے اثرات کی وضاحت کی ہے۔ تحریک کی اہمیت ان کے نزدیک اس عنصر کی وجہ سے تھی جو نسلی اور سماجی خلیج کو پر کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ (۷)

عالمی تعاون کے بارے میں ان کا یقین دوسری عالمی جنگ کے دوران بھی برقرار تھا۔ مئی ۱۹۴۱ میں وہ اسی انداز اور کیفیت میں لکھ رہے تھے جیسا کہ وہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ۱۹۱۴ سے ۱۹۱۸ تک لکھتے رہے تھے۔ مثلاً انہوں نے لکھا'' جنگ جب ختم ہو جائے گی تو ہر چیز وہاں نہیں ہوگی جہاں اب سے پہلے تھی۔ ہر شخص کو ایک ایسی صورت حال کا سامنا کرنا ہوگا جس میں ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لیے ہر ایک کی بہترین مساعی لازمی ضرورت بن جائیں گی''۔ (۸)

عبداللہ یوسف علی کی دانش کے معروف تصور کے مطابق بین الاقوامی ہم آہنگی اور بھائی چارے کا وہ نظم جو وہ مشرق اور مغرب کے درمیان دیکھنا چاہتے تھے ان کو اس ضروری نتیجہ کی جانب

Marfat.com

لے گیا کہ اس اصول پر ہندوستان (ایک جانب) اور یورپ یا برطانیا (دوسری طرف) کے درمیان تعاون ضروری ہے۔ انہوں نے ایک کتاب تالیف کی جس کا نام ہی ''انڈیا اینڈ یورپ'' تھا جس میں اپنا استدلال کچھ اس طرح پیش کیا ''جدیدیت فکری بھی اور عمل میں بھی مادی اور روحانی دونوں نقطہ ہائے نظر کو شامل کرتے ہوئے جس طرح یورپ میں ارتقاء پذیر ہوئی ہے وہ اس ترقی کا فطری انداز ہے جس میں حقیقتاً پوری انسانیت نے حصہ لیا ہے۔[9] ہندوستان کو یورپ سے وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہیے جو بہترین اور اعلیٰ ہے اور اس کے بدلے میں یہ بھی اہم ہے کہ ہندوستان میں کیے گئے مذہبی اور روحانی تجربے اور کوششیں اپنے اندر ایسا بہت کچھ سموئے ہوئے ہیں جو جدید یورپ کی فکر کو دیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ ماضی میں ہوا ہے۔[10] ان کی رائے میں یہ واضح طور پر بڑی معقول بات ہوگی کہ مشرق اور مغرب ہم آہنگی اور تعاون کی راہ تلاش کریں بالخصوص اس امر کے پیش نظر کہ مشرق اور مغرب کے دو انتہائی نمائندہ عناصر، جیسا کہ ہندوستان اور یورپ ہیں، فی الواقع دونوں کے پاس ایک دوسرے کو دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔

عبداللہ یوسف علی کے پاس یہ صلاحیت تھی کہ وہ (مشرق و مغرب کے درمیان) اس باہمی انحصاری کو بہت تعین کے ساتھ دائرۂ اظہار میں لا سکیں۔ انہیں پوری طرح علم تھا کہ ہندوستان نے کس طرح برطانیا کو عظمت کے حصول میں مدد دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''وہ (یعنی ہندوستان) برطانیا کے سپاہیوں، شہریوں، حکام اور ماہرین تعلیم کے لیے کس طرح ایک شاندار تربیتی میدان فراہم کرتا ہے جہاں برطانیا کی سرمایہ کاری کے بھی لامحدود مواقع ہیں جس کے ذریعہ نئے نئے امکانات ابھرتے ہیں اور یہ سرمایہ یہاں برطانیا کے براہ راست کنٹرول میں بھی رہتا ہے۔ برطانیا کے صنعت وحرفت کے مالکان کے لیے ہندوستان ایک مسلسل وسعت پذیر مارکیٹ

Marfat.com

بھی ہے اور برطانیا کے کارخانوں کے لیے ہندوستان ہر قسم کا خام مال بھی ہمیشہ مہیا کرتا ہے۔ اسی سے برطانیا کی جہاز رانی اپنی تجارتی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے اور برطانیا کی مشینیں کارخانوں کو مسلسل حرکت میں رکھتی ہیں۔ ایشیا میں ہندوستان کا مرکزی محل وقوع برطانیا کو اس قابل بنائے ہوئے ہے کہ وہ مشرق میں اپنی غالب حیثیت کو برقرار رکھتا ہے۔[11] اس کے بدلے برطانیا کے ساتھ وابستگی کے معاہدے نے انڈیا کو اپنے اخلاقی اور مادی وسائل کو ترقی کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ ایک عظیم اور حریت پسند سلطنت میں شمولیت حاصل کر کے ہندوستان کے نقطہ ہائے نظر میں وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اس واسطے سے ہندوستان کے لوگوں کو عظیم افکار اور عالمی تحریکوں سے براہ راست واقفیت اور قربت کا موقع بھی ملا ہے۔ یہاں کا سماجی نظم وضبط اب ایک قدیم اور عہد رفتہ یا قرون وسطیٰ کی بنیاد سے بتدریج آگے بڑھ کر جمہوریت کی اساس کے قریب آ رہا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اینگلوسیکسن نسلوں کے نظم وضبط سے لگاؤ سے متاثر ہو کر نئی زندگی نہ پا رہا ہو"۔

یہ وہ جذبات تھے جن کا اظہار انہوں نے اولاً ۱۹۱۸ء میں کیا تھا لیکن ان کی بعد کی تحریروں اور سیاسی وابستگیوں میں بھی اس کے اثرات موجود رہے۔ پنجاب میں دونوں عظیم جنگوں کے درمیانی وقفہ میں انہوں نے کھل کر یونینسٹ حکومت کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔ انہوں نے اپنی دانش وفراست پر مبنی مساعی کو اپنی سلطنت سے وفاداری کے اسباب کی وضاحت کرنے میں صرف کیا اور اپنے نقطۂ نظر پر ہندوستان کی تحریک آزادی کے علی الرغم شدت سے قائم رہے۔ اگرچہ انگریزوں کے نسلی تفاخر کے احساس سے وہ خوش نہیں رہے تھے لیکن انگریزوں سے وابستگی کے ان کے لیے ایک سے زیادہ بندھن تھے: ان کی تعلیم، شادی، ملازمت اور دوستیاں سب نے

Marfat.com

انہیں ان کے ساتھ جوڑ رکھا تھا۔

عبداللہ یوسف علی کے نظام فکر میں ایک مزید اور غالباً آخری مرحلہ بھی تھا۔ ان کی رائے میں ہندوستان اور یورپ کا باہم ارتباط اور ایک دوسرے پر انحصار اس وقت ہی ممکن تھا جب عالم اسلام اور ہندوستان کے مسلمان برطانیا سے تعاون پر آمادہ ہوں۔ جنگ عظیم اول کے دوران مسلمانوں نے اپنے عہد و پیمان کو پورا کیا تھا اور اس کا مقصد برطانیا کے مفادات کا تحفظ اور عالمی امن کا قیام تھا"(۱۲) دوسری عالمی جنگ کے دوران بھی عبداللہ یوسف علی نے یہی آواز بلند کی تھی کہ برطانیا کی مشرق وسطیٰ کے بارے میں حکمت عملی مسلمان ریاستوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔(۱۳) وہ خود ان دونوں جنگوں کے زمانے میں برطانیا کی حمایت میں پروپیگنڈا کرنے والے ایک مثالی مسلمان تھے۔ برطانیا کو بھی مسلمانوں کو بہت کچھ بتانا اور سمجھانا تھا۔ ۱۹۴۱ میں جب ان کی عمر ۶۹ سال کی تھی اور جب ان کو "سر" کا خطاب حاصل کرنے کی کوئی جستجو بھی نہ رہی ہوگی اور نہ اپنی دولت و ثروت میں اضافہ کی ہوس ہوگی انہوں نے ان الفاظ میں انگریزوں کو خراج تحسین پیش کیا تھا: "برطانیا کے لوگ اپنی روحانیت پسندی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے بلکہ بڑی خاموشی سے اس پر عمل کرتے ہیں"۔

اس طرح وہ مسلمانوں میں برطانیا کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی قدیم روایت بھی اس انداز اور کردار کی حامل تھی اگرچہ وہ آج گم ہو چکی ہے۔(۱۴)

ہندوستان اور سلطنت برطانیا اور مشرق و مغرب کے مابین مشترک مفادات ان کے خیال میں ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ سلطنت کے دشمن ہی مشرق و مغرب میں اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد ہی جرمنی کے شاہی خاندان کی طرف

Marfat.com

اشارہ کرتے ہوئے اور ان کو مورد الزام گردانتے ہوئے ہوہن زولرنز کی کارگزاریوں کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا کہ ''جرمنی نے مشرق و مغرب کے درمیان خوشگوار اتحاد و یکجہتی کو بڑے بھدے انداز میں منتشر کر دیا تھا جس کے بارے میں ہم اب بھی یہ توقع کرتے ہیں کہ اسی فضا کو نہ صرف سلطنت کے اندر بلکہ پوری دنیا میں دوبارہ قائم اور بحال کریں گے''(۱۵)

برطانیا کی حمایت میں پورے جوش و خروش سے جو پروپیگنڈا وہ کرتے تھے اس کی توانائی کا اصل منبع و مصدر ان کا یہی عقیدہ تھا۔ ۱۹۱۸ میں اسکینڈے نیویا کے سفر پر جا کر جس مشن کی تکمیل انہوں نے کی تھی اس میں انہوں نے اپنی زندگی اور شہرت دونوں کو داؤ پر لگا دیا تھا لیکن وہ اس کو ایک اخلاقی تقاضا سمجھتے تھے۔ اس کے چند ماہ بعد انہوں نے ''دی ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ'' کو ایک مراسلہ بھیجا تھا جس میں یہ واضح کیا کہ ان کے نزدیک یہ کام کرنا کیوں اہم تھا۔ دشمن کی چال یہ ہے کہ نئے نئے دلائل سے فتنہ کا بیج بویا جائے۔ ان دلائل میں تازہ ترین دلیل یہ ہے کہ مشرق و مغرب انسانی تہذیب کے دو مختلف پہلو ہیں۔ کہ مشرق نے روح کی بالیدگی کا سروسامان کیا ہے جبکہ مغرب جنگ، حکومت، قانون اور تجارتی سرگرمیوں جیسے خالص دنیاوی مشاغل میں مصروف ہے۔ اس مخصوص حوالہ میں دشمن سے مراد جرمنی نہیں تھا بلکہ ''انڈین نیشنل کمیٹی'' تھی جو سویڈن میں ان کے مقابل صف آرا تھی۔ اسی خط میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں ''مدعا کہنے کا یہ ہے کہ استدلال کا یہ انداز بڑا گمراہ کن ہے۔ مشرق نہ غیر متحرک ہے نہ حقیر ہے اور نہ وہاں نفرتوں کا ڈیرہ ہے۔ مغرب کے پاس بھی روح ہے جسے اس کو بچانا ہے۔ خود اپنی روح کو اور دوسروں کی روح کو بھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح مشرق کی روح کی حفاظت ضروری ہے۔ دونوں ہی اپنی توانائیوں کو ماضی میں بھی اور اب بھی انسانیت کے روحانی ارتقاء کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ہر ایک کو اس ایک اصول پر

Marfat.com

کام کرتے رہنا چاہیے جو تاریخ میں ہمارے وجود کا جواز مہیا کرے گا۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو ہمارے اندر موجود ہے۔ ہندوستان میں برطانیا کے کام کو محض مادی اعتبار سے جانچنا اور دیکھنا کافی نہیں ہے، گو یہ بھی بڑا شان دار ہے۔ لیکن دانش و حکمت اور اخلاقی دائرہ میں برطانیا کا ہندوستانی معاشرت پر اثر زیادہ اہم اور دیرپا ہے''۔ (۱۶)

اسی عظیم اشتراک و امتزاج میں جس کو وہ اپنی پسندیدہ اصطلاح میں مسلمان اور برطانیا، ہندوستان اور سلطنت، اور مشرق و مغرب کے اشتراک سے تعبیر کرتے تھے خود ان کا ذاتی و شخصی حصہ بہت زیادہ تھا اور وہ کہتے تھے کہ یہ تاریخ کا انتہائی اہم باب ثابت ہوگا۔ (۱۷)

یہ وہ تحریک تھی جس کا تعلق مشرق کے ادب سے تھا۔ (۱۸) ان کی ساری تگ و دو کا مقصد یہ تھا کہ اس فکر کو مناسب اسلوب و قالب دے کر انگریزی میں پیش کیا جائے۔ لکھتے ہیں کہ میں خود انگریزی کو ایک اسلامی زبان کی حیثیت دے دینا چاہتا ہوں''۔ (۱۹) انہوں نے یہ کام اس لیے کیا کہ یہ ان کے وجود اور ہستی کا تقاضا تھا کہ مشرق اور مغرب کے متضاد رویوں اور خصوصیات کو یکجا کیا جائے۔ لکھتے ہیں'' میں مغرب کے ملکوں میں دیس دیس گھوما ہوں مغربی اطوار اور افکار کو گہرائیوں میں جا کر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور مغربی علوم کو بھی پڑھا ہے۔ یہ مواقع مشکل ہی سے مشرق کے کسی شخص کو میسر آئے ہوں گے لیکن ساتھ ہی میں نے اپنے مشرقی ورثہ سے رابطہ بھی منقطع نہیں کیا''۔ جسٹس امیر علی کے انتقال پر انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا مفہوم یہ بھی تھا کہ جو رول ان کا تھا اب وہ خود اس کی تقلید کرنا چاہتے تھے، یعنی'' ترقی پسندانہ اسلام کے مقاصد سے مخلصانہ وابستگی اور مشرق و مغرب کی بہترین مشترکہ روایات سے سچی وفاداری''۔ (۲۰) عبداللہ یوسف علی نے ترقی پسندانہ اسلام کے مقاصد کے لیے خود بھی کام کیا

اور اپنے قرآنی علوم سے عالمانہ واقفیت کے ذریعہ مغرب کو وہ کچھ پیش کیا جو مشرق کی بہترین روایت کا حصہ تھا۔

۱۹۴۰ء کی ورلڈ کانگریس آف فیتھس میں جو بیڈفورڈ کالج لندن میں منعقد ہوئی تھی عبداللہ یوسف علی نے ان افراد کی اہمیت واضح کی تھی جو ایک دوسرے کے روحانی نقطۂ نظر کو سمجھتے تھے اور ان کے تجربہ میں شریک بھی تھے۔ اشارہ تھا ان کی اپنی مساعی کی جانب جو وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے کرتے رہے تھے انہوں نے کہا تھا کہ ''وہ جو بے خوف اور جری ہیں اس بات سے خوشی محسوس کرتے ہیں کہ دوسرے بھی روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اگر ان کی گرفت میں روشنی کی ایسی کرنیں آئی ہیں جو کہیں اور سے نکلتی ہیں تو ان کی توقعات اور ایمان میں مزید تقویت کا سامان فراہم ہو جاتا ہے جس کا سلسلہ مسلسل وسعت پذیر دائروں تک پھیلتا رہتا ہے''۔ (۲۱) انہوں نے اپنے کام کے لیے عربی کے علوم پر گہری دسترس حاصل کرنے کو یا علوم اسلامی کی تعلیم کو اپنے مشن میں شامل نہیں کیا تھا۔ لیکن بڑے جذبہ سے بھرپور انداز میں ان کا مقصد و منزل یہ رہا کہ مشرق و مغرب میں فاصلوں کو کم کیا جائے اور اسلام کے پیغام کا زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا آسان بنایا جائے۔ (۲۲)

ذاتی اور شخصی سطح پر عبداللہ یوسف علی ایک پاکیزہ زندگی گزارتے تھے۔ وہ نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی امامت بھی کرتے تھے۔ کربلا کی زیارت بھی کی تھی اور حج کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوئے تھے۔ رمضان کے روزوں کا اہتمام رکھتے تھے اور اپنے مضامین میں حضورؐ کا تذکرہ ''میرے محبوب'' کے الفاظ سے کرتے تھے۔ (۲۲) انہوں نے انیسویں صدی کے جونپور والے شیخ کرامت علی کی بھی بڑی تعریف کی تھی اور اصول طریقت پر مبنی

تصوف بھی انہیں دل سے عزیز تھا۔ وہ لکھتے ہیں ''یہ لوگ ایسا تفاخر نہیں رکھتے کہ اپنے راستہ کو علیحدہ کر کے اس کے مطلق مجاور بن جائیں اور دنیاوی مال و دولت کے طلب گار ہوں۔ وہ اسراف کی زندگی بسر کرنے کے قائل نہیں''۔ (۲۳)

مشرق اور مغرب کے مابین ایک مشترک روحانی رشتہ کا تصور جس میں تصوف کی چاشنی بھی شامل تھی، عبداللہ یوسف علی کا حسن خیال تھا، اور اسی لیے ان کی کوشش تھی کہ اسلام کو ایک ''عالمی مذہب'' کے طور پر پیش کیا جائے۔ یہ اصطلاح انہوں نے اپنی کتاب ''انڈیا اینڈ یورپ'' میں استعمال کی تھی۔ ان کا یہ تصور اسلام، اعتماد کا حامل اور داخلیت سے مبرا اور باہر کی دنیا سے آنکھیں چار کرنے والا تھا۔ اس میں فرقہ ورانہ عصبیتوں کا کوئی مقام نہ تھا۔ انہیں سائنس کی دنیا میں ہونے والی ترقی کا اتنا علم تھا کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کا دفاع پوری قوت سے کر سکتے تھے اور مافوق العادت واقعات اور اعمال کی سائنس کی اصطلاحات میں وضاحت کرنے میں کسی قسم کی معذوری محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جدید سائنس روحانیت کے مقاصد کی مخالف یا دشمن نہیں ہے۔ اور جوں جوں اس کا دائرہ وسعت پذیر ہو رہا ہے اس کی ''مادیت'' کا پہلو بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''قرون وسطیٰ میں لکھے گئے اسلامی علوم کے رسائل اخوان الصفا جن میں اس وقت کی سائنس کی دنیا کی تفسیر ملتی ہے، کا مزاج اور روح بڑی گہری مذہبی ہے۔ نیوٹن جو جدید طبعیات اور سائنس کا باوا آدم کہلایا جا سکتا ہے خود بہت مذہبی قسم کا انسان تھا۔ کون ہے جو جینز اور ایڈیگٹن کی فلکیات سے متعلق حیرت انگیز تحریروں کو پڑھ کر یا ریڈیائی لہروں اور ایٹم کی ساخت یا نظریۂ قدریہ (Quantum theory) کو تھوڑا بہت بھی سمجھ کر یا پھر توانائی اور نظریۂ اضافیت کے مسائل سے آگاہی پر یہ محسوس کیے بغیر رہ سکے کہ مادہ جدید سائنس کے نقطہ نظر

Marfat.com

سے کافی پیچیدہ چیز نظر آ رہا ہے اور قطعاً ویسا نہیں ہے جیسا کہ ایک نسل پہلے تک بھی سائنس دانوں اور مادہ پرستوں کو دکھائی دیتا تھا۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو مادہ کو جدید سائنس نے خود روحانیت عطا کر دی ہے۔ (۲۴)

عبداللہ یوسف علی نے اسلام کا ایک خود اعتماد اور وسعتوں کی طرف بڑھنے والا تصور پیش کیا تھا لیکن ان کے تصور اسلام میں اس کے چند ضروری عناصر کٹ گئے تھے۔

سب سے اہم پہلو جو نظر انداز ہو گیا تھا اسلام کا وہ پیغام تھا جس کا تعلق سیاسی و سماجی دائرہ سے تھا جہاں ریاست کے امور میں شریعت کا حوالہ آتا ہے۔ ان کی منظّم و ہم آہنگ دنیا میں ایک ایسا ''اسلام'' ہی جگہ پا سکتا تھا جس میں سے بعض اجزا مختصر کر دیے گئے ہوں یا علیحدہ کر دیے گئے ہوں۔ ممکن ہے ہندوستانی معاشرہ کی وہ ترکیب خاص جس میں مسلمان اقلیت میں تھے کے پیش نظر یا پھر برطانوی تسلط کی حقیقت کو چار و ناچار قبول اور تسلیم کرتے ہوئے، عبداللہ یوسف علی نے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کر لیا ہو کہ مذہب اب حکومت و سیاست سے علیحدہ چیز ہے۔ یا پھر اُن کے اپنے الفاظ میں ''چرچ اور ریاست کی آویزش ہم میں سے بیشتر لوگوں کے لیے ایک بھولی بسری کہانی ہے''۔ (۲۵) ''آج کی ضرورت یہ ہے کہ ہم اُس جنگ میں اپنا وزن کسی ایک جانب ڈالیں جو ایمان و عقیدہ والوں اور تشکیک پسندوں کے مابین ہے، جس میں ایک طرف نفرت و اعراض کا رویہ ہے اور اس کے مقابلہ میں خیر پسندی اور بھلائی کے کام ہیں، جہاں ایک جانب بین الاقوامی مسابقت اور رقابتیں ہیں اور ان کا مقابلہ ذاتی اور شخصی آزادی اور کردار کی استقامت سے ہے۔

انہوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کے جواز کے لیے بڑے طول طویل دلائل دیئے ہیں جن

Marfat.com

کا آئندہ باب میں محاکمہ کیا گیا ہے۔اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں سے وہ برطانیا کے ڈسپلن اور نظم وضبط کا ایک مؤثر منظر دیکھتے چلے آرہے تھے۔وہ یہ اندازہ نہیں کرسکے تھے کہ اس کا زوال اب ضروری ہوگیا ہے۔انہیں تو سلطنت برطانیا کی عظمت ایک طے شدہ امر دکھائی دیتا تھا۔ان کا مذہبی نقطۂ نظر ان کو نظام فطرت کی خوبصورتی، حسن اور توازن کو سمجھنے اور اس سے متاثر ہونے کی جانب لے گیا تھا تو ہوسکتا ہے کہ برطانوی سلطنت کی شان وشوکت اور عظمت بھی اس کرۂ ارض پر خدائی حکمت عملی کا ایک حصہ اور نمونہ نظر آئی ہو۔

حواشی باب ۸

۱- ملاحظہ ہو ان کی تالیف ''لائف اینڈ لیبر آف دی پیپل آف انڈیا'' کا دیباچہ مطبوعہ ۱۹۰۷ء

۲- اس کی شہادت ایک مضمون سے ملتی ہے جو عبداللہ یوسف علی نے جنوری ۱۹۴۱ء میں جریدہ ''ریلیجنز'' کے لیے لکھا تھا۔ عنوان تھا ''جدید دنیا اور قدیم یونانی ثقافت''۔ اس میں وہ لکھتے ہیں ''یونانیوں کی حسن سے محبت نے زندگی کے ہر شعبہ میں ٹھوس شکل اختیار کر لی تھی۔ جس میں مصوری بھی شامل ہے۔ اگر ہمیں زیوکس اور اپیلز جیسے فن کاروں کے فن پاروں کی ایک جھلک دیکھنے کا موقعہ ملے تو ہم اس کے بدلے کیا کچھ دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے''۔(YA 351)

۳- ملاحظہ ہو ان کا آرٹیکل ''مستر ووک اور سربین مجسمہ سازی'' مطبوعہ ۱۹۱۶۔

۴- ملاحظہ ہو نظم بعنوان ''تھور والڈسن کے نام'' جو ۱۹۱۸ میں ڈینش زبان میں طبع ہونے والی کتاب Traek of Indien Kultur میں شامل ہے۔

۵- ملاحظہ ہو عبداللہ یوسف علی کی تصنیف ''انڈیا اینڈ یورپ'' مطبوعہ ۱۹۲۵ صفحہ ۱۲۳

۶- ایضاً صفحہ ۹۷

۷- ملاحظہ ہو ''ایشیاٹک ریویو'' کے شمارہ جنوری ۱۹۴۱ میں سی کولن ڈیوس کا ان کی تالیف ''اے کلچرل ہسٹری آف انڈیا ڈیورنگ برٹش پیریڈ'' پر تبصرہ۔ یہ اردو کی کتاب ''ہندوستان کے تمدن کی تاریخ'' کا ترجمہ تھا جو عبداللہ یوسف علی نے ستمبر ۱۹۳۱ میں

Marfat.com

مکمل کیا تھا۔ عبداللہ یوسف علی کی ''فری میسزی'' کے کردار کے بارے میں واقفیت ان کے ایک فقرہ سے ہوتی ہے جو ان کی تالیف ''لائف اینڈ لیبران انڈیا'' میں ملتا ہے: ''شخصی اور عوامی زندگی میں جو اثرات بہت دور تک پہنچتے ہیں وہ نہیں ہوا کرتے جن کے بارے میں اکثر تذکرہ ہوتا ہے''۔ ان کے مضمون بعنوان ''گوئٹے کا مشرقی تہذیب وادب کا مطالعہ'' میں جو کنٹمپریری ریویو' کے اگست ۱۹۰۶ کے شمارہ میں شائع ہوا تھا، اس فرقہ کے بارے میں کئی جگہ اشارات ملتے ہیں۔ قرآن کی تفسیر میں اس اصطلاح کا استعمال اس طرح ہوا ہے جس سے اس نقطۂ نظر سے ان کے متفق ہونے کا بالواسطہ اشارہ ملتا ہے ''اور رفاقت سے حوصلہ پاتے ہوئے وہ عورتوں کے درمیان ایک عورت کی حیثیت سے اس بات کا برملا اعتراف کر لیتی ہے (جیسا کہ فری میسن کرتے ہیں) جو وہ اس سے پہلے دوسروں کے سامنے کرنے میں شرم محسوس کرتی'' ملاحظہ ہو ''دی ہولی قرآن'' تیسرا ایڈیشن نوٹ نمبر ۱۶۸۰۔

اٹھارویں صدی میں فری میسزی تحریک نے زمانہ ماقبل مسیح کے یونانی افکار سے کئی علامتوں کو مستعار لیا تھا تاکہ وہ دانشور حضرات جو کلیسا سے بیزار ہو رہے تھے اس تحریک کے اندر کشش محسوس کریں۔ یونانی فکر کا نوافلاطونی عنصر انیسویں صدی میں باقی تھا۔ ہندوستان کے وہ مسلمان جن کو یورپ کی کلاسیکل تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقعہ ملا تھا کسی نہ کسی درجہ میں اس کے لیے کسی درجہ میں کشش محسوس کرتے ہوں گے۔ انہیں ''عظیم معمار'' کی میسزی علامت بھی توحید کے عقیدہ کے قریب محسوس ہوتی ہوگی۔ چنانچہ یوسف علی کا تفسیری حاشیہ نمبر ۱۰۶۶ اس سیاق وسباق مین دلچسپی کا

Marfat.com

حامل ہے۔

۸۔ ملاحظہ ہو ''ساؤتھ پلیس اتھیکل سوسائٹی منتقلی رکارڈز'' بابت جولائی ۱۹۴۱ء (YA361)

۹۔ ''انڈیا اینڈ یورپ'' صفحہ ۹۷

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ملاحظہ ہو یوسف علی کا مضمون جو ''اوورسیز کلب'' اور ''دی پیٹریاٹک کلب آف برٹینز اوورسیز'' کے جریدہ ''اوورسیز'' میں فروری ۱۹۱۸ میں شائع ہوا۔ جلد سوم، نمبر ۲۵

۱۲۔ ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور ۱۰ ر نومبر ۱۹۳۷

۱۳۔ عبداللہ یوسف علی کے مضمون بعنوان ''مسلم ممالک میں ظلم و استبداد جو ۱۹۴۲ میں لکھا گیا تھا۔ یوسف علی تائید کے لیے سکندر حیات خاں کا قول نقل کر رہے تھے۔

۱۴۔ ملاحظہ ہو مخطوطہ نمبر (فائل نمبر ا IOL:L/1/1/1268,F) یہ اقتباس اس مضمون سے ہے جس کا عنوان تھا ''برطانوی جمہوریت ایک مسلمان کی نظر سے'' سے لیا گیا ہے۔ تاریخ ہے ۹ رمئی ۱۹۴۱

۱۵۔ مراسلہ، مطبوعہ ''دی ٹائمنز'' ۲۹ ر نومبر ۱۹۱۸ء

۱۶۔ ''دی ٹائمنز لٹریری سپلیمنٹ'' ۱۹ ر ستمبر ۱۹۱۸ء

۱۷۔ ''ایسٹرن ٹائمنز'' لاہور ۱۵ ر ستمبر ۱۹۳۶ (YA 133)

۱۸۔ ''دی ہولی قرآن'' ایضاً۔ حاشیہ نمبر ۵۹۸۲ ''مشرقی ادب اور خصوصاً مذہبی تمثیلی واقعات کے بیان میں عام طور پر ایک بات کے کئی معانی اور مفاہیم نکلتے ہیں جو ایک دوسرے میں ملفوف ہوتے ہیں۔ اگر قاری پورے بیان کا مکمل مفہوم جاننا چاہتا ہے تو اسے ان

(تہہ بہ تہہ) معانی کی پرتوں کو سمجھنا ہو گا۔ یہ بات قرآن کے حوالے سے بالکل درست ہے''۔

۱۹- ایضاً۔ پہلے ایڈیشن کا دیباچہ۔ اگلا اقتباس بھی یہیں سے ہے۔

۲۰- ''تعزیتی نوٹ'' دی ٹائمز، ۶/ اگست ۱۹۲۸

۲۱- ''ورلڈ کانگریس آف فیتھس'' ۱۹۴۰۔ یوسف علی کا خطاب ۶/ جولائی کو ہوا تھا (YA 340)

۲۲- ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور ۲۸/ اپریل ۱۹۳۹ (YA 147)

۲۳- ''کریسنٹ'' اسلامیہ کالج لاہور کا مجلّہ اکتوبر ۱۹۳۶ (YA 147)

۲۴- ورلڈ کانگریس آف فیتھس کا شائع کردہ پمفلٹ بعنوان ''دنیا کے لیے مذہب کی ضرورت'' مطبوعہ آکسفرڈ ۱۴/ جولائی ۱۹۳۷۔ صفحہ ۴۔ یوسف علی نے اس میں یہ بھی لکھا تھا ''آئین سٹائن طبعی سائنس کی دنیا میں 'اضافیت'' کی گہرائیوں کی پیمائش کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ اس سے روحانی دنیا کی حد تک توحید خداوندی کی جانب بتدریج مزید اشارے واضح ہوتے جا رہے ہیں''۔ ملاحظہ ہو ''دی ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ نمبر ۶۲۷

۲۵- ''دنیا کے لیے مذہب کی ضرورت''۔ ورلڈ کانگریس آف فیتھس ۲۴/ جولائی ۱۹۳۷ صفحہ ۷۔ اگلا اقتباس بھی اس سے لیا گیا ہے۔

Marfat.com

باب نہم

قرآن بطور ہدایت

عبداللہ یوسف علی کے قرآن کے بارے میں علم ومطالعہ کا نتیجہ ۱۹۳۴ سے ۱۹۳۷ کے درمیانی عرصہ میں بالاقساط سامنے آیا تھا۔ اگر چہ اگلے سات برس تک عبداللہ یوسف علی مختلف موضوعات اور عنوانات پر لکھتے رہے تھے لیکن ان کا سب سے زیادہ معرکتہ الآ راء کارنامہ یہی تفسیر قرآن مجید ہے۔ اس کارنامے کے حوالہ سے ان کا نام آناً فاناً ساری انگریزی سمجھنے والی اور بولنے والی دنیا میں معروف ہو گیا۔ تفسیر قرآن کا انداز یہ تھا کہ اس میں ترجمے کے علاوہ چھ ہزار سے زیادہ حاشیے لکھے گئے تھے۔ متعدد ضمیمے اور غیر مقفّی شعری کاوش کے سے انداز میں مسلسل تشریح وتوضیح کی گئی تھی۔ (۱) یہ ایک تاریخی اور عظیم کام تھا جس میں ہمیں ایک دانش ور اور گہرے غور وفکر کے عادی انسان کا قرآن کی عظمت وشکوہ کے ساتھ تعارف اور مطالعے کے سفر کا ریکارڈ ملتا ہے۔ اس تفسیر کا اصل ہدف اور جوہر اسلام کی روحانی جہت پر اصرار اور توجہ اور اخلاقی نشاۃ ثانیہ کے پیغام کی وضاحت ہے۔

قرآن کے اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کی بنیاد ہمیں عبداللہ یوسف علی کی ابتدائی زندگی کے تجربات، جذبات اور امنگوں اور نظریاتی وابستگی میں ملتی ہے۔ نجی زندگی کی مشکلات اور مسائل، ابتدائی علمی وادبی تخصص اور ایک کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے تجربات نے مل کر ان کی قرآن فہمی اور اس حوالے سے ان کے نقطہ ہائے نظر کو ضرور متاثر کیا تھا۔

جب عبداللہ یوسف علی کی عمر ۳۰ سال کی تھی تو بمبئی کا یہ نوجوان عالم جس کے وسائل درمیانہ درجے کے تھے ایک ایڈورڈ عہد کا ایک مہذب اور پر اعتماد انسان بن چکا تھا اور ابتدائی

Marfat.com

زمانے کے گنتی کے ان چند مسلمانوں میں شامل ہو گیا تھا جو ہندوستان کی اشرافیہ پر مشتمل انڈین سول سروس میں انتظامی عہدہ پر فائز ہوئے تھے۔ شمالی افریقہ اور بلقان میں عثمانیوں پر جو کوہ غم ٹوٹا تھا وہ پہلی جنگ عظیم سے قبل کی تاریخ کا حصہ ہے۔ اس نے عبداللہ یوسف علی کو اس طرح متاثر نہیں کیا جیسا کہ ان کے ہم عصروں مثلاً محمد علی جوہر اور محمد اقبال کو کیا تھا۔

پہلے تو انہوں نے ایک سماجی مورخ کی حیثیت سے ہندوستان کے مذہبی رسم ورواج اور افعال واعمال کا تجزیہ کیا جس کا انداز ان روایتی آئی۔ سی۔ ایس افسران کا تھا جو اسکالرز بھی ہوتے تھے اور اپنی منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ اضافی علمی کام بھی دلچسپی سے کرتے تھے۔ ان کی عملی زندگی کی دوسری دہائی ان کے لیے کچھ سخت قسم کے حادثات لے کر آئی جو ان کو اس لیے بھی شدید محسوس ہوئے ہوں گے کہ وہ اب تک ناکامیوں سے بالکل ناآشنا تھے۔ پہلا حادثہ ان کی بیوی ٹیریسا شیلڈرز کی بے وفائی تھی یہ حادثہ ۱۹۱۳ میں پیش آیا۔ دوسرے صدمہ سے وہ اگلی دہائی یعنی ۱۹۲۰ء کے اردگرد اس وقت دوچار ہوئے جب ان کے بچوں نے بڑے ہو کر ان کے خلاف باغیانہ رویہ اختیار کر لیا۔ ان جذباتی صدمات نے، جو زندگی کے سفر کے عین درمیان میں ان کو پیش آئے، ان کے زندگی کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا۔ اگرچہ سلطنت برطانیا سے وفاداری کے جذبہ سے تو وہ پیچھا نہیں چھڑا سکے لیکن اس نے ان کے اندر مذہبی جذبہ کی ازسرنو بیداری میں مدد ضرور کی۔

قرآن مجید سے عبداللہ یوسف علی کا عہد وفا اسی اذیت اور کرب کے دور میں استوار ہوا اور یہی وقت تھا جب وہ قلبی سکون وراحت اور عافیت کے متلاشی ہوئے۔ اس طرح ان کا مطالعۂ قرآن ایک گہرا اور ذاتی معاملہ اور تجربہ بن گیا۔ وہ جس تحقیق وجستجو میں منہمک تھے اس کو انہوں نے بالکل مخفی رکھا اور ایسا پردہ ڈال دیا کہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک جو آٹھ پمفلٹ ''پروگریسو اسلام'' کے سلسلے میں انہوں نے تحریر کیے ان میں کہیں بھی اس کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ تفسیر

Marfat.com

قرآن لکھنے کا ارادہ یا تیاری کر رہے ہیں۔

قرآن اپنے پیغام امید اور یقین کے ذریعے جو سہارا اور ڈھارس اور ہمت انسان کو عطا کرتا ہے اس نے عبداللہ یوسف علی کو بہت متاثر کیا تھا۔ اس توانائی نے ان کے مطالعہ و تحقیق اور علمی کاوشوں کو ایک امتیازی سلیقۂ اظہار و تفہیم فراہم کر دیا جس کا اظہار ۱۹۳۴ میں ہوا جب ان کی طویل محنت اور مشقت کے نتائج دنیا کے سامنے آئے۔

عبداللہ یوسف علی نے پریشانی اور کلفت کے عرصہ میں جس طرح قرآن کے پیغام کو دریافت کیا اس کا حوالہ نہ صرف ''قرآن پاک ترجمہ و تفسیر'' کے دیباچہ میں ملتا ہے (۲) بلکہ تفسیر کے اندر کئی مختلف مقامات پر بالواسطہ اس طرف اشارے ملتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں ''کیسے اور کتنی بار روح پر پڑنے والے شدید قسم کے صدمات ان بارش کے ٹھنڈے قطروں کا پیغام لاتے ہیں جو ہماری روحانی بالیدگی میں اضافہ کرتے ہیں، جو ہماری روح کو پاک و صاف کر دیتے ہیں اور جہاں صحرا تھا اور روح پیاسی تھی وہاں ہمیں سیراب و شاداب روحانیت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ (۳) ایک دوسری جگہ ان کا اشارہ اپنی سوانح حیات کی جانب محسوس ہوتا ہے جب وہ بچوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ ''جب بچے آپ کے نظریات سے اختلاف کر کے آپ کو روحانی اذیت پہنچاتے ہیں ان کا یہ رویہ آپ کو ساتھ ہی خدا سے اپنی وفاداری اور تعلق استوار کرنے میں بھی مدد دیتا ہے''۔ (۴) لیکن عبداللہ یوسف علی کے شعور و احساس کو جو زخم لگے تھے وہ بہت گہرے تھے اور ان کا اظہار بہت بعد میں یعنی ۱۹۴۰ میں بھی اس وقت نظر آتا ہے جب انہوں نے اپنے بچوں پر، جن سے شفقت و مودت کے علاقے پہلے ہی منقطع تھے، یہ کہہ کر شدید تنقید کر ڈالی: ''انہوں نے میرے ساتھ کھلی بدنیتی اور دشمنی کا رویہ اختیار کر رکھا حالانکہ میں نے ان کے لیے بہت کچھ کیا تھا'' (۵) تفسیر میں وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ''اگر آخرت کا وجود تسلیم نہ کیا

Marfat.com

جائے تو پھر اس دنیا کی بدنظمیوں اور ناانصافیوں کے ساتھ سمجھوتا کس طرح ممکن ہوگا''؟ (۶) اگر ان کی زندگی میں رونما ہونے والے ان حادثات کو پیش نظر رکھا جائے تو ان کا یہ سوال ایک رسمی نوعیت کا سوال کا نہیں رہتا۔ کتاب اللہ میں اس دنیا کے وجود کو جو بار بار اور بتکرار عارضی اور فانی کہا گیا ہے وہ ان کے احساس و شعور کا حصہ بن گیا تھا۔ اس احساس نے ان کی تفسیر میں علائق دنیا سے علیحدگی کا شعور و احساس اجاگر کیا۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں ''وہ گزر جانے والی شجاعت اور حسن کہاں ہے؟ جو کچھ آثار باقی ہیں وہ راکھ اور دھول کے علاوہ اور کیا ہیں؟ ہم اس طبعی اور مادی دنیا سے اس کے علاوہ اور کیا پا سکتے ہیں۔ (۷)

اس ذہنی کیفیت کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے پسندیدہ انگریزی شاعر ''لانگ فیلو'' کا حوالہ دیتے ہیں جس نے کہا تھا ''انسانی نظر کے دھوکے سے ساری دنیا محض ایک عارضی اور فانی نظارہ ہے جو جلد گزر جانیوالا ہے''۔ (۸)

زلیخا اور یوسف علیہ السلام کا قصہ، ''جس میں شہزادی نے حالت غم و اندوہ اور رسوائی کے احساس سے بہت کچھ سیکھا تھا''، تفسیر میں کئی صفحوں پر محیط ہے۔ وہ اس قصہ میں خود کو زلیخا سے مماثل سمجھ سکتے تھے کہ جس طرح ٹیریسا میری کے ہاتھوں اپنی تحقیر برداشت کرنے کے بعد انہیں اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا کہ آخرت کا وجود کیوں ضروری ہے، اسی طرح زلیخا بھی تحقیر اور ذلت برداشت کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ دنیاوی اور حسی محبت لاحاصل ہے۔ (۹)

عبداللہ یوسف علی پر جس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا وہ زلیخا سے مختلف نہیں تھا۔ سچی محبت تو مکمل سپردگی اور تسلیم و رضا کا مطالبہ کرتی ہے، ایسی قربانی جس میں کسی دنیاوی طلب و طمع کا کوئی داغ نہ ہو۔ (۱۰) دنیاوی زندگی تو بڑی بے ہنگم ہے۔ ہماری مادی زندگی تو مادی غذاؤں کے سہارے قائم رہتی ہے اور اس کی خوشیاں اور آسودگیاں صرف اس دنیا کے پردہ پر ہی نظر آتی ہیں۔ حقیقی

Marfat.com

زندگی کی مسرتیں تو ناقابل بیان ہیں اور وہ خدا کی ذات کے قرب سے ہی میسر آتی ہیں۔(۱۱)

اپنی ذاتی، شخصی اور مابعد الطبیعاتی ذوق کے علاوہ جس دوسرے عنصر نے عبداللہ یوسف علی کے تفسیری علم و مطالعہ کو متأثر کیا تھا اس کا تعلق ان کی تعلیم و تربیت سے تھا۔ گریجویشن کے فوراً بعد انہوں نے تاریخ یونان پر لکچر دیے تھے اور یونانی ثقافت سے انسیت کا اثر ساری زندگی ان پر موجود رہا تھا۔ ۱۹۴۱ میں انہوں نے ایک مضمون لکھا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر قرآن کے بعد بھی ''یونانیات'' کے بارے میں ان کا جوش و جذبہ کم نہیں ہوا تھا وہ لکھتے ہیں:

''یونانی فن تعمیر میں جو حسن کاری تھی وہ کسی درجہ میں ہم اکروپولس (Acropolis) (قدیم یونانی تہذیب کے آثار جو آج بھی موجود ہیں) میں آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ حسن صرف شکل اور تناسب کا نہیں ہے بلکہ اس ترتیب کا بھی اس میں دخل ہے جس کے ذریعہ گردو پیش کے ماحول اور فطرت کے حسن کو جو چاروں طرف بکھرا ہوا ہے اس میں استعمال کیا گیا ہے۔ ظروف سازی اور روزمرہ کے عام فنون اور دستکاریوں میں یونانیوں کی حسن پرستی اور اس کے اظہار کے سلیقے پر جو قدرت تامہ ان کو حاصل ہے ہم اس کو محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن یونانی زبان اور ادب میں جو حسن سمٹ آیا ہے وہ ہر تجزیے اور تشریح سے ماورا ہے۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ اگر دیوتا مغرب میں آجائیں تو وہ بھی افلاطون ہی کی زبان بولیں گے''۔(۱۲)

عبداللہ یوسف علی کو یونان کے جواں مردوں اور سورماؤں سے جو شدید وارفتگی اور ذہنی تعلق تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے تفسیر میں ''ذوالقرنین'' پر کافی طویل بحث کی اور اس امکان کا اظہار کیا کہ یہ تاریخی کردار ممکن ہے ''سکندر اعظم'' ہو۔ عبداللہ یوسف علی نے اپنی تحقیق کے بارے میں یہ نوٹ لکھا ہے ''میں نے سکندر اعظم کی غیر معمولی شخصیت کی تفصیلات یونانی مصنفوں کے مطالعے اور جدید ذریعوں کے ذریعہ نہایت دقت نظر سے دیکھی ہیں۔ یہ موقع قرآن کی تفسیر لکھنے والے علماء میں

سے کم ہی کو ملا ہوگا''۔ (۱۳)

یونانی ادب اور فکر میں غیر مرئی اور نا قابل فہم یا پراسرار چیزوں کے مفاہیم کی تلاش کا جو عنصر ملتا ہے عبداللہ یوسف علی اس سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''ہر آئت ایک نشانی یا علامت ہے۔ ہر آیت میں زندگی کے ایسے معاملات پر بحث کی گئی ہے جن پر فوری فیصلہ یا عمل کیا جا سکے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ہر آیت کسی ایسی چیز کی بھی نمائندگی کرتی ہے جو ابدی ہے اور زبان و مکان سے آزاد اور ماورا ہے۔ انہی کو افلاطون نے ''افکار کی صورت گری'' قرار دیا ہے۔ اصحاب دانش یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ایک چیز بات کا مغز یا روح ہوتی ہے اور دوسری چیز مغز کا چھلکا یا روح کا لباس ہے جو وضاحت کے لیے کتاب اللہ میں بھی ہر جگہ استعمال ہوا ہے''۔ (۱۴)

افلاطون کے صوفیانہ اصول کے مطابق جو اس نے اپنی ''جمہوریہ'' میں وضاحت سے بیان کیا ہے کسی چیز کی اصل شکل، وضع یا خیال کو ناموں یا اسماء سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ان کو اشیاء کی فطرت اور خصوصیات سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اللہ نے آدم علیہ السلام کو سکھائے تھے۔ (۱۵) اس طرح یہ پورا نظام کائنات ایک علامت قرار پاتا ہے۔ اصل حقیقت اس پردے کے پیچھے مخفی ہے جیسے کہ افلاطون کے نظریۂ افکار کے مطابق اصل روشنی غار کے دوسری جانب ہے۔ (۱۶)

اس قسم کی دانش ورانہ ذہنی دلچسپیاں عبداللہ یوسف علی کو اس طرف لے گئیں کہ قرآن کی آیات کے اندر جو رموز و آثار اور علامتیں ہیں ان کو پوری محنت سے تلاش کیا جائے۔ اس طرح ''مچھلی'' دنیاوی علوم کی علامت بن گئی۔ (۱۷) ''پنڈلی'' مخفی ترین حقائق کی علامت (۱۸) اور سورج یا شمس ذہانت کے مفہوم کی علامت قرار پائے۔ (۱۹) اس طرح قرآن نے جگہ جگہ جو پانی اور روشنی کا حوالہ دیا ہے اس کی انہوں نے بار بار تشریح کی ہے۔ (۲۰) اسی طرح انہوں نے ''حروفِ

مقطعات'' کو سمجھنے کی حتیٰ المقدور کوشش کی ہے۔(۲۱) ان کا یہ فلسفیانہ انداز بے سود ثابت نہیں ہوا اور انہوں نے قرآن کو شعور و عقل کی روشنی میں پڑھنے کی جو تمنا کی اس نے انتہائی گہرے حقائق اور عمیق سچائیوں تک پہنچنے کی راہ کھولی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو: ''نماز کی حرکات و سکنات ذہنی رویوں کی علامتیں ہیں اور زندگی میں ہمارے مختلف رویوں کا اظہار ہیں۔ یہ جو مختلف حرکات ''قیام و قعود'' کی نماز میں کی جاتی ہیں یہ بھی ان تغیرات کی جانب اشارہ ہے جن کے ذریعہ روح کی آزمائش کی جاتی ہے اور اس کا امتحان لیا جاتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے انسانی جسم کو قیام و قعود اور رکوع و سجود میں مشق کرائی جاتی ہے۔''(۲۲) ان کی تفسیر میں قاری کو بار بار متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ کتاب فطرت کو پڑھے اور سمجھے۔ وہ مقامات جہاں انہوں نے اس عالم فانی کے پیچھے قادر و رحمان خدا کے ہاتھ کی کارفرمائی کی جانب اشارے کیے ہیں اُن کی فصاحت، بلاغت اور زور بیان کا ایک نمونہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ''خدا کی نشانیاں بے شمار ہیں۔ اس کی اس عظیم الشان دنیا میں، کائنات میں، قلب انسانی میں اور وحی الٰہی کی آیات میں''(۲۳) ''اگر ہم ان نشانیوں کی سچی روح تک پہنچ سکیں تو ہم اپنی روحانی زندگی کے لیے بڑے قیمتی سبق حاصل کر لیں گے''۔(۲۴) مختصر یہ کہ ''نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی تخلیق کردہ کائنات بغیر ایک اعلیٰ، اہم اور سنجیدہ مقصد کے نہیں ہو سکتی۔ یہ بیکار اور لایعنی بھی نہیں ہے اور نہ محض کھیل اور تماشا ہے''۔(۲۵)

اگرچہ عبداللہ یوسف علی عام طور پر یونانی علوم سے اپنی وابستگی اور واقفیت کا بہتر استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے علم و فضل کے حوالہ سے ایک دوسرا اشارہ بھی لوگوں کو منتقل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ''مخفی اسرار'' صرف غیر معمولی ذہین اور منتخب روزگار قسم کے لوگوں کی ہی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ ان کے اس فقرہ میں جو تبصرہ کیا گیا ہے اس میں روش عام سے اپنی ذات کو علیحدہ رکھنے کا اشارہ ملتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''تقلید کی روش اعلیٰ اور آخری نوعیت کے روحانی حقائق اور سچائی کو دائرۂ فہم و ادراک میں لانے کے لیے بہتر نہیں ہے''۔(۲۶) انہوں نے ایسے اشارے کیے ہیں جن

Marfat.com

میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون منتخب روزگار لوگ ہیں جنہیں باطنی یا صوفیانہ علم و روشنی میسر ہے اور جو باطنی دنیا کو سمجھتے ہیں۔ (۲۷) ایسے جذبات و احساسات ان کے اس نقطۂ نظر کے عین مطابق تھے جن کے اعتبار سے تفسیر قرآن کو فرد کے روحانی ارتقاء کے لیے رہنمائی کا کام دینا تھا۔ باطنی علوم کے لیے یوسف علی کی تلاش صرف تفسیر قرآن کے کام تک محدود نہ تھی بلکہ عوام اور بھیڑ پر ان کا عدم اعتماد ان کے فلسفۂ تعلیم اور سیاسی عقائد سب ہی کی صورت گری کر رہا تھا۔ (۲۸)

تیسرا عنصر جو ان کی تفسیر کے اسلوب اور مضامین پر اثر انداز ہوا وہ ان کی اسلامیہ کالج لاہور میں پرنسپل کے حیثیت سے منصبی ذمہ داریاں تھی۔ جس کا زمانہ تقریباً وہی تھا جب وہ یہ کام کر رہے تھے۔ اس کام کی اشاعت ۱۹۳۵ سے ۱۹۳۷ کے درمیان ماہانہ قسطوں کی صورت میں ہوئی تھی۔ ہر اعتبار سے عبداللہ یوسف علی ایک محبوب اور انتہائی فرض شناس صدر و مدرس تھے جو طلبہ سے کلاس میں اور کھیل کے میدان میں دونوں جگہ گھل مل جاتے تھے۔ انہیں نوجوانوں سے محبت تھی جن کی کامیابی پر خوشی اور مسرت ذاتی مفاد سے پاک تھی۔ (۲۹) یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۳۷ میں انجمن حمایت اسلام کے ایک دھڑے کے رویہ پر انہوں نے احتجاجاً استعفیٰ دیا تو ان کی حمایت میں طلبہ نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔

عبداللہ یوسف علی ہفتہ میں تین بار انگریزی (آنرز) کی کلاس کو لکچر دیا کرتے تھے۔ ان کے نتائج غیر معمولی طور پر شاندار ہوتے تھے۔ (۳۰) کلاس روم کی اس فضا میں ان کی انگریزی ادب پر گرفت اور زبان پر قدرت کی صلاحیت مزید صیقل ہوگئی۔ تفسیر میں انگریزی ادب کی عظیم شخصیات مثلاً شیکسپیئر، ملٹن، ٹینی سن اور انہی جیسے بہت سے شعراء اور ادباء کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ (۳۱) کہیں کہیں حاشیے میں ہیڈ ماسٹر والے انداز کی بھی جھلک نظر آئی ہے مثلاً ''سارٹر ری زورٹس (کارلائل کی تصنیف) ادب کے نووارد کے لیے سخت غذا ہے''۔ (۳۲)

عبداللہ یوسف علی کی فطری تمنا اور خواہش یہ تھی کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے بہت اعلیٰ مرتبہ پر ہوں۔ اس کے لیے وہ اپنی ذات اور شخصیت کے ذریعے مثال قائم کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ پرنسپل تھے ان کے اسٹاف کے ایک استاد پروفیسر غلام حسین نے ڈاکٹر تاثیر کے اعزاز میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا جو لاہور کے ایک ممتاز دانشور تھے۔ یوسف علی تو اس استقبالیہ میں موجود نہیں تھے لیکن انہیں اسٹاف کے ایک اور رکن نے استقبالیہ کے بارے میں جستہ جستہ کچھ باتیں بتائیں جس سے مقصد پروفیسر غلام حسین کی شخصیت کو کمزور کر کے دکھانا معلوم ہوتا تھا۔ عبداللہ یوسف علی کا ردعمل یہ ہوا کہ انہوں نے پروفیسر غلام حسین کو طلب کیا اور ان گپ باز صاحب کو کہا کہ اب آپ اپنی کہانی دہرائیں۔ اس قسم کا شدید سلوک بڑا کارگر ثابت ہوا اور سارے اسٹاف کے لوگ اس کے بعد ان کی موجودگی میں بہت محتاط ہو گئے۔ (۳۳)

ان کی تفسیر قرآن میں ہمیں ایک ایسے پرنسپل کی شخصیت بولتی محسوس ہوتی ہے جس کی شدید خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ سمجھائے اور سکھائے۔ وہ لکھتے ہیں ''ہر بات میں اعتدال اختیار کرو۔ نہ تیز بھاگو اور نہ اتنے آہستہ چلو کہ ٹھہرے ہوئے دکھائی دو۔ نہ بہت بولو اور نہ یہ ہو کہ بالکل ساکت وصامت ہو کر رہ جاؤ۔ بہادری کے اظہار کے لیے آواز بلند نہ کرو اور نہ بزدل بن کر دل تھوڑا کرو۔ اپنے اوپر حد سے زیادہ اعتماد بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اور ایسا بھی نہ ہو کہ خوف کے مارے کچھ بھی نہ کر سکو'' (۳۴)

ان کے بہت سے حاشیوں میں اس طرح کے مشورے اور ہدایتیں ملتی ہیں جن کا مقصد کردار میں بہتری پیدا کرنا ہے۔ مثلاً ''ہم کو غیر معقول گفتگو سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جب کچھ کہنا چاہو تو ادھر ادھر کی آئیں بائیں شائیں ہرگز نہیں کرنی چاہیے بلکہ صاف اور سیدھے طریقے سے سچی بات کرنی چاہیے۔ عملی طور سے بھی اور زبانی بھی''۔ (۳۵) اور مزید یہ کہ ''اسلام کا مدعا ہر

مسلمان مرد اور عورت کو ایک مہذب انسان بنانا ہے خواہ وہ معاشرہ میں کتنا ہی معمولی حیثیت کا مالک کیوں نہ ہو''(۳۶) یہ وہ جذبات اور احساسات تھے جو نتیجہ تھے اسلامیہ کالج کی وساطت سے نوجوان نسل سے براہ راست رابطے کا۔ مقصد یہ تھا کہ شخصیت میں ارتقاع پیدا کیا جائے۔ تفسیر میں وہاں بڑی روانی اور طلاقت لسانی نظر آتی ہے جہاں پر وہ اعلی کردار کی بات کرتے ہیں: ''ایک اچھے مسلمان کو بدنی طور پر صاف اور ذہن اور دل میں پاک باز ہونا چاہیے۔ اس کے محرکات عمل میں اخلاص ضروری ہے اور اس کے دین میں دنیا طلبی کی کوئی کھوٹ شامل نہیں ہونی چاہیے''۔(۳۷) عبداللہ یوسف علی کی بحیثیت کالج پرنسپل ملازمت نے انہیں روح قرآنی کو سمجھنے اور اسے جذب کرنے کا ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔

سرسید احمد خاں کی مانند جوان کے پیشرو تھے عبداللہ یوسف علی نے علوم اسلامی کی رسمی تعلیم و تربیت کی کمی کو تفسیر قرآن لکھنے کے لیے کوئی بڑی رکاوٹ نہیں سمجھا تھا۔ ''اگر روائتی قسم کے علماء نے نئی تعلیم یافتہ نسل کو اسلام کا پیغام پہنچانے کا چیلنج قبول نہیں کیا تو نئی نسل تو یہ مطالبہ ضرور کرے گی کہ قرآن کی جو تفسیر ہم کریں وہ اس علم سے موافقت رکھتی ہو جو آج ہمیں حاصل ہے''۔(۳۸) عبداللہ یوسف علی نے اس چیلنج کا جواب عملی طور سے دیا اور وہ اپنے علم و فضل اور انگریزی زبان پر غیر معمولی قدرت کو بہترین طریقہ سے اس کام کے لیے بروئے کار لائے۔

یہ ضروری ہے کہ مستند قسم کے مسلمان یہ کوشش کریں کہ وہ تصویر جو ان کے روح و ذہن کے منظر نامہ نے خود ان کے سامنے بنا کر دکھائی ہے وہ دوسرے لوگوں کے سامنے بھی لائیں۔(۳۹) لیکن بہر صورت وہ انتہائی محتاط تھے کہ ان کی یہ نئی تفسیر سلف کی روایات کا پورا لحاظ اور احترام کرتے ہوئے ہماری تاریخ کی اصل روایات سے انحراف کی صورت پیدا نہ کرنے پائے۔(۴۰) عبداللہ یوسف علی نے روایتی علماء کے اسلوب سے دامن تو ضرور بچائے رکھا مگر

سارے کام میں قدامت پسندی کی روح برقرار رہی تاکہ ان کی تفسیر سے کسی بھی نوعیت کا شدید رد عمل پیدا نہ ہو اور وہ عمومی مخالفت اور تنقید کا ہدف نہ قرار پائے جیسا کہ اس سے پہلے سر سید احمد خان کی تفسیر پر ہوا تھا۔

روایتی علمی کام پر جس تنقید کی جرأت وہ کر پائے تھے وہ صرف اس حد تک تھی کہ انہوں نے ضابطے قاعدے پر مفلوج کر دینے والے زور (۴۱) اور قوانین کے بارے میں شدت پسندی (۴۲) کے رویہ کے خلاف تنبیہ کی۔

تفسیر جب شائع ہوئی تو علماء کی جانب سے کوئی خاص تبصرہ وتنقید سامنے نہیں آئی جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بیشتر روائتی علماء انگریزی سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ پھر مزید یہ کہ سید سلیمان ندوی نے بہت شاندار الفاظ میں اس کی تعریف کر دی تھی جس کے بعد اگر کسی کو شک بھی ہوگا تو وہ بھی خاموش ہو گئے۔ مولانا ندوی نے کہا تھا ''مسلمان ادیبوں اور مصنفوں نے اتفاق رائے سے اس ترجمے کے حسن ودلکشی، روانی، سلاست اور شکوہ کی تعریف کی ہے۔ (۴۳)

عبداللہ یوسف علی نے تفسیر وترجمہ میں جو ثانوی ذرائع اور وسائل استعمال کیے تھے اس کے حوالہ سے سوالات ضرور اٹھائے گئے تھے۔ لیکن تفسیر کی جو خوبیاں تھیں اور جو خلوص اس کی ہر سطر میں نمایاں تھا اس نے ناقدین کو خاموش کر دیا۔ (۴۴) عبداللہ یوسف علی تحریری عربی اور قواعد سے ضرور واقف تھے اور انہوں نے آئی سی ایس کے امتحان میں عربی کا مضمون چار سو میں سے تین سو چالیس نمبر لے کر ۱۸۹۵ء میں پاس کیا تھا۔ انہوں نے اس بات کو چھپایا بھی نہیں تھا کہ ان کی عربی سے واقفیت قواعد کی حد تک تھی۔ وہ اس کو گفتگو میں استعمال کرنے پر قادر نہیں تھے۔ (۴۵)

عبداللہ یوسف علی کا طلبہ سے قریبی رابطہ لاہور میں بھی تھا اور لندن میں پروگریسو اسلامک ایسوسی ایشن کے اجتماعات میں بھی ہوا کرتا تھا۔ اس طرح انہیں اس بات سے آگاہی تھی

Marfat.com

کہ نئی نسل کو کس قسم کے شکوک وشبہات لاحق ہیں جو مذہب کے بارے میں ان کا رویہ تشکیل دیتے ہیں۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ ہندوستان کے مسلم نوجوان ایک فکری بحران سے دوچار ہیں اور اہم مسائل اور سوالات کے اطمینان بخش جواب کے بغیر وہ یقین کی دولت سے محروم رہیں گے۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ مذہب انؑ کی ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے یا پھر یہ کہ کیا مذہب اور سائنس میں کوئی مطابقت پیدا ہونا ممکن ہے؟ وہ اس کے لیے تیار تھے کہ ایک ایسا مباحثہ ہو جس میں مذہب اور جدید رویوں کو آمنے سامنے آنے کا موقع ملے جب کہ روایتی علماء اس مکالمہ کے لیے کسی صورت تیار نہ تھے۔ انہوں نے خود اپنی زندگی میں مغرب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا انقلاب برپا ہوتے دیکھا تھا۔ یہ بات بھی پوری طرح سمجھ لی تھی کہ ہندوستان کے سماج کو بھی وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ ''مستقبل میں انسانی تہذیب وتمدن میں ہونے والی ہر قسم کی ترقی کی کنجی اب سائنس دانوں کے ہاتھ میں ہے۔''(۴۶) ان کی تفسیر قرآن کی اشاعت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک نعمت اور تحفہ سے کم نہیں تھی جس نے ان کے ذہنوں میں یہ بات صاف کر دی تھی کہ اسلام کو سائنس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ عبداللہ یوسف علی کی ذات میں انہیں ایک ایسا عالم میسر آ گیا تھا جو نہ صرف سائنس کی مستند کتابوں سے حوالے دیتا تھا بلکہ اس بات پر بھی قادر تھا کہ تازہ ترین سائنسی مشاہدات کو آیات قرآنی کی روشنی میں مسحور کن خوبصورتی اور ذہانت کے ساتھ بیان کر سکے۔ وہ لکھتے ہیں ''جوں جوں عالم طبیعی میں انسان کا مشاہدہ اس کی دانش وفراست کی بنیاد پر وسیع ہوتا جاتا ہے وہ بہتر سے بہتر انداز میں اس بات کا ادراک کر سکتا ہے کہ توحید کس طرح خدا کی کائنات کا سب سے نمایاں اور غالب تصور ہے۔ صرف نظام شمسی ہی کو دیکھ لیں آج ہم کو معلوم ہو گیا ہے کہ جہاں جہاں شمسی دھبوں میں کثافت جتنی زیادہ ہے اتنی ہی جگہوں پر ہمارے کرۂ ارض میں مقناطیسی طوفان بھی زیادہ شدت سے آتے ہیں۔ کشش ثقل کا عالم گیر قانون ہر قسم کی کمیت والے اجسام کو باہم مربوط رکھے ہوئے ہے۔ طبیعی حقائق یہ اشارہ کرتے ہیں کہ یہ سارے سیارے

Marfat.com

دراصل اس مادہ کی کثیر مقدار سے تشکیل پاتے ہیں جو ''نیبو لا'' یعنی گیس وغبار کے بادل سے منتشر ہوکر چاروں طرف بکھرا ہوا ہے اور اس کا کثیف مرکزی حصہ خود سورج ہے''۔ (۴۷)

اسلامیہ کالج کے طلبہ کے سامنے ایک ایسا مذہبی انسان تھا جس کو ''علم الطبعیات'' نے بوکھلایا نہیں تھا۔ یوسف علی کا یقین آمیز اور ایمان افروز پیغام یہ تھا کہ سائنس تو ایمان وعقیدہ کی طرف لے جانے والا راستہ ہے۔ اگرچہ سائنس اور مذہب دو مختلف قسم کے لسانی اسالیب رکھتے ہیں لیکن دونوں جانب سے جو علم کی دنیا سامنے آئی ہے وہ دو جدا اور ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے ترجمے کے تعارفی حاشیہ میں لکھا تھا'' میں قرآن کی ترقی پسندانہ تفسیر میں یقین رکھتا ہوں جس کی ضرورت اس لیے ہے کہ روحانی مسائل کو مختلف زاویوں سے سمجھا اور سمجھایا جاسکے۔ (۴۸) ''اسلام'' سائنسی تحقیق کو خوش آمدید کہتا ہے۔ روحانی سچائیوں کو ہم اپنے زمانہ میں اور اپنی زندگیوں میں اس وقت روبہ عمل لا سکتے ہیں جب ہر قسم کے علم، سائنس اور تجربہ کو جو ہمیں میسر ہے پوری طرح استعمال کریں۔ (۴۹)

عبداللہ یوسف علی کا یہ بہت بڑا اور مثبت کام تھا کہ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی کالج میں پڑھنے والی ایک پوری نسل کو یہ سمجھا دیا کہ سائنس اور مذہب میں پوری مطابقت ممکن ہے۔ اگرچہ یوسف علی اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ سائنس کے انکشافات مذہبی حقائق کو سمجھنے میں مدد کر سکتے ہیں لیکن وہ متشدد قسم کے عقل پرست نہیں تھے۔ سرسید کی طرح انہوں نے اس امر کی قطعاً خواہش نہیں کی تھی کہ قرآن میں مذکورہ معجزات کا کوئی سائنسی تجزیہ اور وضاحت پیش کریں۔ مثال کے طور پر انہوں نے سرسید کے تتبع میں یہ نہیں کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو روشنی پہاڑ پر دیکھی تھی وہ جلوۂ ربانی نہیں تھا بلکہ کسی مسافر کی جلائی ہوئی آگ رہی ہوگی۔ (۵۰) عبداللہ یوسف علی اس قسم کے معذرت خواہانہ اندازِ فکر سے بہت بلند تھے۔

Marfat.com

ان کے تخلیقی جذبہ کی حرارت محض خدمت خلق کے داعیہ پر مبنی نہیں تھی بلکہ انہیں اس ضرورت کا شدت سے احساس تھا کہ مسلمانوں کو سلطنت برطانیا کا اچھا شہری بنایا جائے اور ان کو برطانیا مخالف آزادی کی تحریکوں کے نعروں کی گونج میں گم ہو جانے سے بچایا جائے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے عبداللہ یوسف علی کی تفسیر قرآن کا ایک پہلو ایسا ضرور تھا اور اب بھی ہے جو انتہائی متنازع رہا ہے۔ وہ پہلو دورِ جدید میں ان کا اسلام کے سیاسی اور سماجی کردار کے بارے میں متضاد ذہنی رویہ ہے۔ ان کی تفسیر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اسلام دینی اور دنیاوی امور میں کوئی واضح خط تفریق قائم نہیں کرتا ہے۔(۵۱) تفسیر میں اس حقیقت کا اثبات بھی موجود ہے کہ دین اسلام انسان کی ہر جائز اور معقول احتیاج کا لحاظ رکھتا ہے اور روحانی اور مادی معاملات میں خط امتیاز قائم نہیں کرتا۔(۵۲) اسلام کا ایک جامع دین اور نظام حیات ہونے کا تصور یوسف علی کی دوسری تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ ''مسلمانوں کا نظریہ ریاست و حکومت مذہبی تھا۔(۵۳) مزید یہ کہ مسلمان ریاستوں نے اس امر کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ امور مالیات واقتصادیات کا تعلق اخلاقیات سے نہیں ہے''۔(۵۴)

عبداللہ یوسف علی کے ہاں اسلام کو روزمرہ کے اعمال حکومت وسیاست سے علیحدہ رکھنے کا استدلال یہ تھا کہ سیاست اب اتنی بدنام سرگرمی ہو کر رہ گئی ہے کہ پاک صاف اور مذہبی لوگ اس میں شرکت سے گریز ہی کریں تو مناسب ہے ''دنیاوی طاقت وحکومت کا حصول خواہ اس کا مقصد اطاعت الٰہی ہی کیوں نہ ہو جب اس کے لیے کوشش کی جاتی ہے تو تھوڑی بہت نفسانیت آ ہی جاتی ہے''۔(۵۵) ''سیاست میں بے اصول حمایت اور جانب داری، وعدہ شکنی، بے وفائی اور اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا چلن عام ہے جس کی وجہ سے یہ گناہ اور شیطنت بن جاتی ہے۔''(۵۶) یہ تبصرہ ترجمہ وتفسیر کی اس قسط میں تھا جو جنوری ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی جب برکت علی سے ان کی

Marfat.com

آویزش تلخی کی حدوں کو چھو رہی تھی جو سیاسی اعتبار سے یونینسٹ گورنمنٹ کے مخالف تھے۔ اگرچہ عبداللہ یوسف علی سیاست میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور خود دو بار انتخابات میں امیدوار بھی رہے تھے، انتخابی مہم بھی چلائی تھی لیکن ان کا تجربہ کسی اعتبار سے بھی خوشگوار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے سیاست سے بدگمان ہو گئے۔

۱۹۰۶ء میں انہوں نے ''ہندوستان میں وہابیت'' پر تنقید کی، جس میں ان کا یہ انتباہ بھی شامل تھا کہ ''مذہب کی پرسکون اور سنجیدہ فضا کو جس میں امن و آزادی دونوں میسر ہوں سب سے زیادہ نقصان اور ضرر جس چیز سے پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے آلودہ اور گندی سیاست کے گردوغبار سے بے خیالی اور بے توجہی کے عالم میں متاثر ہونے دیا جائے۔''(۵۷)

مذہب اور سیاست کے بارے میں عبداللہ یوسف علی کا رویہ ۲۰/ویں صدی کے آغاز میں اس وقت تشکیل پذیر ہوا تھا جب ہندوستان کے بہت سے مسلمان سلطنت برطانیہ سے وفاداری کا دم بھرنے کے باوجود سیاست کو ہنگامہ آرائی اور برطانیہ مخالف جذبات سے عبارت گردانتے تھے۔

ان کے فکری تار و پود کا ایک اور عنصر ان کا یہ نقطۂ نظر تھا کہ مسلمانوں کو مذہبی اعتبار سے حاکم وقت کی اطاعت کرنی چاہیے۔ ان کی تفسیر بڑے محتاط انداز میں اس انداز نظر کو بیان کرتی ہے۔

''آخری حاکمیت صرف خدا کی ہے۔ خدا کے بندے اپنا اختیار خدا سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ اسلام دینی اور دنیاوی امور کے بارے میں کوئی واضح خط امتیاز قائم نہیں کرتا ہے اس لیے عام طور پر حکومتوں (اور حاکموں) سے یہ توقع قائم کرتا ہے کہ وہ راستی پر قائم رہیں گی اور صالح امام کی نیابت کے فرائض انجام دیں گی۔ ایسی صورت میں ہمیں حکام کی عزت بھی کرنی ضروری ہے اور ان کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو نظم و ضبط برقرار نہیں رہ سکتا۔ جبکہ

Marfat.com

درحقیقت اکثر ممالک میں قانون اور اخلاق اور دنیاوی اور مذہبی امور میں بڑا واضح خط تفریق پایا جاتا ہے۔ اس لیے اسلام ان غیر مذہبی حکام سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ راست بازی پر قائم رہتے ہوئے اختیارات اور طاقت کا استعمال کریں اور اگر یہ شرط پوری ہو جاتی ہے تو ایسے حکام کی اطاعت کو واجب قرار دیتا ہے''۔ (۵۸)

ہندوستان کے مسلمانوں کے بہت سے حلقوں میں یہ ایک معتبر اور طے شدہ نقطۂ نظر تھا اور اس کا سہارا پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں مسلمانوں کی برطانیا کے ساتھ وفاداری کو استوار رکھنے کے لیے اس وقت لیا گیا تھا جب برطانیا نے ترکی کے خلاف جنگ شروع کی تھی۔ عبداللہ یوسف علی کے سلطنت سے وفاداری کے جذبے نے برطانیا کی حکومت کو راستباز حکومت کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں ''برطانوی تہذیب مسلمانوں کے لیے ناقابل بیان قدروقیمت کا معروضی نمونہ فراہم کرتی ہے جس میں نہ صرف وحدت واتحاد ہے بلکہ استقامت کا عنصر بھی شامل ہے''۔ (۵۹) یہ ایک ایسا نقطۂ نظر تھا جس میں شریعت کے قیام کے لیے کسی بھی قسم کی سیاسی جدوجہد غیر متعلق قرار پاتی ہے۔ اور ایسے اسلامی ادارے جن کا تعلق حکومت وسیاست یا معاشرتی تنظیم وترتیب سے ہو معطل ہو جاتے ہیں، بالخصوص ''جہاد'' ایک نظری مسئلہ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ''جہاد کی سب سے بڑی شرط ہی یہ ہے کہ اس کا حکم اور اجازت ایسے امام برحق کی جانب سے ہو جس کا نمونہ ہمیں محمدؐ کی پاکیزگی میں نظر آتا ہے''۔ (۶۰)

اسلام کو سیاست کے میدان سے دور رکھنے کے لیے یوسف علی کے استدلال کا تیسرا جز ان کا ''معاشرتی ارتقاء'' پر مبنی ''نظریۂ تاریخ'' تھا۔ ارتقاء کا عمل ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ مغربی کلیسا نے آٹھویں صدی کے بعد سے لازماً نئے خطوط پر کام کیا ہے اور پروٹسٹنٹ فرقہ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کے وسیع تر اصولوں سے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ مستقبل میں مذاہب کیا

Marfat.com

شکل اور راستہ اختیار کرتے ہیں اور خداوند تعالیٰ اپنی تمام عظیم تر حکمت کے منصوبے کس طرح بروئے کار لاتا ہے ہم فانی انسانوں کو یہ نہیں بتایا گیا ہے۔(۶۱) ان کی رائے میں افکار ایک سوسائٹی نے دوسری سوسائٹی میں منتقل ہو کر پھیلتے ہیں اور ان کے جذب وانجذاب کا عمل جاری رہتا ہے۔ان کے ذہن میں اس عمل کا ایک وسیع وعریض نقشہ تھا جس میں ایک ثقافت دوسری ثقافت میں جذب ہوتی ہے۔ان کے خیال میں ''اگر یہ سلسلہ یوں جاری نہ رہے تو انسانی ارتقاء کا عمل ہمیشہ کے لیے ساکت ہو جائے۔''(۶۲)

اپنی کتاب ''اسلام کی مذہبی سیاست''، جس کا حوالہ تفسیر میں بھی آیا ہے، وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام کو کسی خاص قسم کے جامد رسم ورواج اور اداروں سے وابستہ کر دینا خواہ وہ اپنی اصل میں کتنے ہی دانشمندانہ اور حکمت سے پُر رہے ہوں اسلام کو انتہائی تنگ بندھنوں میں محدود کر دینے کے ہم معنی ہوگا۔(۶۳) یہاں اشارہ اس جانب ہے کہ اگر ''مسلمان اس موجودہ سماجی وسیاسی دائرہ میں تنفیذ اسلام پر اصرار کرتے ہیں تو گویا وہ تاریخ کے دھارے کے برعکس چلنے کی کوشش کریں گے۔ایک صالح ریاست، امام برحق کی طرح وہ آئیڈیل ہو سکتا ہے جس سے مسلمان اپنی روحانی قدروں کو وابستہ کر سکتے ہیں۔لیکن عملی مسائل کی حد تک ''رجحان غالب طے ہو چکا ہے اور تمام دائروں میں یہی اہمیت کا حامل ہے اور وہ یہ ہے کہ مغربی رویے ہی صحیح سمت کا تعین کرتے ہیں''۔(۶۴)

اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں اعلیٰ اسلامی اقدار اس قطع وبرید کے نتیجہ میں گم نہ ہو جائیں، یوسف علی نے یہ یقین دہانی کرائی ''بہت سے جدید ادارے منطقی طور پر انہی (اسلامی اقدار) کے زیر اثر تخلیق ہوئے ہیں گو وہ نئے نظر آتے ہیں''(۶۵) ان کی خود اعتمادی کی بنیاد ان کا یہ یقین تھا کہ بیسویں صدی میں دنیا بہت بدل چکی ہے جس کو اب سابقہ حالت پر واپس نہیں لے

Marfat.com

جایا جاسکتا۔اب مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ مغرب سے اپنے تعلق کو منقطع کر لیں ۔قرنِ اول کے مسلمانوں کی طرح کے خالص اسلام کی طرف واپسی کی کوشش کرنے والی اسلامی احیائی تحریکوں کا معاملہ بڑی خطرناک حد تک سادہ لوحی پر مبنی ہے۔

قرآنی منطق نے اگر ایک طرف ان کو اس بات کا قائل کر دیا تھا کہ روحانی اور مادی معاملات میں کوئی واضح خط امتیاز نہیں ہے تو دوسری طرف ان کے سیاسی عقائد ان کو دوسرے نقطۂ نظر کی جانب مائل کر رہے تھے۔وہ ساری زندگی ہی اس تضاد کے ساتھ گزارتے اور اپنے ذہن و ضمیر کو طرح طرح کے حیلوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں جیسے کہ وہ لکھتے ہیں ''اس (انسان) کا کام تو اس زمین پر انجام پاتا ہے مگر اس کا قلب آسمانی جنت کی جانب متوجہ رہتا ہے''(٦٦) مذہب انسان کی ذاتی، داخلی، باطنی اور ذہن و فکر کی دنیا پر حکومت کے لیے ہوتا ہے حکومت اور ریاست سے اس کا اتنا تعلق نہیں ہے۔دین و مذہب کے حوالہ سے جو اجتماعیت ان کے ذہن کو قابل قبول نظر آتی تھی وہ روحانی برادری کا تصور تھا۔

عبداللہ یوسف علی نے اسلام کو بہ حیثیت نظریہ اور آئیڈیولوجی یا جامع نظام حیات زبانی تعریف وتوصیف کی حد تک تو ضرور پیش کیا تھا لیکن عملاً یہ ضروری سمجھا کہ دین کو بالکل غیر سیاسی اسلوب اور انداز سے ہی پیش کیا جائے۔دلچسپ تضاد یہاں یہ نظر آتا ہے کہ ان کا ایسا عمل بذات خود سلطنت سے وفاداری کے نتیجہ میں ایک سیاسی رویہ تھا۔مذہب کو باطنی زندگی تک محدود کر دینے کے بعد وہ باہر کی دنیا میں دوسرے آقا تلاش کرنے کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں۔۱۹۳۶ء کے بعد سے وہ ورلڈ'' کانگریس آف فیتھس'' کے ایک بڑے بڑے فعال شریک کار بن گئے تھے۔ان کی یہ وابستگی جس خیال پر مبنی تھی اس کا اظہار تفسیر میں بھی ہوا ہے۔اور وہ یہ تھا کہ ایک ایسا نظم ہو جس میں مختلف صلاحیتوں کے لوگ ایک روحانی قسم کی دنیا میں یکجا ہوں اور اپنے ذاتی تزکیہ وتربیت کے ساتھ خدا کی عبادت اور بندگی بھی کر کے

Marfat.com

دکھائیں۔ (۶۷) دوسری جنگ عظیم نے ان سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ جنگ نے اس سلطنت کو بھی فنا کر دیا اور اس طرح یوسف علی نے جو اپنا عالمی منظر نامہ تشکیل دیا تھا اس کا ڈراپ سین ہو گیا۔

حواشی باب ۹

۱- ''دی ہولی قرآن'' متن و ترجمہ اور تفسیر، تیسرا ایڈیشن (۱۹۳۸)۔ اس میں ۶۳۱۰ تفسیری حاشیے ہیں اور چودہ ضمیمے شامل ہیں۔ اس باب میں سارے حوالے اسی ایڈیشن سے ماخوذ ہیں۔ قارئین کے لیے یہ بات اہم اور نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ دوسرے ایڈیشن مثلاً امانا کارپوریشن/آئی آئی ٹی کا مطبوعہ (۱۹۹۲-۱۹۸۹) نسخہ یا پھر ''کنگ فہد دی ہولی قرآن پرنٹنگ کمپلکس'' (۱۹۹۰) کے نسخے میں یوسف علی کی اصل تحریر میں خاصی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو مندرجہ ذیل نوٹ نمبر (۲۷)۔

۲- ''دی ہولی قران'' ایضاً پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں مندرجہ ذیل حوالہ ملتا ہے جس کی کیفیت ان کی اپنی سرگزشت والی ہے ''ایک انسان کی زندگی داخلی طوفانوں کی زد میں آئی ہے جو باہر کی طبعی دنیا کے طوفانوں سے زیادہ تباہ کن ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک طوفان سے میں بھی گزرا ہوں جس کے سبب ذاتی نوعیت کا، شدید اور تلخ ترین غم و اندوہ برداشت کرنا پڑا تھا اور میرے قوائے ذہنی معطل ہو کر رہ گئے تھے اور زندگی مجھے بالکل بے معنی محسوس ہونے لگی تھی کہ اچانک امید کی ایک نئی روشنی نظر آ گئی۔ جو دراصل نتیجہ تھا اس کام میں باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ منہمک ہو جانے کا جس کا میں عرصہ دراز سے متمنی تھا''

۳- ایضاً حاشیہ نمبر ۳۱۰۷

۴- ایضاً حاشیہ نمبر ۵۴۹۶

۵- ملاحظہ ہو یوسف علی کی وصیت

Marfat.com

۶- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ نمبر ۲۱۸۰

۷- ایضاً حاشیہ ۱۴۱۲

۸- ایضاً حاشیہ ۴۹۲ لانگ فیلو کا حوالہ۔ حاشیہ نمبر ۲۹۵۰، ۳۶۴۰ اور ۴۰۷۱ میں بھی ملتا ہے یوسف علی نے مشہور مورخ کے کے عزیز کے والد مسٹر عزیز، جو لاہور میں وکالت کرتے تھے، کے نام اپنے خط میں کہا تھا کہ لانگ فیلو، انگریزی زبان کا انتہائی قادر الکلام شاعر ہے (یہ بات مصنف اور ڈاکٹر کے کے عزیز کی ذاتی خط و کتابت میں موجود ہے)

۹- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ نمبر ۱۷۱۱

۱۰- ایضاً

۱۱- ایضاً حاشیہ نمبر ۴۷۷

۱۲- ''یونانی ثقافت اور جدید دنیا'' مطبوعہ مجلہ ریلیجنز (Religions) بابت جنوری ۱۹۴۱ء

۱۳- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً ضمیمہ نمبر VII ''ذوالقرنین کون تھا''؟

۱۴- ایضاً حاشیہ نمبر ۳۴۷

۱۵- ایضاً حاشیہ نمبر ۹۹۶

۱۶- ایضاً ضمیمہ ششم افلاطون کے بارے میں ایک اور حوالے کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ ۱۵۸۴

۱۷- ایضاً حاشیہ نمبر ۲۴۰۸

۱۸- ایضاً حاشیہ نمبر ۵۶۲۲

Marfat.com

۱۹- ایضاً حاشیہ نمبر ۱۸۲۷

۲۰- ''پانی'' کے بارے میں حوالے کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۱۰۷ ''روشنی'' کے علامتی معنی کے حوالے کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر VIII (آیۃ نور کی صوفیانہ تفسیر) نیز حاشیہ نمبر ۲۹۹۷ اور ۳۰۰۱

۲۱- ''حروف مقطعات'' کے بارے میں حوالے کے لیے دیکھیے ''دی ہولی قرآن'' ایضاً ضمیمہ نمبر ا دسویں سورت (سورہ یونس) کا تعارف اور حاشیہ نمبر ۲۴۵۵

۲۲- ایضاً حاشیہ نمبر ۳۲۳۵

۲۳- ایضاً حاشیہ نمبر ۳۹۹۳

۲۴- ایضاً حاشیہ نمبر ۳۵۷۴

۲۵- ایضاً حاشیہ نمبر ۲۹۵۰

۲۶- ایضاً حاشیہ نمبر ۳۸۵۷

۲۷- ایضاً حاشیہ نمبر ۳۹۱۳، حاشیہ نمبر ۵۳۴۹، یوسف علی کے تصوف کی جانب میلان کی شہادت کا زیادہ تر حصہ تفسیر کے ان دونوں ایڈیشنوں سے نکال دیا گیا ہے جو آمانا/آئی آئی ٹی اور افتاء/کنگ فہد ہولی قرآن پرنٹنگ کمپلیکس سے شائع ہوئے ہیں۔ کوئی بھی ایسا فقرہ جس میں لفظ صوفی (Mystic) آیا ہو یا قران کی کسی آیت کے ایسے معانی کی طرف اشارہ ہو جو عمیق تر سطح پر صرف منتخب افراد کی سمجھ میں آتے ہوں تو اس کو بھی نکال دیا گیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہوں ۱۱:۵۸ کے تحت تفسیری حاشیے جن کے نمبر ہیں ۵۵۲۶، ۴۵۶۰، ۳۹۴۳، ۳۲۲۶، ۵۷۹۵، ۵۷۹۳، ۵۷۷۸۔ اس کے علاوہ تین ضمیمے حذف کر دیے گئے ہیں: قصہ یوسف (علیہ السلام) کی علامتی تعبیر، آیۃ

Marfat.com

نور کی تصوف آمیز تفسیر، اور مسلمان جنت۔ افتاء/ ملک فہد والے ایڈیشن کے مرتبین نے عبداللہ یوسف علی کے استعمال شدہ لفظ ''پراسرار حقائق'' کو بھی حذف کر دیا ہے مثلاً ۱۴: ۶۷ اور تفسیری حاشیہ نمبر ۵۷۴۹ بھی محذوف ہے۔

۲۸- عبداللہ یوسف علی کا خیال تھا کہ یونیورسٹی کی تعلیم صرف منتخب لوگوں کے لیے ہونی چاہیے۔ انہوں نے کہا تھا ''یونیورسٹیاں صرف ان چند منتخب لوگوں کے لیے ہوتی ہیں جو آزادانہ سوچنے اور عقلی بنیادوں پر عمل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں'': ملاحظہ ہو یوسف علی کی تقریر بعنوان ''بدلتی ہوئی دنیا میں یونیورسٹی کا تصور''۔ یہ تقریر ایف سی کالج لاہور میں ۷ ستمبر ۱۹۳۶ء کو ویک اینڈ کانفرنس میں کی گئی تھی۔ (کارروائی کے بارے میں ٹائپ شدہ نوٹ۔ یوسف علی کی متفرقات پر مشتمل نوٹ بک YA 25)

وہ وسیع پیمانے پر سیاسی گرمیوں میں عوام کی شرکت کے بارے میں پراعتماد نہیں تھے اور ان کی اس نوعیت کی بے اعتمادی کا اظہار کئی مواقع پر ہوا تھا۔ اپنی تحریر جو ''اسلام میں مذہبی سیاست'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی میں وہ کہتے ہیں ''موجودہ خالص جمہوریتوں میں ہر چیز کو حق رائے دہی برائے بالغاں کے ذریعے اتفاقیہ نتائج پر چھوڑ دیا گیا ہے جس کے ممکنہ خطرات بہت سے ہوتے ہیں''۔ صفحہ ۱۸ ۱۹۴۰ میں لکھے گئے ان کے مضمون بعنوان ''مسلم ثقافت اور مذہبی فکر'' میں بھی حق رائے دہی برائے بالغاں کی بنیاد پر ووٹنگ کے ذریعہ لیڈر شپ کے انتخاب کے بارے میں انہوں نے اپنے گہرے شکوک کا اظہار کیا ہے۔

۲۹- دی ''ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ نوٹ نمبر ۵۰۵۸

۳۰- ۱۹۳۶-۳۷ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی (آنرز) کی کلاس کے ۷۰ فیصد

Marfat.com

طلبہ پاس ہوئے تھے۔ ان کے ایک طالب علم نے پورے صوبہ میں دوسری پوزیشن بھی لی تھی ''ایسٹرن ٹائمز'' ۱۴ دسمبر ۱۹۳۶ (YA 166)

۳۱- ''دی ہولی قران'' کے بعض حوالے مندرجہ ذیل ہیں:

بنین (Bunyan) ۱۵۸۱، برنس (Burns) ضمیمہ VI اور حاشیہ ۱۸۱، کارلائل حاشیہ ۱۰۰۸ کولرج (Coleridge) حاشیہ ۴۵۷۲ اور ۵۴۹۸، ڈکنس (Dickens) حاشیہ ۸۶۲، کپلنگ (Kipling) حاشیہ ۱۶۹۴، ملٹن (Milton) حواشی نمبر ۱۳۴۳، ۱۸۸۱، ۴۰۳۵، ۴۲۰۳ اور ۴۴۴۰ شیکسپئر کا حوالہ سب سے زیادہ آیا ہے: ملاحظہ ہوں حاشیے جن کے نمبر یہ ہیں ۴۷، ۲۸۴، ۴۳۹، ۱۳۰۸، ۱۶۶۲، ۱۶۶۳، ۳۳۵۴، ۳۸۶۶، ۳۹۸۷، ۵۲۰۲، ۵۹۱۹، ۶۲۶۲،

(Shelley) حاشیہ نمبر ۱۴۲۵ اور ۳۱۹۶ اسپنسر حاشیہ نمبر ۳۲۷۱، ٹینی سن (Tennyson) حاشیہ نمبر ۴۵۶، ۱۰۲۱، ۲۴۸۱، ورڈز ورتھ (Wordsworth) حاشیہ نمبر ۶۸، ۲۹۸، ۴۸۶۵، وولف (Wolfe) حاشیہ نمبر ۱۹۰۸ء

۳۲- ایضاً حاشیہ نمبر ۱۰۰۸

۳۳- یہ قصہ ''یاران مکتب'' سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۱

۳۴- دی ''ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ نمبر ۳۶۰۴

۳۵- ایضاً حاشیہ نمبر ۳۷۷۵

۳۶- ایضاً حاشیہ نمبر ۳۰۳۶

۳۷- ایضاً حاشیہ نمبر ۱۳۵۸

۳۸- یوسف علی کا صدارتی خطبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ یونیورسٹی سیکشن مطبوعہ''

Marfat.com

ایسٹرن ٹائمز" ۶-۷ اپریل ۱۹۳۷ (YA 201)

۳۹- "دی ہولی قرآن" ایضاً قرآن پاک کے تراجم

۴۰- ایضاً۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

۴۱- "دی ہولی قرآن" ایضاً حاشیہ نمبر ۱۷۷

۴۲- ایضاً حاشیہ ۶۷۵

۴۳- سید سلیمان ندوی کے اقتباس کا بقیہ حصہ یوں ہے "یہ دیکھ کر بڑا اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ علامہ نے آیات کی گمراہ کن تشکیل وترتیب اور معنی آفرینی سے مکمل اجتناب برتا ہے اور معجزات وغیرہ کو ذہنی ورزش کے ذریعہ بازیچۂ اطفال بنانے کی حرکت نہیں کی۔ معانی ومفہوم کو سمجھنے کے لیے انہوں نے اہل عرب پر اعتماد کیا ہے۔ طباعت بھی اعلیٰ ہے اور کتاب کے ظاہری اور صوری حسن کو لندن کی طباعت واشاعت کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے"۔ اس تبصرہ کے الفاظ کو یوسف علی کے ترجمہ وتفسیر کی پانچویں قسط میں اندرونی کور پر طبع کیا گیا ہے جو جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

۴۴- ملاحظہ ہو "دی لائیٹ" لاہور ۱۴/ دسمبر ۱۹۳۶ء جس میں عبداللہ یوسف علی کے خلاف درانی نام کے کسی شخص کی زہر افشانی اور تلخ وبے رحم لعن طعن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو پانچویں باب میں گزرا ہوا نوٹ نمبر ۵۶۔ عبداللہ یوسف علی کے ایک مداح نے لکھا ہے کہ انہوں نے شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ پر بھی انحصار کیا ہے۔ "اسلامک کلچر" حیدر آباد جلد XXVIII شمارہ نمبر ۱، جنوری ۱۹۵۴

۴۵- پروفیسر حمید اللہ نے یوسف علی سے اپنی ایک ملاقات کا تذکرہ حافظہ کی مدد سے کیا ہے جو ۱۹۳۵ کے اوائل میں فرانس سے بمبئی جاتے ہوئے جہاز پر ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں

Marfat.com

''انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ قرآن پاک کا ترجمہ کر رہے ہیں اور انہوں نے مجھ سے بعض نکات پر گفتگو بھی کی تھی جواب میرے ذہن میں نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ حجاج بن یوسف کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اتفاق سے مراقش کے لوگوں کا ایک گروپ بھی جہاز میں سفر کر رہا تھا جو غالباً عازمین حج تھے۔ مجھے ان کے مترجم کے فرائض ادا کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مرحوم یوسف علی نے مجھے بتایا کہ وہ عربی سمجھتے تو خوب ہیں لیکن گفتگو کے دوران عربی میں جواب دینا ان کے لیے دشوار ہے۔ پروفیسر حمید اللہ صاحب کا خط مصنف کے نام مارچ ۱۹۸۸ء

حجاج بن یوسف (متوفی ۷۱۴ء) کا حوالہ بڑا بے محل لگتا ہے۔ حجاج مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ظالم و جابر لیکن لائق و فائق اموی گورنر کے طور پر معروف ہے جس نے خارجیوں کے خلاف بڑی کامیاب مہم جوئی کی تھی۔

۴۶- ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے گولڈن جوبلی سیشن کے دوران یونیورسٹی سیکشن میں خطبۂ صدارت مارچ ۱۹۳۷

۴۷- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ ۲۶۹۰۔ سائنسی کتب کے حوالہ کے لیے دیکھیے حاشیہ ۳۰۲۱

۴۸- ایضاً ملاحظہ ہو قرآن کی تفاسیر کے بارے میں نوٹ

۴۹- ایضاً

۵۰- ملاحظہ ہو'' اسلام اور جدید سائنسی نقطہ ہائے نظر یا رویے'' دی اسلامک کوارٹرلی'' جلد XXIII شمارہ ۳ (۱۹۷۹)

۵۱- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ نمبر ۵۸۰

Marfat.com

۵۲- ایضاً حاشیہ ۴۹۲۷

۵۳- ملاحظہ ہو ''انڈین محمڈنز'' کے عنوان سے خطبہ جو رائل سوسائٹی آف لٹریچر میں دسمبر ۱۹۰۶ میں دیا گیا۔

۵۴- ''ریلیجیس پولٹی آف اسلام -- اسلام کی مذہبی سیاست'' مطبوعہ ۱۹۳۳

۵۵- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ ۴۱۹۰

۵۶- ایضاً حاشیہ ۳۴۴۵

۵۷- ملاحظہ ہو ''انڈین محمڈنز''

۵۸- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ ۵۸۰

۵۹- حوالہ فائل نمبر IOL:L/1/1268 یہ اس تقریر کا مکمل متن ہے جو عبداللہ یوسف علی نے دوسری عالمی جنگ کے سلسلہ میں وزارت اطلاعات کی ہدایت پر کی تھی۔ اس کا عنوان تھا ''برطانوی جمہوریت ایک مسلمان کی نگاہ میں''

۶۰- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ نمبر ۲۰۵ تفسیر میں جہاں بھی ''جہاد'' یا ''قتال'' کا ذکر آیا ہے وہاں امام برحق کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو ایسی جہادی کارروائی کی اجازت دے سکتا ہے ملاحظہ ہو حواشی ۲۰۵، ۲۳۶، ۱۲۰۹، ۱۲۳۴، ۱۳۲۰، ۱۳۷۳۔

۶۱- ایضاً ضمیمہ نمبر V؛ ''مصری مذہب اور اسلام کی جانب اس کی پیشرفت''

۶۲- ''ملاحظہ ہو'' اے کلچرل ہسٹری آف انڈیا ڈیورنگ دی برٹش پیریڈ- برطانوی عہد حکومت میں ہندوستان کی ثقافتی تاریخ'' مطبوعہ ۱۹۳۱ صفحہ ۱۷۹

۶۳- ''دی ہولی قرآن'' ایضاً حاشیہ نمبر ۴۵۷۹، میں ان کی تحریر بعنوان ریلیجیس پولٹی آف اسلام- اسلام کی مذہبی سیاست'' کا حوالہ ہے۔

Marfat.com

۶۴۔ ''مسلم کلچر اینڈ ریلیجس تھاٹ'' عبداللہ یوسف علی نے یہ مضمون ایل ایل ایس اومیلی کی مرتب کردہ کتاب ''ماڈرن انڈیا اینڈ دی ویسٹ'' کے لیے لکھا تھا جو ۱۹۴۱ میں شائع ہوئی تھی۔

۶۵۔ ''ریلیجس پولٹی آف اسلام'' مطبوعہ ۱۹۳۳ء

۶۶۔ ''دی ہولی قرآن'' حاشیہ نمبر ۵۷۵۹

۶۷۔ ایضاً۔حاشیہ ۳۱۱۴

باب دہم

اختتامیہ

ہندوستان کے صوبہ یو۔ پی میں تقریباً ۱۸۹۷ یا اوائل ۱۸۹۸ میں ایک عبوری لمحہ آیا تھا جب ایک بزرگ ہستی کی جس نے مسلمانوں کو اعلیٰ انگریزی تعلیم کی جانب متوجہ کرنے میں رہنمائی کی تھی، ایک ایسے نوجوان سے ملاقات ہوئی جو تھا تو آئی سی ایس افسر لیکن اس کی دلچسپی کا مرکز تعلیم کا شعبہ تھا۔ اس ملاقات میں سر سید احمد خان اپنی زبردست سفید داڑھی والی شخصیت کے ساتھ ایک طرف اور دوسری جانب عبداللہ یوسف علی تھے جو انتہائی خوبصورت ایڈورڈین وضع کا ولائتی سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ یہ تبدیلی صرف وضع قطع اور اسلوب کی نہیں تھی بلکہ داخلی حقیقت اور معانی و مفہوم کی بھی تھی۔ وہ نسل جس نے برطانوی نوآبادیاتی نظام کی مادی قوت و سطوت کا مظاہرہ ۱۸۵۷ کی بغاوت کے بعد دیکھا تھا اب قریب الاختتام تھی اور ایک دوسری نسل اس کی جگہ لے رہی تھی جسے اب فکری، ذہنی اور ثقافتی حملہ سے نبرد آزما ہونا تھا یا مصالحت کرنی تھی اور معاملات طے کرنے تھے۔ سر سید اور ان کے ساتھیوں نے سلطنت سے وفاداری کے اظہار کا فیصلہ کیا تھا جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر تھا۔ جب کہ عبداللہ یوسف علی اور ان کی طرح سوچنے والوں نے برطانوی بالادستی اور برتری کو اس لیے قبول کیا کہ وہ دلی اور ذہنی طور پر اس کے قائل ہو چکے تھے۔ لیکن بہر صورت عبداللہ یوسف علی انتہائی باصلاحیت اور فاضل شخص تھے، اسلام سے مخلص تھے اور ان کے دل میں عوام کی خدمت کا جذبہ بھی موجزن تھا اور یہ وہی خصوصیات تھیں جو سر سید اپنی اگلی نسل میں دیکھنے کے خواہش مند تھے اور جس مقصد کے لیے انہوں نے علی گڑھ کالج قائم کیا تھا۔

Marfat.com

اپنے خاندانی پس منظر اور پرورش و پرداخت کے حوالے سے عبداللہ یوسف علی اپنے بہت سے معروف ہم عصروں سے مختلف نہیں تھے۔ ان کی بیشتر ابتدائی تعلیم مشنری اسکولوں میں ہوئی تھی۔ لیکن ایسا ہی تجربہ جناح، اقبال اور جوہر کا بھی رہا تھا۔ انہی کی مانند وہ بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے تھے۔ لیکن عبداللہ یوسف علی پر جیسی ''برطانویت'' طاری ہوئی وہ غیر معمولی قسم کی تھی۔ کسی ہندوستانی مسلمان نوجوان کے لیے 'یہ بڑی ہی نادر' بات تھی کہ وہ کسی انگریز خاتون سے انگلستان کے کلیسا کی رسومات کے مطابق شادی کرے۔ اور اس سے بھی زیادہ خلاف عادت بات یہ تھی کہ وہ برطانوی شاہی خاندان کی تعظیم بجا لائے۔ ایسا کیوں ہوا کہ عبداللہ یوسف علی کی 'برطانویت' سطحی رہنے کے بجائے ان کے وجود کی گہرائیوں تک پہنچ گئی؟۔ اس سوال کا جزوی جواب تو ان کے اس بیان میں ہی مل جاتا ہے کہ ''انسانی عنصر کو فراموش نہ کرو اور نہ اس کی قدر و قیمت کو کم کرو''۔ اس سوال کے جواب کا کچھ حصہ یہ ہے کہ ان کے والد برطانیا کی حکومت کے سچے وفادار تھے۔ اور کلکلو سورت، سر چارلس للّی کے ان کے خاندان سے بڑے مربیانہ مراسم تھے۔ جب وہ اسکول میں تھے یا یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو یوسف کی دوستی بہت ممتاز قسم کے برطانوی مربیوں سے ہوئی جن کی شخصیات نہایت متاثر کرنے والی تھیں۔ وہ ان کی محبت اور شفقت کے لیے ممنون احسان تھے اور اس کے صلہ میں انہوں نے ایک دائمی اعتماد کا ہدیہ پیش کیا تھا جس کی نوعیت جذباتی تعلق کی بھی تھی۔ کچھ دوسرے عوامل بھی اس اینگلو سیکسن محبت کے بندھن میں معاون رہے ہوں گے۔ مثلاً شاید یہ بھی کہ وہ اپنے بچوں کو دکھانا چاہتے ہوں کہ وہ علاقہ کے کسی بھی دوسرے شخص کی طرح سچے اور وفادار محبّ وطن ہیں۔

ایک بار عبداللہ یوسف علی نے لندن کی رائل سوسائٹی آف آرٹس میں اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے اپنی زندگی کے چار بنیادی اصولوں کا ذکر اس طرح کیا: ''شاہ برطانیا سے مکمل اور پائیدار وفاداری، حب الوطنی، پڑوسیوں سے دوستی کا تعلق اور ان سب کا مجموعہ اپنے آپ سے

Marfat.com

کامل سچائی''(۱)

ان کا یہ بیان بڑے محتاط انداز میں افراد کی مدنی زندگی کی بنیادیں ذمہ دارانہ حب الوطنی اور سلطنت سے وفاداری پر استوار کرتا ہے۔ اجلاس کی صدارت ایک سابق وائسرائے فرما رہے تھے جنھوں نے بعد میں یہ اضافہ کیا ''ہندوستان کے محمڈنز ان سارے اصولوں پر پورے اترتے ہیں سوائے ایک آخری بات کے''۔ عبداللہ یوسف علی نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ یہ اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے کہ ان کی جگہ اگر جناح یا جوہر ہوتے تو اس قسم کے ناقابل برداشت کبر و نخوت کے اظہار پر ان کا ردعمل کیا ہوتا؟

عبداللہ یوسف علی نے ساری زندگی ایک ایسی ذہنی کشمکش کی کیفیت میں گزاری جس میں ایک طرف انہوں نے برطانوی برتری کو تسلیم کر رکھا تھا تو دوسری طرف وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کوئی ایسی راہ عمل بھی تلاش کرتے رہے جس کے ذریعے ان کی عزت نفس بحال ہو سکے۔ یہ سب کچھ کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان کی شخصیت اور قد و قامت کو کم کر کے پیش کیا جائے بلکہ مدعا یہ ہے کہ ان حالات کو سمجھا جا سکے جن سے ان کو زندگی میں سابقہ رہا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کی برطانیا آمد ایک سو سال پہلے کی بات ہے لیکن آج بھی مسلمان مغرب کے بارے میں اپنے ربط و تعلق کے حوالے سے بیک وقت اسی طرح کے دوہرے جذبات رکھتے ہیں جس میں دوری بھی ہے اور قرب بھی، نفرت بھی اور کشش بھی۔ عبداللہ یوسف علی ایک برطانوی مسلمان کا نقش اول تھے جو اپنے تفسیری کارنامے کے ذریعے اس تجربے سے ایک عظیم اور قیمتی ورثہ بچا کر محفوظ کر لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

عبداللہ یوسف علی بڑی اعلیٰ ذہانت اور غیر معمولی مشقت کی صلاحیت کے مالک تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگی کو بے جا اعتماد کے نتیجہ میں ایک دردناک کہانی بنالیا۔ وہ لوگ جن

Marfat.com

کو وہ آئی سی ایس میں اپنا دوست سمجھتے تھے ان کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے اور ایک مقامی ہندوستانی کو اس کا مقام دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ وہ اس وقت خوش ہوئے تھے جب عبداللہ یوسف علی نے ملازمت چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے اس سربین قوم پرستی کی مدد ایک ایسے وقت میں کی جب یہ تحریک عثمانی خلافت کی دنیا کو منتشر کرنے کے لیے ایک ابتدائی سازشی کارروائی تھی۔ اس سلطنت نے جس پر اُن کو اس لیے بھروسا تھا کہ وہ ہندوستان کی قربانیوں کے نتیجہ میں اس کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرے گی ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کا عمل جنگ عظیم کے بہانے روک دیا۔

لیگ آف نیشنز کو جن شرائط پر انتداب ملا تھا اس کی بھی لاج نہیں رکھی گئی۔ عبداللہ یوسف علی ایک ایسے مسلم دانشور تھے جن کی بات میں وقعت ہوتی تھی اور یہی سبب ہے کہ ان کو برطانیہ کے کارپردازان حکومت نے اپنا شریک کار بنالیا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک ایسے ذہین طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جن کے نزدیک یہ انتہائی ضروری تھا کہ وہ انگریزوں کی نگاہ میں اچھے سمجھے جائیں۔ اس طبقہ کے مسلمانوں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ہر موقع پر پیچھے ہٹ جاتے تھے تاکہ ان کی معقولیت اور غیر متنازعہ حیثیت پر حرف نہ آئے، لیکن نتیجہ میں ان کو حاصل کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ غلط اعتماد کر لینے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مسلمانوں کے مفادات خطرہ میں نظر آتے تھے تو بھی وہ کسی ہنرمندی اور ہوشیاری سے سیاسی ردعمل کا اظہار نہیں کر پاتے تھے۔

اس کے مقابلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ روفس آئزکس اور ہربرٹ سموئیل نے بھی سلطنت برطانیہ کی خدمت اور ملازمت کی لیکن کبھی حالات میں کسی قسم کی تبدیلی کا موقع پیش آیا تو انہوں نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ اطمینان ضرور کر لیا کہ ان کے ہم مذہبوں کے مفادات کو کوئی گزند نہ پہنچے، اگرچہ انہوں نے کانگریس آف فیتھس جیسی مثالیت پسندانہ کاوشوں سے تعاون بھی جاری

Marfat.com

رکھا۔ جب عبداللہ یوسف علی نے اپنا قرآن پر علمی کام مکمل کرلیا تب بھی انہیں وہ قلبی و ذہنی سکون میسر نہ آسکا جس کی انہیں توقع ہوسکتی تھی۔ وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح ایک بے چین اور مضطرب روح کے ساتھ کبھی عالم مایوسی اور خود رفتگی کا شکار ہوجاتے اور شکوک وشبہات ان کو گھیر لیتے۔ ان کی دوسری شادی بھی بحران کی تلخیوں میں الجھ گئی تھی۔ ان خانگی المیوں میں سلطنت برطانیا کی عظیم تر ناکامی کا عکس بھی نظر آتا تھا جو عدل وانصاف پر مبنی نظام تشکیل دینے میں اسے ہوئی تھی۔ لیکن آخر لمحہ تک وہ شاہ برطانیا اور مادر وطن سے مخلص رہے۔ خواہ اسے کتنا ہی افسوسناک سمجھا جائے مگر بہر حال یہ جذبہ ان کے وجود میں شامل ہو چکا تھا۔

عبداللہ یوسف علی اور ان کے عظیم ہم عصر محمد اقبال کے نقطہ ہائے نظر میں جو اختلاف تھا وہ دو مختلف قسم کی مسلم شخصیتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ عبداللہ یوسف علی نے ایک ایسی دنیا کا منظر نامہ قبول کرلیا تھا جس میں برطانیا اور مغرب غالب قوت کی حیثیت سے تخت حکومت پر براجمان دکھائی دیتے تھے۔ دوسری طرف اقبال کو اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ مغرب مسلمانوں کو منتشر کرکے ان کا استحصال کرنا چاہتا ہے۔ مشرق اور مغرب میں مفاہمت کی تلاش عبداللہ یوسف علی کے لیے سب سے اہم مسئلہ تھا حالانکہ ان کی یہ کوشش ایک طرح سے ذاتی سطح پر بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکی تھی اور ان کا تجربہ ناکام اور ناخوشگوار رہا تھا۔ اقبال اس سے بالکل مختلف سوچ رکھتے تھے اور اس طرح کی کسی مفاہمت میں انہیں قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ عبداللہ یوسف علی کا تو یہ بھی خیال تھا کہ اقبال کو تو مغرب کی روحانی اور اخلاقی کمزوریوں کو تلاش کرنے کا ہوکا ہو گیا ہے۔ (۲) فکر ونظر کی یہ خلیج دونوں کے اس نقطۂ نظر کے اختلاف میں بڑی واضح نظر آتی ہے جو لیگ آف نیشنز کے بارے میں تھا۔ عبداللہ یوسف علی کے نزدیک یہ ایک جائز عالمی تنظیم تھی اور اقبال کے خیال میں یہ کفن چوروں کی جمعیت تھی۔ عبداللہ یوسف علی کا غیر سیاسی اسلام کا نظریہ ان کے ایک ہندوستانی قوم کے آدرش کو قبول کرنے میں مانع نہیں تھا۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے آتے آتے وہ ہندوستان اور پاکستان میں سے کہیں بھی

سکونت پذیر ہونے کے قابل نہیں تھے۔لیکن انہوں نے ہندوستانی قومیت کا تصور اس وقت منظور کرلیا تھا جب کہ سارے اشارے یہ انتباہ کرر ہے تھے کہ ہندوراج کی مقدس گاڑی مسلمانوں کو اپنے بھاری پہیوں کے نیچے کچل کرفنا کر دینا چاہتی ہے۔لیکن اقبال کا 'سیاسی اسلام' ایسا تھا جس نے انہیں شروع ہی سے اس حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا کہ ایک ہمہ گیر قسم کی ہندوستانی قومیت ایک کھوکھلا تصور ہے۔

جب پاکستان وجود پذیر ہوا تو بہت سے پر عزم نوجوان بیوروکریٹس نے عبداللہ یوسف علی کی طرح یورپی انداز واطوار اختیار کرنے کی اس طرح کوشش کی کہ اسلام سے بھی تعلق برقرار رہے۔ لیکن یہ اقبال کا فکری ورثہ تھا جسے مودودی جیسے رہنماؤں نے آگے منتقل کیا اور اسلام کو بحیثیت طریق حیات اور آئیڈیالوجی مضبوطی سے برقرار رکھا۔عبداللہ یوسف علی کے ہاں مذہب زیادہ سے زیادہ ذاتی زندگی کی پاکیزگی قرار پاتا ہے۔لیکن اقبال کے ہاں مذہبی عقیدہ کا منطقی نتیجہ یہ تو ہے ہی لیکن اس سے بڑھ کر بھی کچھ اور باتوں کا متقاضی ہے۔اور وہ ہے مسلمان مرد یا عورت کا ایک فعال شخصیت ہونا، جس میں سعی و جہد بھی شامل ہے۔عبداللہ یوسف علی نے ایک بار لکھا تھا'' اگر چہ اقبال کی ادبی عبقریت اور ان کی اسلام کی فلسفیانہ تعبیر وتشریح نے ان کو بہت مقبولیت عطا کی ہے لیکن ان کی ذات ابھی تنہا اور سب سے علیحدہ ہی ہے۔عوامی زندگی میں اور ان کے اپنے الفاظ میں ایک نیا شوالہ کی تعمیر کے سلسلے میں ان کے اثرات غیر اہم ہیں''۔ (۳)

خوش قسمتی سے ان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی لیکن دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں جو خلیج حائل رہی وہ واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود اقبال اور عبداللہ یوسف علی کے بہت سے مقاصد مشترک تھے اور دونوں نے مل کر آنے والی مسلمان نسلوں کے لیے بہت کام کیا۔

اسلامیہ کالج لاہور اس حقیقت کی زندہ مثال ہے۔دونوں مسلمانوں کے معیار تعلیم

میں اضافہ کے لیے کس قدر خواہشمند تھے۔ مسلمانوں کے مفاد میں یہ بات قطعاً نہیں ہوسکتی کہ عبداللہ یوسف علی یا اقبال کو بالکل علیحدہ علیحدہ منفرد شخصیات کا درجہ دے دیا جائے۔ ٹھیک اس طرح جیسے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو ایک ایسے دین کی حیثیت سے اس طرح یکجا کر کے سمجھا جائے جس میں وہ دکھی انسانیت کے لیے روحانی مرہم بھی ہو اور ہمہ گیر جامع نظریۂ حیات اور طریق زندگی بھی۔ اس طرح کے عظیم افراد کو متبرک طلسماتی شخصیات سمجھ کر حسب ضرورت استعمال کے لیے نہ چھوڑ دیا جانا چاہیے بلکہ مطلوب یہ ہو کہ ان کے کام، جدوجہد، اور فکری کارناموں اور امنگوں کا صحیح ادراک کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے۔

عبداللہ یوسف علی کی زندگی کا بڑی توقعات اور امیدوں سے آغاز ہوا تھا۔ ان کی زندگی کا سفر کبھی انہیں تاریکیوں کے لمحات میں پہنچا گیا اور کبھی کامرانیوں اور عظمتوں کی بلندیوں پر لے گیا۔ لیکن اس سفر کا خاتمہ ایک المیے پر ہوا۔ ایک طرح سے یہ بالکل ویسا تھا جیسی کہ برطانوی ہند کی تاریخ۔

حواشی باب ۱۰

۱- یہ اور اس سے اگلا اقتباس عبداللہ یوسف علی کی اس تقریر سے ہے جو دسمبر ۱۹۰۶ میں انہوں نے رائل سوسائٹی آف آرٹس لندن میں کی تھی۔ عنوان تھا ''ہندوستانی مسلمان۔ ماضی حال اور مستقبل'' جرنل آف دی رائل سوسائٹی آف آرٹس نمبر ۲۸۲۴ جلد LV ۴ جنوری ۱۹۰۷ء

۲- عبداللہ یوسف علی کا مضمون بعنوان ''اقبال کی شاعری میں انسانی شخصیت کا تصور'' یہ مضمون ۹ نومبر ۱۹۳۸ کو رائل سوسائٹی آف لٹریچر میں پڑھا گیا اور ''ٹرانز یکشنز آف دی رائل سوسائٹی آف لٹریچر'' میں شائع ہوا: نیو سیریز جلد XVIII ۔اس خطبہ میں عبداللہ یوسف علی نے یہ نشان دہی کی تھی کہ اقبال کو سپنگلر کی ''زوال مغرب'' جیسی کتابیں بہت پسند آئی تھیں۔

۳- ''مسلم کلچر اینڈ ریلیجس تھاٹ'' عبداللہ یوسف علی کا مضمون جو ایل ایس ایس میلی کی مرتب کردہ کتاب ''ماڈرن انڈیا اینڈ دی ویسٹ'' مطبوعہ ۱۹۴۱ میں شامل ہے۔

Marfat.com

دستاویزات اور تصاویر

۳۶۷ آئی سی ایس کے امتحان کے نتائج کا عکس

۳۶۸ شادی کے رجسٹریشن کی سند

۳۶۹ عبداللہ یوسف علی، مجسٹریٹ اور کلکٹر ۱۹۱۱

۳۷۰ طلاق کے حصول کے لیے درخواست

۳۷۱ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ان کی کتاب ''دی سلف ریویلیشن آف بابر'' کا وہ نسخہ جس پر ان کے دستخط موجود ہیں۔

۳۷۲ عبداللہ یوسف علی جب وہ اسلامیہ کالج لاہور میں پرنسپل تھے۔۱۹۳۶ء

۳۷۳ ظاہرا کالج، سیلون کے میدان میں چائے کی پارٹی ۱۹۳۶ء

۳۷۴ عبداللہ یوسف علی (وسط میں) عبدالحیٔ (ہیٹ تھامے ہوئے) وزیر تعلیم پنجاب کے ساتھ ۱۹۳۷ء

۳۷۵ اسلامیہ کالج کے طلبہ کے ساتھ ۱۹۳۷ء

۳۷۶ عبداللہ یوسف علی ۱۹۳۷ میں

۳۷۷ عبداللہ یوسف علی مسجد راشد کی کنجیاں تھامے ہوئے ایڈمنٹن، کناڈا، دسمبر ۱۹۳۸ء تصویر میں مسلم کمیونٹی کے ایک رہنما ڈی-ایم طٰہٰ بھی موجود ہیں۔

۳۷۸ عبداللہ یوسف علی ایک عشائیہ کی دعوت میں ڈاکٹر آرتھر بوشنے (Dr Arthur Beauchesne) کے ساتھ۔۱۹۳۹ء ''ڈاکٹر آرتھر، کلرک آف دی ہاؤس آف کامنز کے عہدہ پر تھے۔تصویر آٹوا کی ہے۔

Marfat.com

۳۷۹ عبداللہ یوسف علی ۱۹۳۹ء میں

۳۸۰ عبداللہ یوسف علی کی اپنے کاغذات کی مرتب کردہ فہرست کا ایک صفحہ

۳۸۱ ہاتھ سے لکھی ہوئی نظم کا صفحہ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء

۳۸۲ پاکستان ہائی کمشنر مقیم لندن کے خط کا عکس جو انہوں نے وزیر اعظم پاکستان کو لکھا عبداللہ یوسف علی کے انتقال کی اطلاع پر مشتمل ہے۔

۳۸۳ بروک ووڈ کے قبرستان واقع سرے (Surrey) میں عبداللہ یوسف علی کی آخری آرام گاہ (وسط میں)

Civil Service of India. 1761

Candidates selected in 1894.

Open Competition and Final Examination Combined

List resulting from the combined marks of the Open Competitive and Final Examinations.

Order of Merit.	Name.	Presidency or Division of Presidency to which Assigned.	Total M.c. In Open Competition.	In Final Examination.	In Open Competition and Final Examination combined.
1	Pim: Alan William	N.W. Provinces &c.	3114	1766	4880
2	Hailey: William Malcolm	N.W. Provinces &c.	2960	1397	4357
3	Sheepshanks: Richard	Bengal	2563	1589	4152
4	Percival: Philip Edward	Bombay.	2377	1516	3893
5	Dadachanji: Piroze K	Madras.	2180	1684	3864
6	Bryant: John Forbes	Madras.	2453	1294	3747
7	Yusuf-Ali: Abdullah ibn Khan Bahadur	N.W. Provinces &c.	1911	1778	3689
8	Wood: Richard Boardman	Madras	2145	1415	3560
9	Clarke: Robert Thomas	N.W. Provinces &c.	2148	1389	3537
10	Coupland: Herbert	Bengal	2135	1330	3465
11	Ghosal: Jyotsnanath	Bombay	1902	1541	3443
12	Cunliffe: Arthur Talbot	Burma	2471	946	3417
13	Clarke: Geoffrey Rothe	N.W. Provinces &c.	2188	1216	3404
14	Leslie-Jones: Leycester Hudson	N.W. Provinces &c.	1715	1614	3329
15	Stephenson: Hugh Lansdown	Bengal	1916	1359	3275
16	Moore: Harry Christopher	Burma	1867	1406	3273
17	Bushell: William Done	Bombay	2362	890	3252
18	Willmott: Andrew Beauchamp	Madras	1836	1411	3247
19	Hart: Sidney George	Bengal	1768	1478	3246
20	Allen: Edward Cuthbert	N.W. Provinces &c.	2041	1126	3167
21	Chand: Duvan Tek	N.W. Provinces &c.	1493	1634	3127
22	Webb: Charles Morgan	Burma	2173	947	3120
23	Hodson: Thomas Callan	Bengal	1796	1299	3095
24	Tyler: Hector Granville Sutherland	N.W. Provinces &c.	1693	1396	3089

Marfat.com

Marfat.com

CERTIFIED COPY OF AN ENTRY OF MARRIAGE

G 100125

19*1900*. Marriage solemnized at *St. Peter's* in the *parish* of *St. Peter's Bournemouth* in the County *Borough* of *Bournemouth*

Columns: 1 No.	1 When Married.	2 Name and Surname.	3 Age.	4 Condition.	5 Rank or Profession.	6 Residence at the time of Marriage.	7 Father's Name and Surname.	8 Rank or Profession of Father.
10	*Septr 18th 1900*	*Abdullah ibn Yusuf-Ali*	*28*	*Bachelor*	*Joint Magistrate Indian Civil Service*	*Karwi N W Provinces India*	*Khan Bahadur Yusuf Ali, decd.*	*Municipal Indian Commissioner*
		Teresa Mary Shalders	*27*	*Spinster*	—	*Pine Holme Westbourne Park Road Bournemouth West*	*Isaac Noah Shalders*	*Gentleman*

Married in the *Church of St. Peter* according to the Rites and Ceremonies of the *Church of England* by *Licence* ~~or after~~ by me,

Henry Slater
Canon of Newcastle on Tyne

This Marriage was solemnized between us, *Abdullah ibn Yusuf-Ali* / *Teresa Mary Shalders*

in the Presence of us, *Alice Mary Shalders* / *W. Scott Evans*

350992

GENERAL REGISTER OFFICE × ENGLAND ×

Marfat.com

IN THE HIGH COURT OF JUSTICE

Probate Divorce & Admiralty Division

(DIVORCE)

Yusuf Ali

- v -

Yusuf Ali

&

Thorne.

P E T I T I O N

for Divorce.

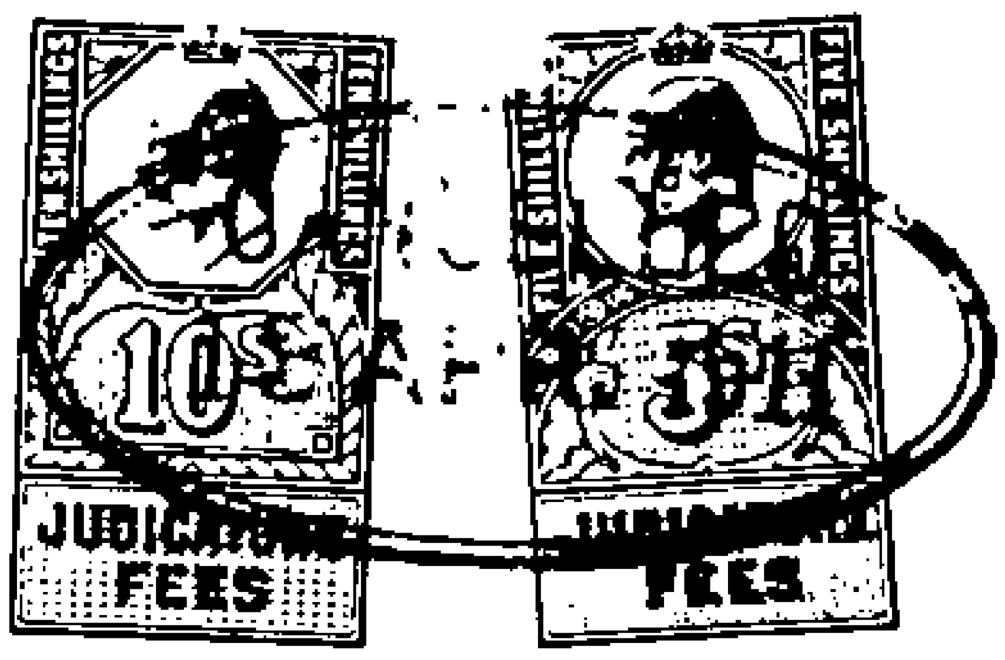

13 APR. 1911

Lewis & Lewis,

Ely Place,

Holborn. E.C.

Marfat.com

With Compliments

A. Yusuf Ali

16 Race Course Rd,

Lahore. Mar. 23, 1927

Marfat.com

Marfat.com

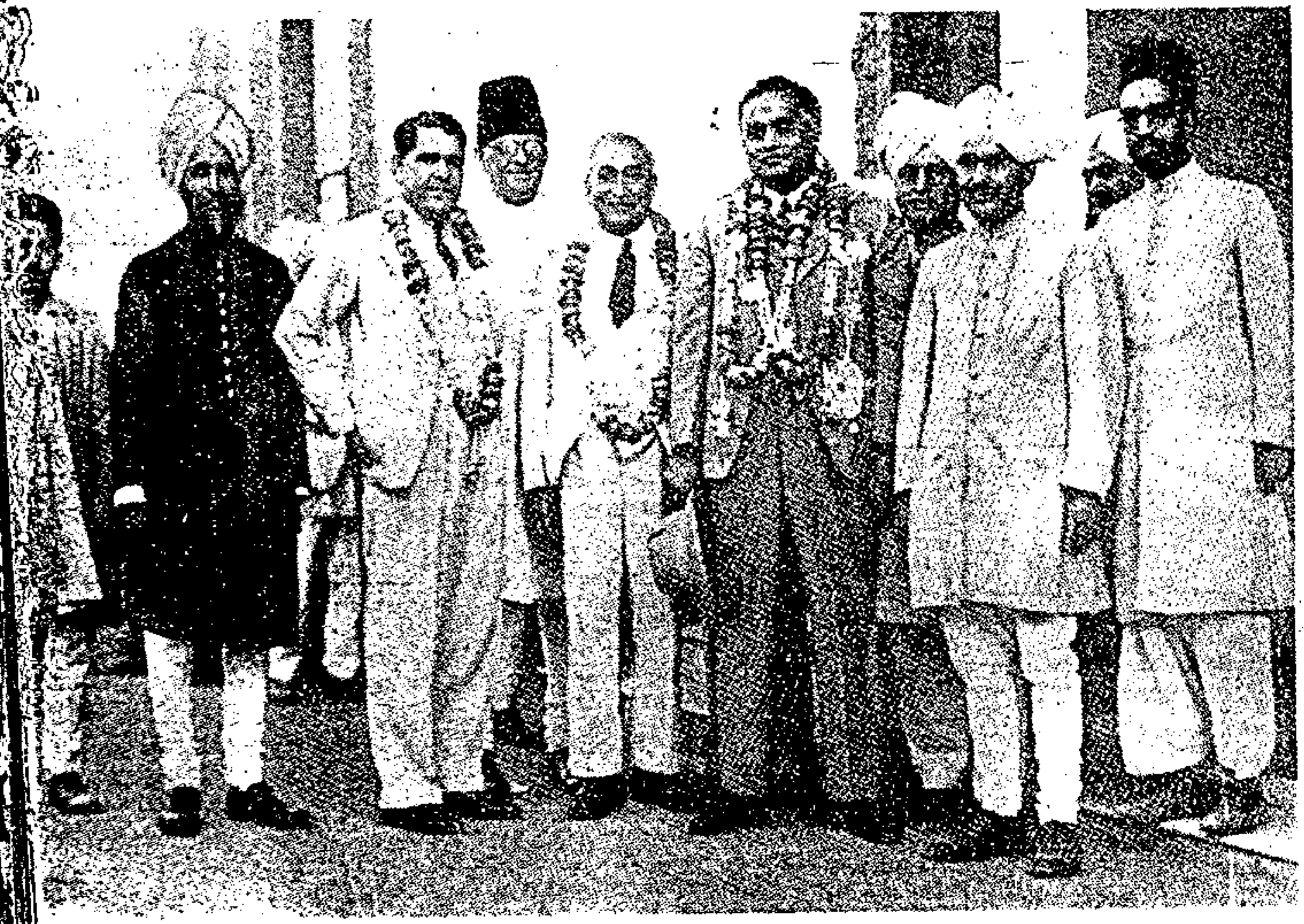

Marfat.com

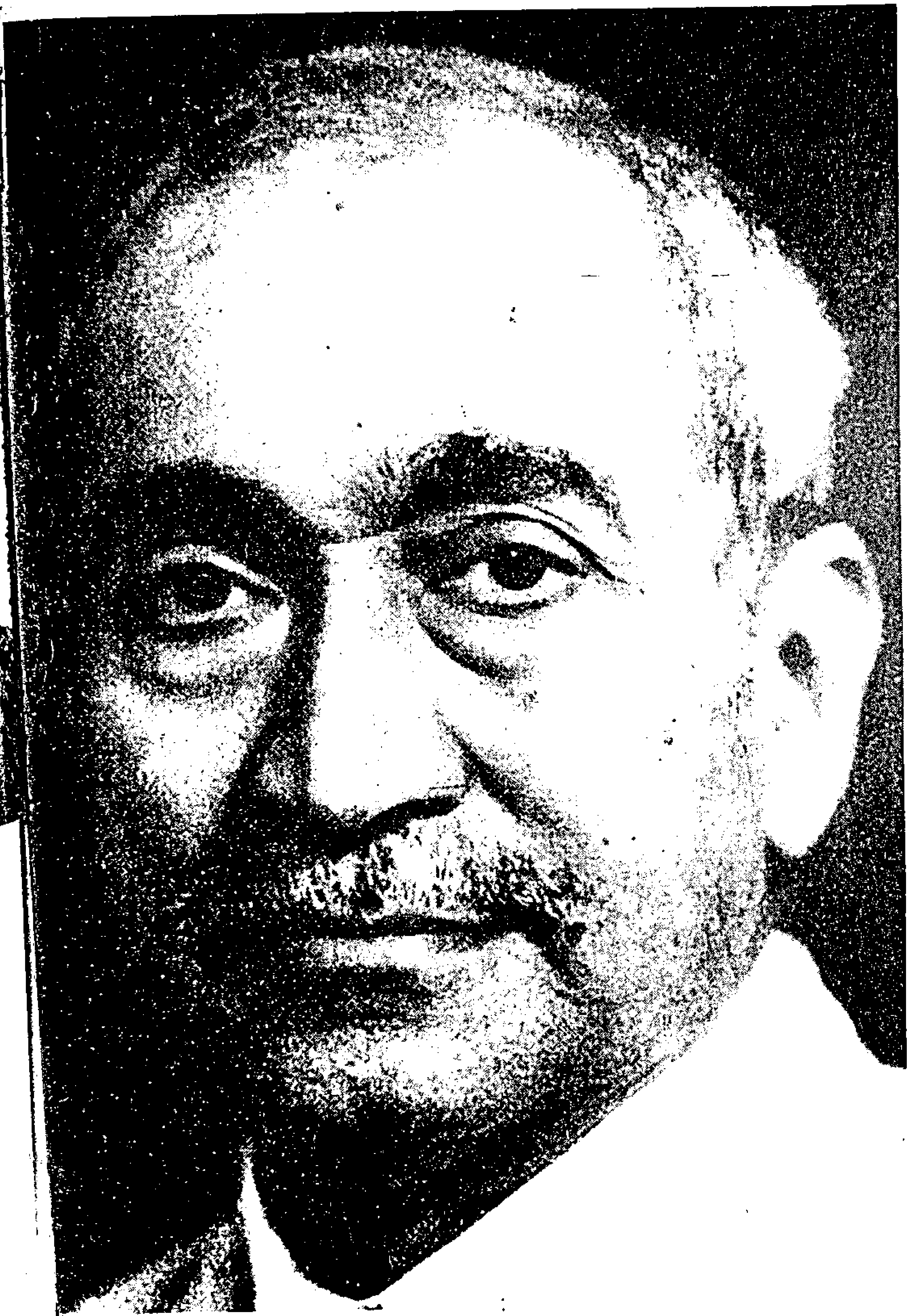

Marfat.com

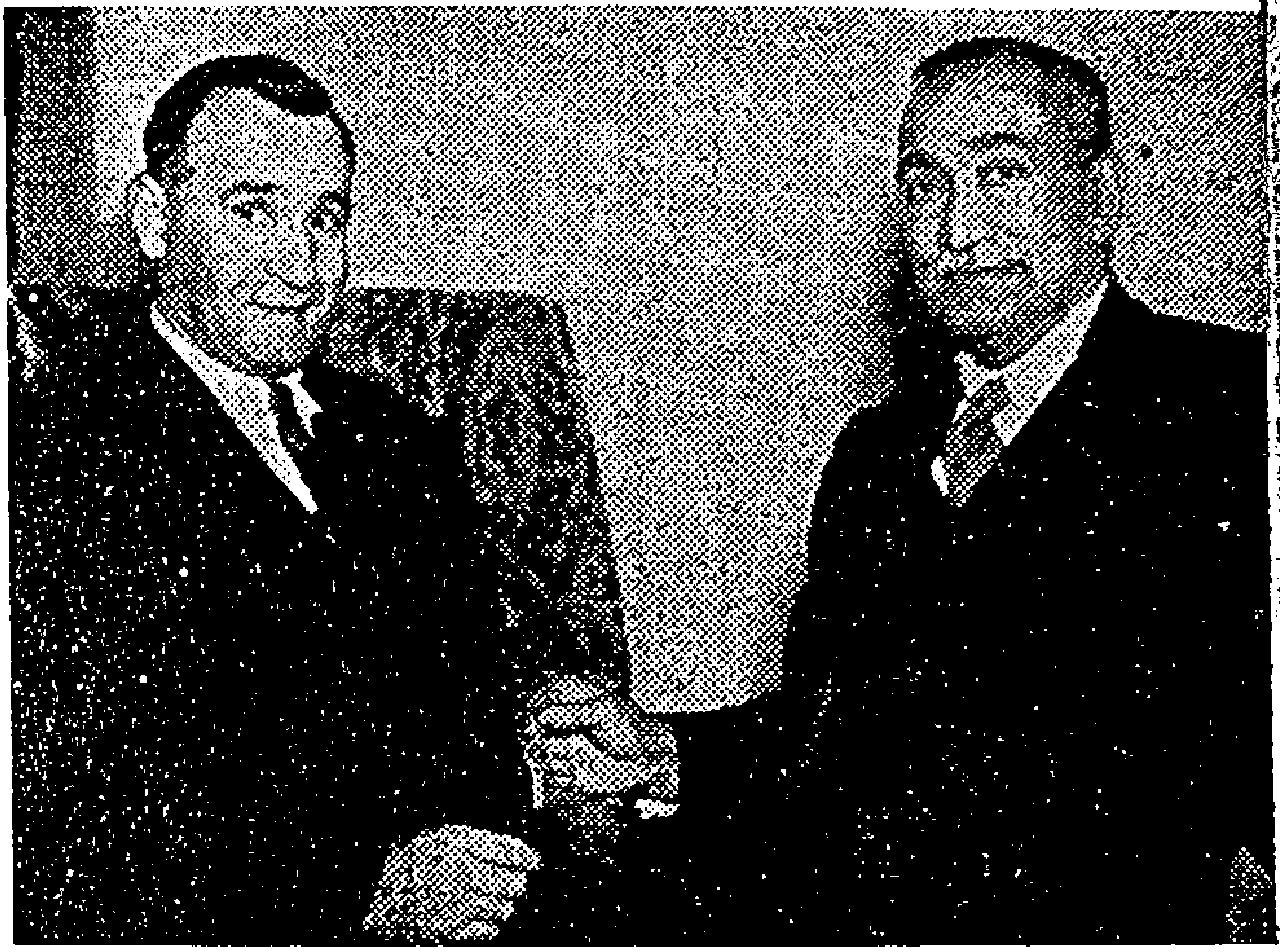

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

63. Peace through Religion
64. Do
65. Do
66. Do
67. Board Teachers' Conference of Apr. 1937
68. Immature marriages
69. Prince of Yemen
70. Palestine (Brit-Sedow)
71. Do
72. Do
73. Character
74. Harper House Conference
75. Adult Education
76. Do
77. St. John's Gate
78. Do
79. Palestine
80. Do Also 88
81. Sir Jagadis Bose
82. } Wayfarer Guild; 83 } Save each other
84. Adult Education
85. Palestine
86. Ramadhan 1355H. Poem
87. See 74.
88. Palestine, 79-80
89. Id message
1938
90. Iqbal Day, Lahore
91. Lahore Music Concert
92. Iqbal Day
93. Millets Art
94. Punjab Students
95. Palestine; Poem
96. Free Adult Edu.
97. Do, Photo
98. Govt House, Lucknow
99. Struggle of Belief
100. Congress of Faiths
101. Adult Education
102. } New Ideals in Educa. 103 } Oxford
104. Sir Mohd Iqbal, d.
105. Reform & Reactions.
106. Afghan Reception
107. [illegible]
108. Adult Education, 28.6
109. Cheap Power Develop...
110. Do 19.7.38
Back again to 1936-37
1936
111. Educational Reform Rotary Speech 17.5.
112. Unemployment & Soc...
113. Italy & Abyssinia
114. Palestine Delegation
115. Faith & Fellowship - Nov. 7
116. } Ceylon Muslim 117 118 119 } Annual Conference,
120. Do. Girls College, Religion
121. Do
122. Do - leading article
123. Do. Zahira Old Boys
124. Do. Arrival Photo
125. Do - Final Session

(360) 10.9.39.

We knew not the harbour for which we were bound;
We knew not the route by which we should go;
We sailed in the midst of a darkness profound,
Prepared for a lurking and hidden foe.

We carried our life-belts ever [sea] & anon,
Walking & sitting, at meals & at play;
We manned our solitary nine-pounder gun;
And we watched fore & aft, by night & by day.

For a week we were lost to the world in a cloud,
A thousand poor souls, women, men, young & old,
In a sea reft of ships, which we stealthily ploughed
Without lights, without [illegible], with our story untold.

With a breath of relief, in the Fortunate[x] Port
We anchored & slowly with lights we did sail
Through the channel that circles East & West in a thin
Silver stream, with old Sinai well within hail.

x Port Said

So here's to the ship with her fine gallant crew,
And here's to the Captain that prudently dared!
For we reach sunny shores, & we humbly renew
Our vow to our Flag, — to be true & prepared.

HIGH COMMISSIONER FOR PAKISTAN
LONDON

PERSONAL

11th December 1953

P.O. 2/53/29

My dear Mohammed Ali:

In continuation of my letter of yesterday regarding Allama Abdulla Yusuf Ali, I write to advise you with regret that the poor man died in hospital at eight last night. It pains me to think that so able and emminent a gentleman should have met with so pathetic an end. May his soul rest in peace.

Sincerely yours,

M. A. Hassan Ispahani

M. A. H. Ispahani

The Hon'ble Mr. Mohammed Ali,
Prime Minister of Pakistan,
Karachi.

Marfat.com

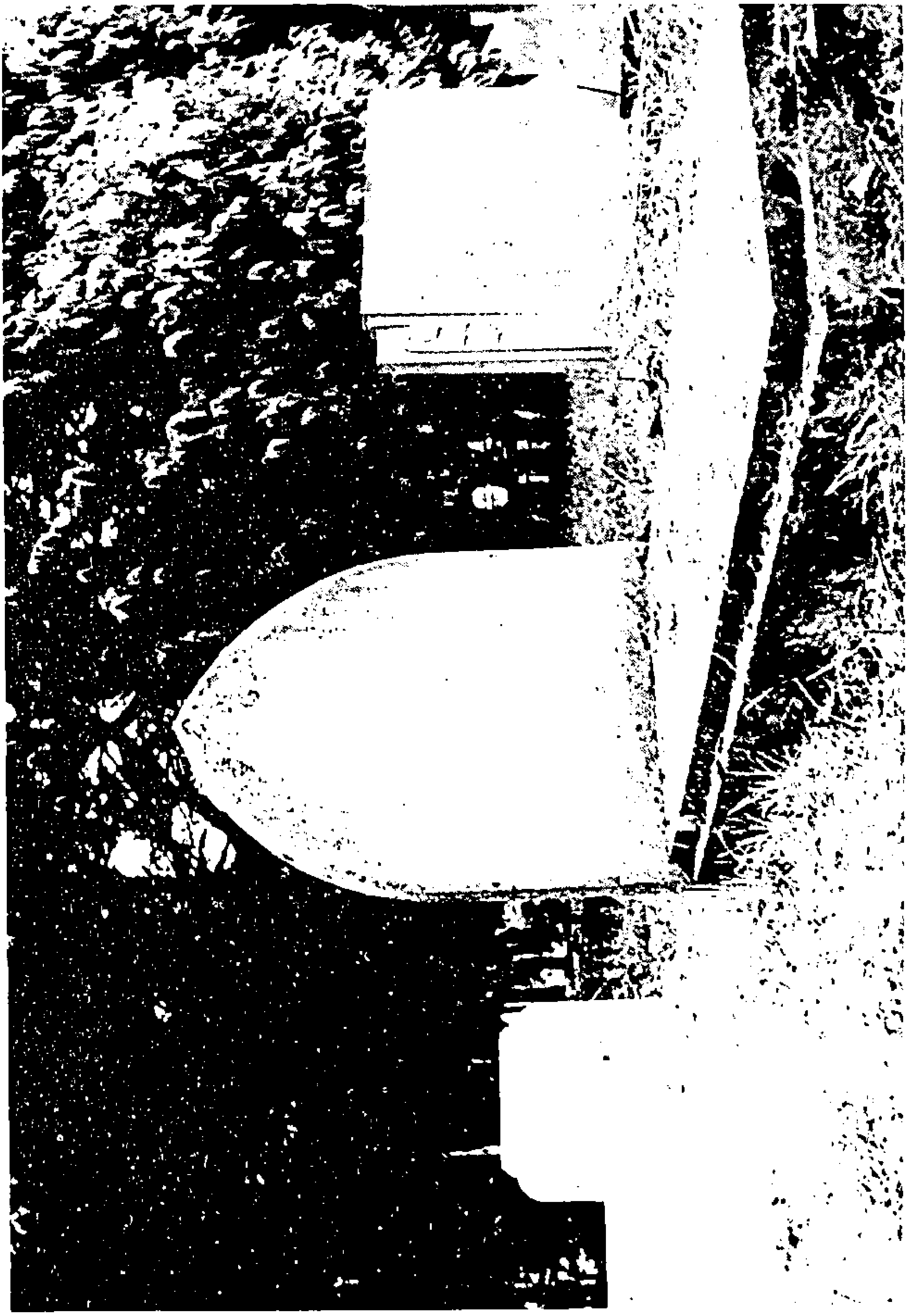

Marfat.com

APPENDIX

YUSUF ALI BIBLIOGRAPHY

This bibliography is in five parts. The **first** presents a chronological bibliography of the books, pamphlets, journal articles, book reviews, formal addresses and other literary works. The **second** part lists the editions, reprints and revisions of Yusuf Ali's translation and commentary of the Qur'an. The **third** and **fourth** parts include some reviews and citations. The **fifth** and final part documents the obituary notices on his death.

Part 1 – Chronological Bibliography

1900

A Monograph on Silk Fabrics produced in the North-Western Provinces and Oudh. Allahabad: N.W. Provinces and Oudh Government Press, 124pp.

1906

Civic Life in India. *Imperial and Asiatic Quarterly Review*, January-April, pp. 225-248.

Goethe's Orientalism. *The Contemporary Review*, Vol. XC, August, pp. 169-181.

1907

The Indian Muhammadans: Their Past, Present and Future. *Journal of the Royal Society of Arts*, No. 2824, Vol. LV, 4 January.

Life and Labour of the People of India. London: John Murray, 360pp. Dedicated to Sir George Birdwood. Reprinted Lahore: al-Biruni, 1977.

Marfat.com

1914

Indian Troops and Moneylenders (letter), *The Times*, 5 October.

Indian Bazaar Rumours (letter), *The Times*, 17 November.

1915

Work for India (letter), *The Times*, 11 June.

India's Services in the War. *Contemporary Review*, Vol. 108, No. 598, pp. 446-456.

India's Rally round the Flag. *Asiatic Review*, Vol. 6, No. 13, pp. 26-33.

1916

Our immediate Future. *Hindustan Review*, Vol. 33, No. 197, January.

Town Life in India: As seen in Lucknow. *Hindustan Review*, Vol. 33, No. 198, February, pp. 126-141.

Lord Hardinge's Viceroyalty. *Nineteenth Century & After*, Vol. 79, No. 409, March, pp. 703-716.

Mestrovic and Serbian Sculpture. Foreword by His Excellency M. Jovan M. Jovanovitch. London: Elkin Mathews, 31pp. (The Vigo Cabinet Series).

1917

India's Effort: Is It Sufficiently Understood? *Nineteenth Century & After*, Vol. 81, No. 480, February, pp. 348-365.

Muhammad – A Towering Personality. *Islamic Review* (Woking), Vol. 5, Nos. 2-3, February-March, pp. 60-61.

Indian Labour in Tropical Australia (letter), *The Times*, 25 September.

Marfat.com

The Type of Elijah, *Islamic Review* (Woking), Vol. 5, No. 12, December, pp. 515-520.

The Imperial War Conference. *Hindustan Review*, Vol. 34, No. 216, pp. 97-100.

The Modern Hindustani Drama. *Transactions of the Royal Society of Literature*, Second Series, Vol. 35, pp. 79-99.

The Importance of Hindustani. *Bulletin of the School of Oriental Studies*, 1917.

1918

The Rowlatt Report (letter), *The Times*, 6 August.

India in Denmark (letter), *The Times Literary Supplement*, 19 September.

On Constantinople (letter), *The Times*, 29 November.

Traek of Indien Kultur. David Grunbaum, (ed.), Copenhagen: V. Pios Bog Handel-Povl Branner, 66pp. (Danish translation by L.C. Marten and D. Grunbaum of Yusuf Ali's lecture 'Features of Indian Culture').

India and the Empire. *Overseas*, Vol. 3, No. 25, pp. 37-40.

1919

Peacock Throne (letter), *The Times*, 10 September.

1920

India since 1713. In H.C. Barnard (ed.), *The Expansion of the Anglo-Saxon Nations: A Short History of the British Empire and U.S.*, London: Black.

Marfat.com

1921

India and the League of Nations. *Contemporary Review*, Vol. 119, No. 665, pp. 633-641.

Anglo-Muhammadan Law. by R.K. Wilson. 5th edition revised by Abdullah Yusuf Ali. Calcutta: Thacker & Spink, 573pp.

1923

The Self-Revelation of Babar. Lucknow: United Provinces Historical Society. The copy in the British Library, London, includes Yusuf Ali's handwritten note: 1927, 14 Race Course Road, Lahore. This is perhaps the date of publication.

Muslim Educational Ideals. Lahore: Muslim Outlook. Presidential address delivered at the Punjab Muslim Educational Conference.

1925

India and Europe: A Study of Contrasts, with a view to discovering avenues of cultural cooperation. London: Drane, 132pp.

The Making of India: a brief history. London: Black, 318pp., maps.

Greatest Need of the Age (Progressive Islam Pamphlets No. 1). The Progressive Islam Pamphlets were published by Luzac & Co., London, as well as by other publishers.

Khutba-e-sadarat, All-India Tanzim Conference, 29 December 1925. Urdu pamphlet (not dated, publisher not known). Photocopy obtained from Quaid-e-Azam Library, Lahore.

1926

Islam as a World Force. (Progressive Islam Pamphlets No. 2). 43pp. Lahore: Anjuman-Himayat-ul-Islam.

Civics in Education and Practical Life. In J.E. Parkinson & R.H. Whitehouse (eds.), Proceedings of the Punjab Educational Conference and Exhibition (copy in Punjab Public Library, Lahore).

Marfat.com

1927

Glimpses of the Punjab: A souvenir of the 14th meeting of the Indian Science Congress, held at Lahore in January. Edited by Abdullah Yusuf Ali and Charles Herbert Rice. Lahore: Indian Science Congress, 98pp., maps.

Three travellers to India. Lahore: M. Gulab Singh, 89pp. Account of India as seen by Yuan Chwang, Ibn Batūta and Francois Bernier.

Al-Biruni's India, *Islamic Culture* (Hyderabad Deccan), pp. 31-35 (January), 223-230 (April), 473-487.

Article on 'Karamat Ali', *The Encyclopaedia of Islam*, Vol. II, Leyden, 1927, pp. 752-754.

Article on 'Khodja', *The Encyclopaedia of Islam*, Vol. II, Leyden, 1927, pp. 960-962.

1928

Social and Economic Conditions during the Middle Ages of Indian History, *Islamic Culture* (Hyderabad Deccan), pp. 360-375 (July).

Ameer Ali (obituary note), *The Times*, 6 August.

Indian Reform (letter), *The Times*, 16 November.

Education in India: the new outlook. *Nineteenth Century & After*, Vol. 104, No. 622, pp. 745-756.

Outlines of Indian History. Lahore: Uttar Chand Kapur & Sons, 399pp. For the use of matriculation students in Indian high schools.

1929

The Fundamentals of Islam. (Progressive Islam Pamphlets No. 3). 11pp. Also published in Sufi Quarterly (Geneva).

Marfat.com

Personality of Muhammad. (Progressive Islam Pamphlets No. 4). 23pp. A speech delivered in London at the Festival of 'Id-ul-Adha. (2nd. edition Lahore: M. Feroz-ud-din, 1931).

1930

Sir Thomas Arnold (obituary note), *The Times*, 13 June.

Moral Education (Progressive Islam Pamphlets No. 5). Speech at the 5th International Moral Education Congress at the Sorbonne in September 1930.

The position of Women under Muslim Law in India. In A.R. Caton (ed.), *The Key of Progress*. London: Oxford University press, pp. 94-97.

Anglo-Muhammadan Law. R. K. Wilson, 5th edition revised and brought up to date by Abdullah Yusuf Ali. Calcutta: Thacker & Spink.

Social and Economic life in Medieval India. *Islamic Culture* (Hyderabad Deccan), Vol. iv, pp. 199-222.

1931

Personality of Man. (Progressive Islam Pamphlets No. 6). 15pp. Hyderabad Deccan: Islamic Cultural Office. Also published in *Islamic Culture*, Hyderabad, Vol. v, October.

Imam Husain and his Martyrdom. (Progressive Islam Pamphlets No. 7). 41pp. Lahore: M. Feroz-ud-Din.

Hindustan ki tamaddun ki tarikh (preface dated September 1931). Urdu edition reprinted by Karimsons, Pakistan, 1967. (Translated into English as *A Cultural History of India during the British Period*, 1940. Translator not specified but the publisher's note suggests that it may have been Yusuf Ali).

Marfat.com

1932

Dr Mackichan (obituary note), *The Times*, 12 April.

Medieval India: Social and Economic Conditions. London: Oxford University Press, 55pp. English translation of lectures in Urdu delivered at the Hindustani Academy, Allahabad, 1928 (Urdu text published in 1939).

1933

King Faisal of Iraq (letter), *The Times*, 11 September.

Religious Polity of Islam. (Progressive Islam Pamphlets No. 8). 21pp. Hyderabad Deccan: Islamic Cultural Office. Also published in *Islamic Culture*, Hyderabad, Vol. vii.

Indian Reactions to the White Paper. *Asiatic Review*, Vol. 29, No. 99, pp. 411-434.

1934

First instalment of *The Holy Qur'an: An Interpretation in English, with Arabic text in parallel columns, a running rhythmic commentary in English and full explanatory notes.* (June).

Sir Frederic Lely (obituary note), *The Times*, 26 November.

Muhammad in History. (Progressive Islam Pamphlets No. 9). 22pp. Markaz-i-Ishaat-i-Seerat; Jullindur City; Punjab. A speech delivered to the Muslim Club of Simla.

Beauties of the Qur'an. (Progressive Islam Pamphlets No. 10). 16pp. Lahore: Khaliq Ahmed Faruqi, 16pp. Muslim Brotherhood Series No.6.

1935

Two parables from the Qur'an. *Islamic Review* (Woking), Vol. 23, No. 1, (January), pp. 6-7.

Marfat.com

On a pilgrimage to Mecca (article), *The Times*, 7 June. (This appeared in the early edition only; the British Library and the newspaper's own archives have only retained the 'Royal Edition' for the day, from which this article is absent).

Some Aspects of Local Government in Foreign Lands. Lahore: Local Self-Government Institute, 16pp. Inaugural address delivered to the students at Local Self-Government Institute, Punjab, at the opening meeting held on 30th October.

The Religion of Rabindranath Tagore. *Transactions of the Royal Society of Literature*, New Series, Vol. IX, Chapter V. Also published in *Islamic Culture*, Hyderabad, Vol. iv, 1930.

1936

Religion and Social Equality. *Islamic Review* (Woking), Vol. 24, No. 9, (September), pp. 342-347.

Presidential address to the Secondary Education Section of the All-India Muslim Conference, Rampur. This was published in the *Indian Journal of Education*, Volume 1, No. 5-6; May-June, pp. 1-10.

Mustapha Kemal Ata-Turk (article), *Eastern Times*, Lahore, 3 June.

The Indian Theatre (book review), *Journal of the Central Asian Society*, October, pp. 687-89.

The Universities of India (book review), *Journal of the Central Asian Society*, October, pp. 689-90.

Ramadhan 1355 H. (poem), *Eastern Times* (Lahore), 15 November.

The Essential Basis of Religion. (World Fellowship through Religion Pamphlet No. 1). 15pp. London: World Congress of Faiths.

Religion and Social Equality (Progressive Islam Pamphlets No. 11).

Life and Literature. (Progressive Islam Pamphlets No. 12). 18pp. Lahore: M. Feroz-ud-Din. Summary of Punjab University Extension Lectures.

1937

Presidential address to the University Section of the All-India Muslim Educational Conference, Golden Jubilee Session, Aligarh, 27 March, 1937; pamphlet.

Presidential speech at the Second Annual Session of the Punjab Board Teachers' Union, Lahore, 3 April. Pamphlet printed at the Ripon Printing Press, Lahore.

Sayyid Shaheed Hadrath Imam Husain alayhis-salaam (article) *Masjid*, Lahore (Urdu weekly), 16 April.

The New Constitution in India (letter), *The Times*, 11 June.

The World's Need of Religion. Pamphlet published by the World Congress of Faiths for its conference held at Oxford, July.

Reform of Indian Education (letter), *The Times*, 24 August.

Sir Jagadis Bose (obituary note), *The Times*, 27 November.

Thirtieth and final instalment of *The Holy Qur'an: An Interpretation in English, with Arabic text in parallel columns, a running rhythmic commentary in English and full explanatory notes.* (December).

The Idea of God in Islam. (Progressive Islam Pamphlets No. 13). 18pp. Lahore: Abdus Salam Khurshid.

1938

Palestine (poem), *The Mussalman*, Calcutta, 28 January.

Problems of adult education in India. World Association of Adult Education, Second Series, No. XII, February.

Adult Education. Two articles in *Hindustan Review*, February and April-May issues.

Sir Muhammad Iqbal (obituary note), *The Times*, 25 April.

Dr C.J. Goldsmid-Montefiore (obituary note), *The Times*, 16 July.

W.H. Moreland (obituary note), *The Times*, 4 October.

Marfat.com

1939

Averroes: Philosopher of East & West. *Religions*, January, pp. 30-36. Quarterly published by Luzac, London.

The Glorious Future of the Muslims (book review), *Asiatic Review*, January.

Review of Sayyid Tufail Ahmed Manglori's *Hindustan mai musulamno ka raushan mustaqbil* – Islam in the world (book review), *Journal of the Royal Asiatic Society*, January.

The Idea of Salvation in Islam. (Progressive Islam Pamphlets No. 14). 15pp. February. Read before the London Society for the Study of Religion, 1 November 1938.

The Muslim World and Palestine. *The British Union Quarterly*, January-April, pp. 54-59.

My Canadian Tour (articles). Three instalments in *Eastern Times*, Lahore, 24 March, 31 March, 7 April.

My *Mahboob* – Holy Prophet of Islam (article), *Eastern Times*, Lahore, 28 April.

The Prophet's Services to the Cause of Human Morality. *Islamic Review* (Woking), Vol. 27, No. 7, July, pp. 245-247.

Sir Reginald Glancy (obituary note), *The Times*, 21 December.

Tarikh-i-hind kay azmana wusta mai ma'ashi aur iqtisadi halaat, Allahabad: Urdu Academy, 109 pp. Three lectures presented to the Urdu Academy, 2-4 March 1928. (An earlier Urdu edition may have been published).

1940

The Muslims of India, The War and the Political Field. *Asiatic Review*, Vol. 36, pp. 226-250, Lecture delivered before the East India Association, Caxton Hall, London, 6th February.

Lord Lamington (obituary note), *The Times*, 24 September.

Marfat.com

The Somalis & their Religious Ideas. *Religions*, October.

Memories (poem), *Eastern Times*, Lahore, 4 October.

Comments on a paper by Sir Alfred Watson on the political situation in India, made at a meeting of the East India Association. *Asiatic Review*, Vol. 36, pp. 74-75. The meeting took place on 8 December.

The Message of Islam. London: John Murray. (Wisdom of the East Series). 127pp. Comprises the rhythmic commentary from *The Holy Qur'an.* Also published in the United States by E.P. Dutton & Co. Inc. (New York), 1940.

A Cultural History of India during the British Period. Bombay: D.B.Taraporevala, 334pp.

India and the War. (British Information Series No. 7). 16pp. Tokyo: British Embassy.

Adult education in India. *Journal of the Royal Society of Arts*, Vol. 88, No. 4558, pp. 482-495.

Doctrine of Human Personality in Iqbal's Poetry. *Transactions of the Royal Society of Literature*, New Series, Vol. XVIII, pp. 89-106. Based on a lecture at the Society, 9 November, 1938.

1941

Indian Moslems – lesson of the Sudeten Germans (letter), *The Times*, 15 January.

Hellenic Culture and the Modern World. *Religions*, January.

Ethics and Totalitarianism. *South Place Ethical Society Monthly Recorder*, Red Lion Square, London, July, pp. 8-9.

The University of Bombay (book review), *Religions*, July.

Islam and Japan (book review), *Religions*, October.

German air raids on London (poem), *Eastern Times*, Lahore, 21 November.

Marfat.com

Muslim Cultural and Religious Thought. In L.S.S. O'Malley, (ed.). *Modern India and the West.* London: Oxford University Press, pp. 389-414.

1942

Sir Francis Younghusband (obituary note), *The Times*, 4 August.

1943

'Id-ul-Fitr sermon, Woking. *Islamic Review,* Vol. 31, No. 2, (February), pp. 100-101.

1944

Note on 'Islam', *Religions*, October, p. 27. This short note is the last known published work of Yusuf Ali:

> In the second Sura of the Qur'an occurs this passage: Many People of the Book desire you to be unbelievers....but forgive them and avoid them. This implies that we are to entertain no personal rancour against those who do wrong, but for our own perfection [crossed out and overwritten 'protection'], we should shun their company, lest their example should affect us, consciously or unconsciously. A phrase frequently repeated in the Qur'an is: Shame in this world and a grievous punishment. 'Shame in this world' obviously means a deterioration of our social relations, which may affect us in many ways, including our social and economic position. 'Grievous punishment' implies something more definitely tangible, such as a fine or imprisonment, or even the ultimate penalty of death. But this would be exacted, not by the individual concerned, but by or through the State where a State exists.

The above note is one of the cuttings in the Yusuf Ali scrapbook in the author's possession. The replacement of the word 'perfection' with 'protection' was handwritten by Yusuf Ali.

Part 2 – The Qur'an

First edition

The Holy Qur'an: An Interpretation in English, with Arabic text in parallel columns, a running rhythmic commentary in English and full explanatory notes. Lahore: Shaikh Muhammad Ashraf, 1934-1937 -(30 instalments, index).

Second edition

The Holy Qur'an: Consolidation of the 30 instalments into three volumes, with the original instalment covers retained within the body of each volume (second edition not explicitly stated).

Third edition

The Holy Qur'an – text, translation and commentary. Two-volume edition, leather cover with gold embossed lettering. Lahore: Shaikh Muhammad Ashraf, 1938. 1862pp. 14 appendices, index. An inside page contains the note: 'All rights, including rights of translation and reproduction reserved by A. Yusuf Ali'. Contains 'Preface to the Third Edition'; numerous reprints by Ashraf including 1943, 1969, 1973, 1979.

The Holy Qur'an, New York: Hafner Publishing Co., 1938.

The Holy Qur'an, New York: Hafner Publishing Co. 1946. Printed at the Murray Printing Company, Cambridge, Mass. Copyrighted 'Khalil ul-Rawaf'. The following note is included: '*Bismillahir-rahmanir-Rahim*. I have undertaken the publication of this magnificent translation of the Holy ul-Qur'an as rendered into English by Allama Abdullah Yusuf Ali in commemoration of the visit to the United States of America of the Saudi Delegation headed by His Excellency Sheikh Abdullah Es-Sulaiman El-Hamdan, Trasurer of the Royal Saudi Arabian Kingdom. Khalil ul-Rawaf (signed)'. There have been numerous reprints citing the 'ul-Rawaf' copyright.

Marfat.com

The Meaning of the Illustrious Qur'an, Ashraf: Lahore, 1957. Without Arabic text and appendices.

The Holy Qur'an, Mecca: The Muslim World League, 1965.

The Holy Qur'an, Riyadh: Dar ul-Liwaa, 1966(?). Includes Sayyid Abul 'Ala Mawdudi's 'Introduction to the study of the Qur'an' in English and Arabic. Distributed by the Kingdom of Saudi Arabia General Presidency for Scientific Research, Ifta, Islamic Propagation and Guidance.

The Holy Qur'an, Beirut: Dar ul-Arabia, 1963. Reprint 1968.

The Holy Qur'an, Delhi: Kitab Publishing House, 1973 (a three-volume publication, likely third edition).

The Glorious Qur'an, Leicester: The Islamic Foundation in cooperation with the Muslim Student Association of the United States and Canada, 1975.

The Holy Qur'an, Beirut: Dar ul-Kitab ul-Lubnani, 1979. 'Printed under the auspices of late King Khaled Abdul Aziz of Saudi Arabia.'

The Holy Qur'an, Beirut: Dar ul-Qur'an al-Karim, 1983.

The Holy Qur'an, Brentwood; Maryland: Amana Corporation, 1983. Copyright claimed by Amana Corporation. Distributed by the al-Rajhi Company, Saudi Arabia.

The Holy Qur'an, New Delhi: Nusrat Ali Nasri for Kitab Bhavan, 1987. This is a variation of the third edition, containing no commentary but only the English translation, the Arabic text and an interposed column of Roman transliteration.

Roman transliteration of the Holy Qur'an, New Delhi: Taj, 1990. English translation with Arabic text, but not the commentary. Some changes have been made to the translation, e.g. 'God' replaced by 'Allah'.

Marfat.com

Amana/IIIT editions

The Holy Qur'an-Text, translation and commentary, 'New Revised Edition'. Brentwood, Maryland: Amana Corporation, 1989; in cooperation with the International Institute of Islamic Thought (IIIT), United States of America.

This edition differs from the third edition, as it contains amendments to both the translation and commentary. The annotation 'eds.' Or 'R' (revised) has been employed to indicate changes to the commentary and introductions to *surahs*, though not the translation. The editors responsible for the revision are not named though the Publisher's Note (unsigned) states that 'a number of committees reviewed all the responses carefully, examined the text meticulously, updated the material and refined the commentaries. The last complete review was undertaken by the late Ismail Raji Faruqi...Amana Corporation at IIIT established an editorial board whose effort was to implement the final recommendations of the committee.'

Professor Hamidullah's misgivings about this initiative were reported in the Muslim press. He believed that altering an author's work without permission set a dangerous precedent: 'The right way would have been, in the cases of need, to reproduce the original text and add a footnote to say that the new editor suggests this or that word or opinion.' (*Impact International*, London, 18: 22, 25 November 1988 – 8 December 1988).

The Meaning of The Holy Qur'an, 'New edition with revised Translation and Commentary', Maryland: Amana Corporation, 1992. The publisher's note is signed by Fakhri Al-Barzinji, President, Amana Corporation. A postscript, dated February 1991, includes the following clarification: 'We thank those readers of our 1409 AH/1989 AC edition who expressed concern over the use of the expression "New Revised Edition". In this edition we have removed the words "New Revised Edition" to avoid any misconceptions by our non-Muslim readers. This is therefore a new edition of the English *Meaning of the Holy Qur'an*, with revised translation and commentary'.

Marfat.com

Both of the Amana/IIIT editions (1989, 1992) include a biographical note on Yusuf Ali with several errors. He is described as 'Dean of the Islamic College', presumably a reference to his principalship of Islamia College, Lahore. Moreover he died in London on 10 December 1953, not in Lahore in 1948.

The Amana/IIIT editions have replaced the Third Edition's use of 'Lord' or 'God' with 'Allah', and 'Apostle' with 'Messenger'. Yusuf Ali's use of the Roman system for numbering chapters of the Qur'an has also been updated. Extra material has been added to commentary notes, e.g. note 4927 refers to the United Nations.

Dar al-Ifta / King Fahd Holy Qur'an Printing Complex edition

The Holy Qur'an: English translation of the meanings and commentary, revised and edited by the Presidency of Islamic Researches, Ifta, Call and Guidance. Medina: King Fahd Holy Qur'an Printing Complex, 1990.

The cover page contains the following declaration: 'The custodian of the two holy mosques, King Fahd ibn Abdul Aziz Al-Saud, King of the Kingdom of Saudi Arabia, has the honour to order the printing of this Holy Qur'an and the translation of its meanings and commentary.'

The only reference to Yusuf Ali in this edition is in the preface note prepared by the Presidency: 'The translation by the late *Ustadh* Abdullah Yusuf Ali was consequently chosen [for a reliable translation] for its distinguishing characteristics, such as highly elegant style, a choice of words close to the meaning of the original text, accompanied by scholarly notes and commentaries.'

The changes are generally similar to those in the Amana Corporation edition though there are variations. The editors – unnamed – have not used any form of notation to indicate changes made. In addition to the appendices absent from the Amana/IIIT editions (Allegorical interpretation of the Story of Joseph; Mystic interpretation of the Verse of Light; The Muslim Heaven), the following are also excluded: Egyptian chronology and Israel;

Marfat.com

Egyptian religion and its steps towards Islam; Who was Dhu al-Qarnain?; Ancient forms of pagan worship. The Preface and rhythmic commentary of the original have also been removed. There are some oversights – for example the chapters have been re-numbered with the Arabic system but cross-references to them in the commentary notes still use the Roman system. The removal of cross-references to appendices has also left some commentary notes incomprehensible e.g. note 5721. Yusuf Ali's reference to the 'imprudence of *Hadrath* Aisha' in commentary note 5529 has also been removed.

A note on the Amana/IIIT and Ifta/King Fahd Complex editions

In 1980, the World Assembly of Muslim Youth (WAMY) established a committee comprising Professor Muhammad Mustafa Azmi, Dr Jaafer Shaikh Idris and Professor Zafar Ishaq Ansari to select and where necessary revise an appropriate English translation of the Qur'an. The committee's choice was Yusuf Ali, and a revision of the third edition was prepared by them but not published. The Qur'an Centre in Medina (King Fahd Holy Qur'an Printing Complex) and Dar al-Ifta in 1983-1984 called on additional scholars, including Saleem Kayani representing Dar al-Ifta, to continue and complete the committee's work. These cumulative revisions were the starting point for both the Amana Corporation and Dar al-Ifta editions. The former published the material in 1989. Dar al-Ifta however continued with revision work, with the assistance of scholars including Dr. Syed Mutawalli ad-Darsh and Suhaib Husain, resulting in the Dar al-Ifta/King Fahd Holy Qur'an Printing Complex edition (1990).

Translation of the Amana (1989) edition

Al-Qur'anu 'l-Karim: Terjemahan dan hurain maksud (Bahasa Malaysia) by Abu Salah Muhammad Uthman El-Muhammady, Dewan Bahasa dan Pustaka, Kementerian Pendidikan Malaysia, Kuala Lumpur, 1992-1993 (publication in instalments).

Marfat.com

Translation includes the commentary notes and rhythmic commentary. Though adhering to the Amana edition, the translator regrets the absence of the appendices and other exclusions: 'If the late Allama were still alive, those are the last matters that he would allow to be excluded from his commentary.'

Part 3 – Reviews and Citations relating to Yusuf Ali's Qur'anic scholarship

Asiatic Review, October 1939.

Review by Sir Abdul Qader with the title 'The East interpreted to the West': 'This translation, as Mr Yusuf Ali tells us in his Preface, has been a dream of his for years and is the result of a prolonged study and research. It has taken years to complete, but the writer has the satisfaction of feeling that his labours have received a wide appreciation and that he will be long remembered by his work, which may be regarded as his magnum opus.'

The Muslim World, Vol. 30, 1940, pp. 54-66, 1940.

Review by Arthur Jeffrey who notes: 'the translator is an Indian Muslim from the North [*sic*], English-educated, who has spent a great deal of his active life in the West.'

Times of India, Bombay 28 June.

Review of *The Message of Islam* (1940) which comprised Yusuf Ali's rhythmic commentary only. The reviewer 'A.A.A.F.' – possibly Fyzee – observes: 'the teaching of the Qur'an has been offered to the layman in language of such distinction and felicity that many a passage keeps ringing in our ears.'

Asiatic Review, July 1940.

Review of *The Message of Islam* by Edward Maclagan.

The Muslim World, Vol. 31, 1941.

Review of *The Message of Islam* by Edward J. Jurji.

A Discussion of the Errors of Yusuf Ali, Majlisul-Ulema of South Africa, Transvaal: Young Men's Muslim Association (undated).

Marfat.com

This is a 96-page polemic severely critical of Yusuf Ali's Qur'anic scholarship, particularly references to Paradise and Hell as 'symbolic'.

The Muslim World League Journal, Mecca, February 1985.

Article by A.R. Kidwai, 'Abdullah Yusuf Ali's views on the Qur'an Eschatology'.

Le Saint Coran, Muhammad Hamidullah, Brentwood; Maryland: Amana Corporation, 1985.

A list of translations of the Qur'an refers to Yusuf Ali's translation-cum-commentary and cites some reprints. Professor Hamidullah is in error in specifying his year of death as 1952 (it was 1953).

World bibliography of translations of the meaning of the Holy Qur'an – printed translations 1515-1980, (ed.) I. Binark & H. Eren, Istanbul: Research Centre for Islamic History, Art and Culture, 1986.

Contains a comprehensive list of the various editions and reprints of Yusuf Ali's Qur'anic work.

Muslim World Book Review, Leicester, Vol. 12, No. 2, 1992.

Review by A.R. Kidwai of the Amana Corporation (1989) and Ifta/King Fahd Complex (1990) editions. While the merits of the original are acknowledged ("a highly readable paraphrase of the Arabic text in chaste, idiomatic English") the reviewer is generally appreciative of the revisions: 'Yusuf Ali's work now stands almost completely free of the author's apologetic, pseudo-rational and too much *tasawwuf*-oriented notes.'

Muslim & Arab Perspectives, Issue No. 1, October 1993, Delhi.

Article by S.A. Hasan Rizvi, 'Some errors in Abdullah Yusuf Ali's English translation of the Holy Qur'an'.

Part 4 – Other reviews and citations

The Times Literary Supplement, 22 March 1907.

Review of *Life and Labour of the People of India.*

The Times Literary Supplement, 5 September 1918.

Review of *Traek of Indien Kultur.*

India at the Death of Akbar by W.H. Moreland, London: Macmillan & Co., 1920.

Preface expresses gratitude to Yusuf Ali.

The Times Literary Supplement, 3 December 1925.

Review of *The Making of India.*

The Agrarian System of Modern India by W.H. Moreland, Cambridge: W. Heffer, 1929.

Preface states: 'I have drawn freely on some unpublished notes written in consultation with Mr A. Yusuf Ali when we worked together some years ago on the authorities for the reign of Akbar.'

The Stateman, Calcutta, 13 October 1940.

Review of *A Cultural History of India during the British Period.*

Asiatic Review, January 1941.

Review by C. Colin Davies of *A Cultural History of India during the British Period.*

Historians of India, Pakistan and Ceylon by C.H. Philips, London: Oxford University Press, 1961.

Reference to *The Making of India* (1925). Philips observes that seventy-four books are listed by Yusuf Ali 'for further study' but these include no work by a contemporary Muslim except for Ameer Ali's biography of the Prophet.

The Indian Civil Service by L.S.S. O'Malley, London: Frank Cass, 1965.

Reference to *Life and Labour of the People of India* (1907).

The Sword and the Spectre edited by Riffat Hassan, Lahore: Iqbal Academy, 1977.

A chapter by Sir Abdul Qader on Iqbal contains a reference to Yusuf Ali's paper 'Doctrine of Human Personality in Iqbal's

Marfat.com

Poetry' (lecture to the Royal Society of Literature in 1938). Abdul Qader also contributed on Iqbal in *Great Men of India*, (undated, but 1985 reprint), editor L.F. Rushbrook-Williams, Delhi: Gian Publishing House, in which there are quotations from this paper.

Islamic Spirituality edited by S.H. Nasr, London: Routledge Kegan Paul, 1987.

Reference to *Personality of Muhammad* (1929).

Part 5 – Obituary notices on Yusuf Ali

The Times, 15 December 1953.

The Daily Telegraph, 17 December 1953.

Radio Pakistan, Lahore (undated), but reprinted in the Urdu daily *Iqdam*, Lahore, 27 December 1953.

Islamic Literature, Lahore, Vol. VI, No. 1, January 1954. Editorial by Shaikh Muhammad Ashraf, publisher of *The Holy Qur'an – text, translation and commentary*. Shaikh Ashraf included the following observations: 'Literature and art, painting and sculpture, law and constitution, religion and education, philosophy and history, economics and politics, all were included in his many-sided interests and pursuits, and his versatile genius was manifest in everything that sprouted from his powerful pen. Dr. Ali Hassan Abdel Kader, Director of London's Islamic Cultural Centre, who was a close friend and collaborator of Yusuf Ali for many years, said: "This is a great loss for English-speaking Muslims and Islam generally. There is no doubt he was the greatest translator of the Holy Qur'an in modern times. I consider his English version the only authoritative one"'.

Islamic Culture, Hyderabad Deccan, Vol. XXVIII, No. 1, January 1954. Poem in memory of Yusuf Ali by Nawab Sir Nizamat Jung. There is also an obituary note by Professor Abdur Rahman Khan, former principal of Osmania College, which includes this reference to Yusuf Ali's Qur'anic scholarship: 'He has won enduring fame through the publication of an excellent translation of the Holy Qur'an which reproduces the sacred text together with valuable

notes and commentary (based, it is said, largely on Shah Abdul Qadir Sahib Dehlavi's standard translation and other works of repute). It is the favourite reading of numerous English scholars and the late Sir Dennison Ross, Director of the School of Oriental Studies, London, was of the opinion that "the whole presentation is superior to any that has appeared hitherto".

The Islamic Review, Woking, February 1954, pp. 35-37.

Extracts from *The Times* obituary, but with the significant additional information that Yusuf Ali had been a trustee of the Shah Jahan Mosque, Woking.

Marfat.com

References

Primary Sources

Register of the Proceedings of the General Council of the *Anjuman-Himayat-ul-Islam,* Lahore

Volumes for periods 3/10/1926-22/1928, 1/7/1934-28/4/1937

India Office Library and Records, London

Departmental records
L/E (Economic)
L/I (Information)
L/MIL (Military)
L/P&J (Public and Judicial)
L/P&S (Political and Secret)

Other records

V/12 (Histories of Services)
Private Collections:
MSS Eur F136 Meston Collection
MSS Eur D523 Montagu Collection
MSS Eur F197 Younghusband Collection

Public Record Office
Foreign Office files
FO371
FO372
FO395

General Register Office
Register of Births, Marriages and Deaths
Probate and Divorce Records.

Yusuf Ali Collection

Yusuf Ali's collection of newspaper cuttings, pamphlets, letters, poems and other papers were retrieved by the author from debris

Marfat.com

in the library room of Regent's Lodge, London, the old building of the Islamic Cultural Centre. Numerous old books and files were discarded in the evacuation in 1974, when the site was being cleared for the construction of the new mosque. The author was fortunate to spot the scrapbook after one of the last meetings of the London Islamic Circle, which used to be held in the library.

Each entry in the scrapbook was uniquely numbered by Yusuf Ali, and this scheme has been retained in the Notes. The newspaper cuttings are mainly drawn from Lahore's *Civil & Military Gazette* and *Eastern Times*, though there are also extracts from the Urdu press of the sub-continent, as well as British provincial newspapers and *The Times* of London. The scrapbook was meticulously compiled, with a handwritten index in pencil in the front, with 385 numbered entries, for the period 1936-1943. The last entry present in the scrapbook as found by the author was numbered 368, which, according to the index, would make it the penultimate entry for 1941. The missing entries 369-385 are presumably lost, though there are two unindexed entries: a typewritten article with hand written corrections dated 1942 and a cutting from the October 1944 issue of *Religions*.

The handwriting in the scrapbook is Yusuf Ali's own, indicating that it was very much a personal possession, though the circumstances as to how it came to be lodged in the library are not known. His friendship with Dr Hasan Abdel Kader, director of the Islamic Cultural Centre from 1949-1954, is on record (*Islamic Literature*, Vol. VI, No. 1, January 1954, Lahore). Whatever its antecedents, the scrapbook is an invaluable source of biographical material on Yusuf Ali.

Punjab Press Abstract Vol. XXXIX, 1926.

Report on Newspapers and Periodicals in the Punjab, compiled by the Press Branch, Punjab Civil Secretariat. Copy held at the Quaid-e-Azam Library, Bagh-i-Jinnah, Lahore.

Newspapers and journals

Newspaper Library, Colindale.

The Times of London (its indexes have entries for Yusuf Ali under both 'Ali' and 'Yusuf Ali' for the period 1907-1953).

The Bournemouth Observer (1900).

Secondary Sources

Urdu

Muhammad Rafiq Afzal, *Guftar-i-Iqbal*, Lahore: Idara-e-Tahqiq, 1969.

Maftoon Ahmed, *Maulana Shibli Numani—aik mutala*, Karachi: Maktab Usloob, 1986.

Mian Amiruddin, *Yad-i-Ayyam*, Lahore: Kutub Khana Anjuman Himayat-e-Islam, 1983.

Ashiq Husain Batalvi, *Iqbal kay akhri do saal*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1989.

M.A. Chughtai, *Iqbal kay suhbat mai*, Lahore: Majlis-i-Taraqi-i-Adab, 1977.

S.A. Durrani, *Iqbal Europe mai*, Lahore: Iqbal Academy, 1985.

M.H. Faruqi, *Hayat-i-Iqbal kay chand makhfi goshay*, Lahore: Idara-i-Tahqiqat, 1988.

Baidar Malik, *Yaran-i-Maktab: Tehrik-i-Pakistan aur Islamia College*, Lahore, Lahore: Pakistan Studies Centre, Punjab University, 1986.

Abdussalaam Khurshid, *Way Suratain Ilahi*, Lahore: Qaumi Kutub Khana, 1976.

Nuqush—Makteeb Number, Vol. 2, Lahore, 1968.

Qamoos al-mashahir, Vol. 2, Compiled by Nizami Badayuni, Badayun, (India): Nizami Press, 1926.

Abul-Laith Siddiqui, *Malfuzat-i-Iqbal*, Lahore: Iqbal Academy, 1977.

Abdul Raoof Urooj, *Rijal-i-Iqbal*, Karachi: Nafees Academy, 1988.

Ghulam Husain Zulfikar, *Tarikh-i-Jam'a-i-Punjab*, Lahore: Punjab University, 1976.

Marfat.com

English

Waheed Ahmad, (ed.) *Letters of Mian Fazli-i-Husain*, Lahore: Research Society of Pakistan, 1976.

K.K. Aziz,

Britain & Muslim India, London: Heinemann, 1963.

The Indian Khilafat Movement 1915-1933, Karachi: Pak Publishers, 1972.

The All-India Muslim Conference 1928-1935- A documentary record, Karachi: National Publishing House, 1972.

Complete works of Rahmat Ali, Islamabad: National Commission on Historical and Cultural Research, 1978.

A History of the Idea of Pakistan, Lahore: Vanguard Books, Pakistan, 1987.

Vernon Bartlett, *Behind the Scenes at the Peace Conference,* London: George Allen & Unwin, 1919.

Mihir Bose, *The Aga Khans,* Tadworth, Surrey: World's Work Ltd., 1984.

J.F. Bruce, A History of the University of the Punjab, Lahore, 1937.

Peter Clark, *Marmaduke Pickthall, British Muslim,* London: Quartet Books, 1986.

Malcolm Darling, *Apprentice to Power 1904—8*, London: Hogarth Press, 1966.

C. Dobbin, *Urban Leadership in Western India*, Oxford University Press, 1972

Frances Donaldson, *The Marconi Scandal*, London: Rupert Hart Davis, 1962.

S.R. Dongerkerry, *A History of the University of Bombay 1857-1957*, Bombay: University of Bombay, 1957.

Asghar Ali Engineer, *The Bohras*, New Delhi: Vikas Publishing House, 1980.

M.K. Gandhi, *Gandhi—An Autobiography*, London: Phoenix Press, 1949.

Marfat.com

Rajmohan Gandhi, *Eight Lives,* Albany, New York: State University of New York Press, 1986.

G.F.I. Graham, *The Life and Work of Sir Sayyid Ahmed Khan*, London: Hodder & Stoughton, 1909.

Gail Minault, *The Khilafat Movement*, New Delhi: Columbia University Press, 1982.

Harold Nicolson, *King George V*, London: Constable, 1952.

A.C. Niemeijer, *The Khilafat Movement in India 1919-1924*, The Hague: Martinus Nijhoff, 1972.

Pakistan Historical Society, *Mohamed Ali: Life and work*, Karachi, 1978.

B.N. Pandey, The Indian Nationalist Movement 1885-1947, Select Documents, London: Macmillan, 1979.

C.H. Philips,

Historians of India, Pakistan and Ceylon, Oxford University Press, 1961.

Select Documents on the History of India & Pakistan, (ed.), Vol. IV, The Evolution of India & Pakistan 1858-1947, London: Oxford University Press, 1962.

S.S. Pirzada (ed.), *The Collected Works of Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah*, Vol. I, 1906-1921, Karachi: East & West Publishing House, 1984.

M. Naeem Qureshi, *Mohamed Ali's Khilafat Delegation to Europe*, Karachi: Pakistan Historical Society Publication No. 71, 1981.

Marquess of Reading, *Rufus Isaacs 1914-1935*, London: Hutchinson & Co., 1945.

Sayyid Athar Abbas Rizvi, *A Socio-Intellectual History of the Isna 'Ashari Shi'is in India,* Vol. II, Delhi: Munshiram Manoharlal Publishers, 1986.

P.G. Robb, *The Government of India and Reform,* Oxford University Press, 1976.

M.H. Sayyid, *Mohammad Ali Jinnah – A political study,* Karachi: Elite Publishers, 1962.

Marfat.com

Ronald Storrs, *Orientations*, London: Nicholson & Watson, 1945.

A.L. Tibawi, *Arabic and Islamic Themes*, London: Luzac & Co., 1976.

Husain B. Tayabji, *Badruddin Tayabji: a biography*, Bombay: Thacker & Co., 1952.

D.C. Verma, *Sir Chhotu Ram – Life and Times*, Delhi: Sterling Publications, 1981.

Sayyid Razi Wasti, (ed.), *Memoirs and other writings of Sayyid Ameer Ali*, Lahore: People's Publishing House, 1968.

Wilson College, *Thoughts on Indian Education*, Bombay, 1961.

Stanley Wolpert, *Jinnah of Pakistan*, Oxford University Press, 1984.

Zubaida Yazdani, *The Seventh Nizam: The Fallen Empire*, Cambridge University Press, 1985.

Sir Francis Younghusband,

Dawn in India, London: John Murray, London, 1930.

A Venture of Faith, London: Michael Joseph Ltd., 1937.

A.M . Zaidi, *Evolution of Muslim Political thought in India*, Vol. I, Delhi: Indian Institute of Applied Political Research, 1975.

Philip Ziegler, *King Edward VIII*. London: Fontana, 1991.

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشاریہ

ا

آرچر، ڈبلیو(.Archer, W):۱۱۴،۱۱۵

آرمینیا(Armenians):۱۰۷،۱۲۹،۱۳۰

آرنلڈ، ٹامس(Arnold, Thomas):۱۰۷

آزاد، مولانا ابوالکلام:۷۱

آغا خان، آغا سلطان محمد شاہ سوم:۱۱۰، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۸۲،
۱۹۰

آفتاب احمد خان:۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۰

آل انڈیا تنظیم کانفرنس:۱۴۰، ۱۴۸، ۱۷۶

آل انڈیا خلافت کمیٹی:۱۲۷

آل انڈیا مسلم کانفرنس:۱۷۶، ۱۹۰، ۲۹۵

ادارہ معارف اسلامیہ:۱۹۹

ارل آف لٹن(Earl of Lytton):۱۸۱

اسد، محمد:۱۹۶، ۱۹۸، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸

اسلامک ریویو اور مسلم انڈیا
(Islamic Review and Muslim India)
۱۰۲، ۱۳۵، ۱۳۷، ۲۶۹، ۲۸۶

اسلامک کلچر:۱۵۳، ۱۷۱، ۱۷۳، ۲۶۸، ۲۶۹، ۳۵۳

اسلامک کلچرل سنٹر، لندن:۱۴، ۲۶۸

اسلامیہ کالج لاہور:۱۵۹، ۱۶۰، ۱۷۰، ۱۷۶، ۱۹۶،
۲۲۹، ۲۶۲، ۲۸۲، ۲۹۱، ۲۹۵، ۳۰۷، ۳۰۱، ۳۲۷،
۳۶۲

اشرف، شیخ محمد:۱۹۵، ۲۴۴

اصفہانی، مرزا ابوالحسن:۲۷۱، ۲۷۲

اقبال، علامہ سر محمد::۵۵، ۱۶۵، ۱۷۵، ۱۸۲، ۱۸۷،
۱۸۸، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱،
۲۰۷، ۲۰۸، ۲۲۰، ۲۲۵، ۲۴۶، ۲۵۰، ۲۹۳، ۳۳۰،
۳۳۲، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴

☆ اسلامیہ کالج کے لیے عبداللہ یوسف علی کی تلاش:
۱۵۹، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۹۵

☆ اور لیگ آف نیشنز:۱۵۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۷۷،
۱۷۸، ۱۸۱، ۱۹۸، ۲۰۲، ۲۳۵، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۲،
۲۴۳، ۳۶۰، ۳۶۱

☆ اور یونینسٹ:۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۹۱، ۱۹۳،
۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۵

امام، سر علی:۱۷۲

امپیریل وار کانفرنس:۱۳۹

امیر الدین، میاں:۸۸، ۲۰۷

امیر جنگ بہادر، نواب:۱۵۳

امیر علی، جسٹس:۵۵، ۵۹، ۶۱، ۷۹، ۱۴۱، ۱۵۷، ۱۸۴،
۲۷۹، ۳۲۰

انجمن اسلام، بمبئی:۲۴، ۲۷، ۲۹، ۳۳، ۴۵، ۵۳، ۱۱۰،
۲۶۷

انجمن حمایت اسلام، لاہور:۱۴، ۲۴، ۱۵۹، ۱۶۶،

Marfat.com

۱۹۶، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۴۴، ۲۹۷، ۳۳۶

انڈیا آفس، لندن: ۱۴، ۲۶، ۷۸، ۱۱۴، ۱۳۸

انڈیا سوسائیٹی: ۱۸۷، ۱۸۸

انڈین سول سروس: ۲۴، ۲۵، ۳۶، ۶۶، ۷۳، ۷۶، ۹۷، ۱۹۷، ۳۳۰

انڈین نیشنل کمیٹی: ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۳۹، ۳۱۹

انڈین کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ، لاہور: ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۹، ۲۳۲، ۲۴۴

اوڈائر، سر مائیکل (O'Dwyer, Sir Michael): ۲۶۱

اورینٹل کالج، لاہور: ۵۲، ۲۰۴، ۲۳۱

اونیل، ایچ (O'Neil, H.): ۱۱۶، ۱۲۰

ابینگڈن، لارڈ (Abingdon, Lord): ۱۵۰

ایڈورڈ ہشتم (Edward VIII): ۶۸، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۷۵

ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن: ۱۰۰، ۱۸۶، ۱۹۱، ۲۵۷، ۲۶۱

ایسٹ انڈیا کمپنی: ۲۳، ۲۸۳، ۳۰۷، ۳۰۹، ۳۲۷، ۳۵۲، ۳۵۳

ایسٹرن ٹائمز (Eastern Times): ۱۸۰، ۱۹۷، ۲۰۶، ۲۲۸، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۵۳

ایمپٹ ہل، لارڈ (Ampthill, Lord): ۵۷، ۵۸، ۵۹

اینڈرسن کمیٹی، اینڈرسن، سر جیمس (Anderson Committee; Anderson, Sir James): ۱۸۹

اینگلو عربک کالج، دہلی: ۲۵۶، ۲۹۲

ب

بابر، شہنشاہ ظہیر الدین: ۱۵۳، ۱۵۴

بارٹلٹ، ورنن: ۱۴۸

برڈوڈ، سر جارج (Birdwood, Sir George): ۴۰، ۴۹، ۵۳، ۳۱۴

برڈوڈ، سر ولیم (Birdwood, Sir William): ۵۰، ۱۶۳

برطانیا: ۲۳، ۲۹، ۳۵، ۳۶، ۳۹، ۴۰، ۴۹، ۵۰، ۵۳، ۵۵، ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۴، ۶۵، ۶۹، ۷۲، ۷۵، ۷۷، ۷۹، ۸۰، ۸۲، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۵۰، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۹۱، ۱۹۳، ۲۲۱، ۲۲۹، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۶، ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۷۳، ۲۷۵، ۲۷۹، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۹۶، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۱۱، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۴، ۳۳۰، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱،

☆ برٹش کانسٹی ٹیوشنل ایسوسی ایشن: ۱۹۲

☆ برطانوی پالیسی بلقان میں: ۳۳۰

☆ برطانوی پالیسی عرب میں: ۱۴۶، ۱۴۷، ۲۴۱، ۲۴۲

Marfat.com

☆ جنگ عظیم میں ہندوستانی وسائل کا استعمال: ۹۹،۱۰۲،۱۰۳،۱۱۳،۱۳۶

☆ مسلم انجمنیں: ۴۵،۱۱۰،۲۰۰،۲۰۴

برکن ہیڈ، لارڈ (Birkenhead, Lord): ۱۸۱

بلگرامی، نواب عماد الملک: ۱۵۳،۱۷۳

بمبئی، مسلم سکول: ۲۹۱

بوگرا، محمد علی: ۲۷۱،۲۷۳،۲۸۸

بوگے، سر جارج (Boughey, Sir George): ۴۰، ۵۷، ۲۸۷

بوہری فرقہ: ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۵۳

بھٹو، شاہنواز: ۱۸۶

بھوش، سبھاس چندرا: ۲۵۸

بیرنگ، ارل آف کرومر (Baring, Earl of Cromer): ۶۶، ۸۵

بینٹ، کیپٹن (Bennet, Captain): ۱۴۸

پ

پاکستان: ۲۹۱، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۶

پاکستان ہائی کمیشن، لندن: ۱۷، ۲۶۷، ۳۶۶

پرنس آف ویلز (Prince of Wales): ۵۷، ۱۷۵، ۲۳۵، ۲۷۵

پروگریسو اسلامک ایسوسی ایشن: ۱۸۴، ۳۳۹

پروگریسو اسلام (کتابچے): ۱۸۴، ۳۳۰، ۳۳۱

پکتھال، مارماڈیوک (Pickthall, Marmaduke): ۱۰۶، ۱۲۳، ۲۰۳، ۲۷۳

پنجاب پراونشل مسلم لیگ: ۱۹۲

پنجاب یونینسٹ پارٹی: ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۰۰، ۲۰۵

پنجاب یونیورسٹی: ۱۶۱، ۱۸۹، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰

پونسن بی، ریورنڈ (Ponsonby, Reverend): ۱۷۳

پیرس امن کانفرنس: ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۰

پیریرا، ای۔ ڈبلیو (Perera, E.W.): ۱۰۶، ۱۳۷

پیسمور ایڈورڈس انسٹی ٹیوٹ (Passmore Edwards Institute): ۳۱۲

پیل کمیشن (Peel Commission): ۲۴۰، ۲۴۴

پیل، وائی کاؤنٹ (Peel, Viscount): ۱۸۳

ت

تحریک خلافت: ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۴۹، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۷۱، ۱۷۳، ۱۷۷

تخت طاؤس: ۱۳۲، ۱۴۹، ۱۵۰

تھورن، اوبیڈ (Thorne, Obed): ۷۰، ۸۷، ۸۸

ٹ

ٹریولین، سر چارلس (Trevelyan, Sir Charles): ۱۶۱

ٹوائن بی، آرنلڈ (Toynbee, Arnold): ۱۰۷، ۱۲۶

ٹیریسا میری، یا مسز عبداللہ یوسف علی (Teresa Mary, or Mrs Yusuf Ali): ۲۹۰، ۳۳۰، ۳۳۲

ٹیگور، رابندرا ناتھ: ۲۴۵

ج

جارج پنجم (George V): ۲۵۱

جامعہ سیفیہ: ۲۶

جزیرۃ العرب: ۱۲۲، ۱۲۹، ۱۳۲، ۲۴۰، ۱۶۳

جلیانوالہ باغ: ۲۸۵

جمیعت تنظیم، پنجاب: ۱۶۱، ۱۷۰

جناح، محمد علی: ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۸۶، ۱۸۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۵، ۲۲۳، ۲۴۳، ۲۴۶، ۲۵۸، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۷، ۳۵۸، ۳۵۹

جنگ عظیم اول: ۷۳، ۲۵۶، ۲۵۸، ۳۱۸

جنگ عظیم دوم: ۲۵۶، ۲۵۸، ۳۱۸

جوائس، اے ایچ (Joyce, A.H.): ۲۶۶

جوائنٹ کمیٹی آن انڈین کانسٹی ٹیوشنل ریفارم: ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۸

جوہر، محمد علی: ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۶۲، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۹۰، ۳۳۰، ۳۵۸، ۳۵۹

چ

چٹوپادھیا، وی: ۱۳۹

چھوٹو رام (Chutu Ram): ۱۹۳، ۲۲۹

چیٹر جی، سر اتول (Chatterjee, Sir Atul): ۲۰۳

چیمسفورڈ، لارڈ (Chelmsford, Lord): ۱۲۷، ۱۴۴، ۱۴۸، ۱۷۱، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۸۶

ح

حجاج ابن یوسف: ۳۵۴

حسینی، جمال: ۲۴۲

حمید اللہ، ڈاکٹر محمد: ۳۵۳، ۳۵۴

حیدرآباد، دکن: ۱۰۷، ۱۳۳، ۱۷۰، ۱۷۲، ۲۰۴، ۲۲۳، ۲۸۹

حیدری، سر اکبر: ۲۹، ۸۵، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۸۵، ۲۶۷

خ

خان، سر ظفر اللہ: ۱۹۳، ۲۱۷

خان، عبد الرحمٰن

خلیفہ، خلافت: ۱۶۲، ۱۶۳

د

دہلوی، شاہ عبد القادر: ۳۵۳

ڈ

ڈین، سر لوئس (Dane, Sir Louis): ۲۶۱

ر

راجہ آف محمود آباد: ۷۳، ۸۵، ۸۹

رائل ایمپائر سوسائٹی: ۲۶۳، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۸۷

رائل سوسائٹی آف آرٹس: ۴۲، ۵۷، ۶۳، ۶۵، ۲۶۶، ۳۵۸، ۳۶۴

رائل سوسائٹی آف لٹریچر: ۵۷، ۶۵، ۲۴۹، ۳۶۴

Marfat.com

راؤنڈٹیبل کانفرنس:۲۶۳
رحمت علی:۲۲۳
روس، سرڈینی سن(Ross, Sir Dennison)
روگے، ایم۔اے(Roghay, M.A.):۲۷
رولٹ ایکٹ(Rowlatt Act, Committee):
۱۹۴،۱۴۹
ریڈنگ، لارڈ روفس آئزکس
(Reading, Lord Rufus Isaacs):
۳۶۰،۲۷۹،۱۷۵،۱۷۴،۱۷۱،۱۵۳
ریڈی، سرکرما(Reddi, Sir Kurma):۱۸۲،۱۸۱
ریفارم کلب:۵۵
ریول سٹوک، بیرن(Revelstoke, Baron)

ز

زٹ لینڈ، لارڈ(Zetland, Lord):۱۸۶
زلیخا اور یوسف:۳۳۲
زمرن، سرایلفریڈ(Zimmern, Sir Alfred):
۲۱۵،۱۲۶

س

ساؤتھ پلیس اتھیکل سوسائٹی
(South Place Ethical Society):۳۲۷
سائیک، سرپرسی(Syke, Sir Percy):۲۶۱
سپیری، ڈبلیو(Sperry, W.):
سیٹن، سرمیلکوم(Seton, Sir Malcolm):۱۶۰
سعود، امیر:۲۴۷
سکول آف اورینٹل سٹڈیز، لندن:۱۰۶
سکندر حیات خان، سر:۲۰۴، ۲۰۹، ۲۱۳، ۲۳۷، ۲۵۶
سمرنا:۱۳۰
سمسن، ویلس(Simpson, Wallis):۲۳۵
سنہا، لارڈ ایس۔پی(Sinha, Lord S.P.):
۱۳۰،۱۲۵،۱۲۴،۱۱
سوڈربلوم، آرچ بشپ(Soderblom, Archbishop)
سہروردی، سرحسن:۲۰۳، ۲۲۰
سیداحمد خان، سر:۱۵۵، ۲۹۲، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۱،
۳۵۷،۳۴۲
سید حسین:۱۲۸، ۱۲۹
سید سلیمان ندوی، مولانا:۱۲۸، ۱۶۵، ۱۸۰، ۳۳۹،
۳۵۳
سیموئل ہربرٹ، وائی کاؤنٹ بعدازاں لارڈ
(Samuel, Herbert, Viscount later Lord):
۳۶۰،۲۸۰،۲۷۹،۲۷۸،۱۴۳
سین، این۔سی(Sen, N.C.):۱۱۴
سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن:۴۵
سیورز معاہدہ(Sevres, Treaty):۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳

Marfat.com

ش

شبلی نعمانی، مولانا:۷۱،۸۵

شجاع الدین، خلیفہ:۱۹۹،۲۰۱،۲۰۷،۲۲۰

شریف حسین:۱۲۶،۱۴۶

شفیع، پروفیسر محمد:۱۶۵،۲۳۱

شفیع، محمد:۲۰۴،۲۳۲

شفیع، میاں محمد:۱۸۶،۲۰۴،۲۰۹

شیلڈرز، آئزک نواہ(Shalders, Isaac Noah):
۷۰

شیلڈرز، ایلس میری(Shalders, Alice Mary):
۵۳،۷۰

شیلڈریک، خالد(Sheldrake,Khalid):۲۰۳

ص

صیہونیت:۲۷۹

ط

طیب جی، جسٹس بدرالدین:۲۰،۵۶،۷۱،۱۱۰،۱۴۰

طیب جی، قمرالدین:۲۷

ظ

ظفر اللہ خان:۱۹۳،۲۱۷

ظفر علی خان، مولانا:۱۶۳،۱۶۵،۱۹۳،۲۰۹

ع

عالم، منشی محبوب:۱۶۵

عبدالحمید دوم، سلطان:۷۷،۸۱،۱۳۵

عبدالعلی، ایم ایچ:۱۹،۳۲

عبدالقادر، شاہ:۱۶۵،۳۵۴

عبدالقادر، ڈاکٹر علی حسن:۴۰،۴۱،۲۰۰،۲۶۸،۲۷۹،۳۵۷

عبدالقادر، شیخ:۱،۱۵۳،۱۵۷،۱۵۸،۱۵۹،۱۶۳،۱۶۴،
۱۶۵،۱۷۳،۱۷۸،۲۳۶،۲۴۳،۲۴۴،۲۷۹

عبداللہ یوسف علی، علامہ:
۲۴،۲۵،۲۶،۲۷،۲۹،۳۰،۳۱،۳۲،۳۴،۳۵،۳۶،
۳۷،۳۸،۳۹،۴۰،۴۲،۴۳،۴۴،۴۵،۴۶،۴۸،۴۹،
۵۰،۵۱،۵۲،۵۳،۵۴،۵۵،۵۶،۵۷،۵۸،۵۹،۶۰،
۶۱،۶۲،۶۳،۶۴،۶۵،۶۶،۶۷،۶۸،۶۹،۷۰،۷۱،
۷۳،۷۶،۷۷،۷۸،۷۹،۸۱،۸۳،۸۴،۸۵،۸۶،
۸۷،۹۰،۹۱،۹۲،۹۶،۹۷،۱۰۰،۱۰۱،۱۰۲،۱۰۳،۱۰۴،
۱۰۵،۱۰۶،۱۰۷،۱۰۸،۱۰۹،۱۱۰،۱۱۱،۱۱۲،۱۱۳،۱۱۴،
۱۱۵،۱۱۶،۱۱۷،۱۱۸،۱۱۹،۱۲۰،۱۲۱،۱۲۲،۱۲۳،۱۲۵،
۱۲۷،۱۲۸،۱۳۲،۱۳۳،۱۳۴،۱۳۷،۱۳۸،۱۴۰،۱۴۱،
۱۴۶،۱۴۸،۱۵۰،۱۵۱،۱۵۲،۱۵۳،۱۵۴،۱۵۵،۱۵۶،
۱۵۷،۱۵۸،۱۵۹،۱۶۰،۱۶۲،۱۶۳،۱۶۴،۱۶۵،۱۶۶،
۱۶۷،۱۶۸،۱۶۹،۱۷۰،۱۷۱،۱۷۲،۱۷۳،۱۷۴،۱۷۵،
۱۷۶،۱۷۹،۱۸۰،۱۸۱،۱۸۲،۱۸۳،۱۸۴،۱۸۵،۱۸۶،
۱۸۷،۱۸۸،۱۸۹،۱۹۰،۱۹۱،۱۹۲،۱۹۳،۱۹۴،۱۹۵،
۱۹۶،۱۹۷،۱۹۸،۲۰۰،۲۰۱_۲۰۲،۲۰۳،۲۰۴،۲۰۵،
۲۰۶،۲۰۷،۲۰۸،۲۰۹،۲۱۳،۲۱۴،۲۱۵،۲۱۷،۲۱۸،
۲۲۳،۲۲۴،۲۲۵،۲۲۸،۲۲۹،۲۳۰،۲۳۱،۲۳۲،

Marfat.com

۲۳۶،۲۳۷،۲۳۸،۲۳۹،۲۴۰،۲۴۱،۲۴۲،۲۴۴،
۲۴۵،۲۴۶،۲۴۷،۲۴۸،۲۴۹،۲۵۰،۲۵۱،۲۵۳،
۲۵۴،۲۵۶،۲۵۸،۲۵۹،۲۶۰،۲۶۱،۲۶۲،۲۶۳،
۲۶۴،۲۶۵،۲۶۶،۲۶۷،۲۶۸،۲۶۹،۲۷۰،۲۷۱،
۲۷۲،۲۷۳،۲۷۴،۲۷۸،۲۷۹،۲۸۲،۲۸۵،۲۸۶،
۲۸۷،۲۹۰،۲۹۱،۲۹۴،۲۹۵،۲۹۶،۲۹۷،۲۹۸،
۲۹۹،۳۰۰،۳۰۲،۳۰۳،۳۰۴،۳۰۷،۳۰۸،۳۱۱،۳۱۲،
۳۱۳،۳۱۴،۳۱۵،۳۱۶،۳۱۸،۳۲۰،۳۲۱،۳۲۲،
۳۲۳،۳۲۵،۳۲۶،۳۲۷،۳۲۹،۳۳۰،۳۳۱،
۳۳۲،۳۳۳،۳۳۴،۳۳۵،۳۳۶،۳۳۷،۳۳۸،
۳۳۹،۳۴۰،۳۴۱،۳۴۲،۳۴۳،۳۴۴،۳۴۶،۳۵۱،
۳۵۳،۳۵۵،۳۵۶،۳۵۷،۳۵۸،۳۵۹،۳۶۰،
۳۶۱،۳۶۲،۳۶۳،۳۶۴،۳۶۵،۳۶۶

☆ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ناگپور کی صدارت:۶۹

☆ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی صدارت:۱۶۱،۲۱۲

☆ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت:۱۹۰،۲۹۵،۳۰۷

☆ آل سیلون مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت: ۵۴،۲۰۳،۲۹۴

☆ آغا خان کے ساتھ ان کا رویہ:۱۹۸،۲۰۸

☆ آئی سی ایس پنشن:۲۶۲

☆ آئی سی ایس سے استعفیٰ:۷۳،۷۷

☆ آئی سی ایس میں ان کا کیریر:۳۷

☆ ابتدائی اور ثانوی تعلیم:۲۷،۳۰

☆ اپنا کتب خانہ اسلامیہ کالج کے نام کرنے کی وصیت:۲۶۲

☆ اپنے بچوں کو عاق کرنا:۷۰،۱۳۳،۲۶۱،۲۶۲، ۳۳۰،۳۳۲

☆ اپنی ڈائریاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام کرنے کی وصیت:۲۶۲،۲۷۴

☆ امپیریل انسٹی ٹیوٹ میں دوران جنگ خدمات: ۱۲۰،۲۵۶

☆ اسفار:۶۹،۷۷،۱۵۶،۱۶۹،۱۸۵،۲۴۶،۲۵۱

☆ ان کا بچپن:۲۴

☆ ان کا کردار لارڈ میسٹن کی نگاہ میں:۷۳،۷۴،۷۵

☆ ان کی اردو دانی:۱۵۲،۳۰۲،۳۰۳

☆ اور اسلامی خلافت:۷۸،۷۹

☆ اور اسلامیہ کالج:۱۶۵،۱۶۶،۱۷۰،۱۸۳،۲۰۴، ۲۰۹،۲۹۱،۲۹۳،۲۹۵،۲۹۶،۳۰۴،۳۰۷،۳۱۰، ۳۲۷،۳۳۶،۳۳۸،۳۵۱،۳۶۲،۳۶۵

☆ اور بمبئی یونیورسٹی:۳۴،۳۵،۵۰

☆ اور پنجاب کے یونینسٹ:۱۵۹،۱۶۰،۱۶۳،۱۶۴، ۱۹۱،۱۹۳،۱۹۹،۲۰۰،۲۰۵

☆ اور پنجاب یونیورسٹی:۱۶۱،۱۸۹،۲۹۸،۲۹۹،۳۰۰

☆ اور پیرس کانفرنس:۱۲۵،۱۲۶،۱۲۷،۱۳۰

☆ اور تحریک خلافت:۱۶۲،۱۶۳

☆ اور ترقی پسند اسلام:۱۵۵،۱۶۰،۲۳۰،۳۲۲، ۳۴۳،۳۴۴،۳۴۵،۳۴۶

Marfat.com

☆ اور دستوری اصلاحات کی مشترکہ کمیٹی: ۱۹۸
☆ اور رائل سوسائیٹی آف آرٹس: ۴۲، ۵۷، ۶۳، ۶۵، ۲۶۶، ۳۵۸، ۳۶۴
☆ اور رائل سوسائیٹی آف لٹریچر: ۵۷، ۶۵، ۲۴۹، ۳۶۴
☆ اور عثمانیہ یونیورسٹی: ۲۸، ۱۵۱، ۱۵۲
☆ اور علامہ اقبال: ۵۵، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۸، ۲۲۰، ۲۴۵، ۳۶۱
☆ اور علی گڑھ: ۶۳، ۱۸۳
☆ اور لاہور آرٹ سرکل: ۴۲، ۲۶۶، ۳۵۸
☆ اور لیگ آف نیشنز: ۱۵۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۸۱، ۱۹۸، ۲۰۲، ۲۳۵، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۳۶۰، ۳۶۱
☆ اور مسلم لیگ: ۱۶۲، ۱۶۶، ۱۹۲، ۱۹۹، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۴
☆ اور نماز جمعہ: ۲۰۴
☆ اور نیشنل لبرل کلب: ۳۵، ۱۱۲، ۲۴۷، ۲۵۴، ۲۶۲، ۳۰۸
☆ ایڈمنٹن میں مسجد کا افتتاح: ۲۶۶
☆ ایسٹرن ٹائمز کی ادارت: ۱۸۰، ۱۹۷، ۲۰۶، ۲۲۸
☆ بحیثیت پرنسپل اسلامیہ کالج: ۱۵۹، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۹۵، ۳۳۸، ۳۳۹
☆ بحیثیت قرآنی علوم کے سکالر: ۲۶۸، ۲۶۹، ۳۳۹
☆ برطانوی سلطنت کے ساتھ ان کی وفاداری: ۶۲، ۹۷، ۱۲۱، ۱۷۹، ۳۱۹
☆ بوہری طبقے سے ان کا تعلق: ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۵۳
☆ پنجاب سالانہ ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت: ۱۶۱، ۲۰۳
☆ پہلی بیوی کو طلاق: ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۸۷
☆ پہلی شادی: ۴۳، ۵۳، ۲۶۱
☆ تصنیفات اور دیگر تحریریں: ۱۵۶، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۷
☆ تصوف کے بارے میں ان کا رویہ: ۲۵۰، ۳۲۲
☆ تعلیمی اصلاحات کی تجاویز: ۳۰۲، ۳۰۳
☆ تفسیر قرآن: ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷
☆ تفسیر کی کلاسیں: ۱۹۴، ۱۹۵
☆ جمعیت تنظیم کی صدارت: ۱۶۱
☆ جنگ عظیم اول کے دوران پروپیگنڈا مہم: ۷۳، ۲۵۶، ۲۵۸، ۳۱۸
☆ جنگ عظیم دوم کے دوران پروپیگنڈا مہم: ۲۵۶، ۲۵۸، ۳۱۸
☆ جنگ کے دوران سکینڈینیویا میں خدمات: ۱۲۰، ۲۵۶
☆ حجاج ابن یوسف سے جدی تعلق: ۳۵۴
☆ حیدرآباد دکن میں ملازمت: ۲۸۹
☆ دورۂ کینیڈا: ۱۶۹، ۱۸۵، ۲۴۶

Marfat.com

☆ دوسری بیوی سے علیحدگی:۲۶۲، ۲۶۶، ۲۶۷
☆ دوسری شادی:۱۳۳
☆ رائل سوسائیٹی آف آرٹس کی طرف سے اعزاز:۶۰
☆ سائنس کے بارے میں ان کا رویہ:۳۰۱، ۳۲۲، ۳۲۴،
۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲
☆ سربیا کی طرف سے اعزاز:۱۰۸
☆ سرسید احمد خان سے ملاقات:۲۲۰، ۲۴۵
☆ سکول آف اورینٹل سٹڈیز میں ان کے لکچر:۱۰۶
☆ سندھ آزاد کانفرنس کی صدارت:
☆ سیاست کے بارے میں ان کا رویہ:۱۵۱، ۱۸۷
☆ سی بی ای کا اعزاز:۱۱۱
☆ شاہ فیصل سے ملاقات:۱۴۴، ۱۴۵، ۱۶۹
☆ علی برادران کے ساتھ ان کا رویہ:۷۲
☆ عہد مغلیہ پر ان کی گہری نظر:۱۵۳، ۱۵۴، ۱۷۴
☆ فریضۂ حج کی ادائیگی:۱۹۷
☆ کیمبرج میں:۲۵، ۳۷، ۳۹، ۴۰، ۴۲، ۴۴، ۴۶،
۸۰، ۹۷، ۱۷۵، ۱۹۲، ۲۲۳، ۲۴۲، ۲۹۲
☆ قیام لاہور:۱۵۹، ۱۹۴
☆ قیام لندن:۱۹۱، ۲۰۲، ۲۵۴، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۸
☆ لندن میں ان کا انتقال:۴۳، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۷۳
☆ لندن یونیورسٹی کے لیے فنڈ:۲۶۲، ۲۷۳، ۲۷۴
☆ لنکنز ان میں:۳۹، ۴۰، ۴۹
☆ مسجد شاہجہاں ووکنگ کے متولی کی حیثیت سے:۲۶۶
☆ نسلی تعصب پر ان کی تنقید:۲۵۳
☆ نماز عید کی امامت:۲۰۴، ۲۴۴، ۲۶۶
☆ وہابیت کے بارے میں ان کا رویہ:۱۶۱، ۳۴۳
☆ یو پی انڈسٹریل کانفرنس کی صدارت:۶۹
عبدالمجید، سید:۶۰
عثمانی ترکی:۱۲۱، ۱۲۳
عثمانیہ یونیورسٹی:۱۵۱، ۱۵۲
عزیز، ایڈووکیٹ:۱۷۶، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۲، ۲۳۲، ۳۴۹
علی برادران: دیکھیے محمد علی جوہر اور شوکت علی:۷۲،
۸۹، ۱۲۶، ۱۳۶، ۱۴۲، ۱۴۶، ۱۴۸، ۱۵۷، ۱۶۲، ۱۶۷،
۱۷۵، ۱۷۷، ۲۹۲
علی، شوکت:۷۲، ۸۹، ۱۲۶، ۱۴۶، ۱۵۷، ۱۷۵، ۱۹۰
علی گڑھ کالج، یونیورسٹی:۸۴، ۱۵۳، ۳۵۷
علی، ملک برکت:۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۰۹، ۳۴۲
عمر عبداللہ:۲۶۹، ۲۷۰
علی، وارث:۸۶

غ

غنی، وائس پرنسپل:۳۰۷

ف

فتح علی خان، نواب آف قزلباش:۸۹
فرائضی تحریک:۱۶۱
فری میسنری(Freemasonry):۳۱۵، ۳۲۶
فصیح جنگ، نواب:۱۷۱

Marfat.com

فضل حسین، سر: ۱۹، ۱۵۲، ۱۵۹، ۲۶۳، ۱۷۵، ۱۸۶، ۱۹۰، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۴، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۲۹، ۲۳۰

فلسطین: ۱۲۹، ۱۳۰، ۲۳۰، ۲۳۵، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۷۹، ۲۸۰

فیروز الدین، حافظ: ۲۰۵

فیصل، شہزادہ بعد ازاں شاہ عراق: ۱۲۶، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۶۹، ۱۸۰

فیضی، بیگم عطیہ: ۸۱

ق

قائد اعظم لائبریری لاہور: ۱۷۱، ۱۷۶

قرآن، متن، ترجمہ مع حواشی: ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰

☆ تبصرے: ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۴

☆ طبع مکرر، نئے ایڈیشن: ۳۳۸، ۳۴۰

☆ لاہور میں اشاعت: ۱۳

قسطنطنیہ: ۱۳۰

قصوری، مولوی جی۔ ایم: ۲۰۸، ۲۰۹

ک

کاظمی، آرٹسٹ: ۲۴۵

کانگرس آف فیتھس (Congress of Faiths, World Congress of Faiths): ۲۶۰، ۲۶۶، ۲۷۷، ۲۷۹، ۲۹۶، ۳۱۴، ۳۲۱، ۳۲۷

کانگریس پارٹی، انڈین نیشنل کانگریس پارٹی: ۱۳۱، ۱۸۶، ۱۹۳، ۲۶۰، ۲۹۳

کچلو، سیف الدین: ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۷۷

کرامت علی، جونپوری: ۱۶۱، ۱۷۶، ۳۲۱

کربلائے معلیٰ: ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹

کریڈک، سر ریجینلڈ (Craddock, Sir Reginald): ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۲۳

کرزن، لارڈ (Curzon, Lord): ۳۶، ۷۶

کریگ، جنرل (Creagh, General): ۹۷

کلوڈیل، پول (Claudel Paul): ۱۸۸

کلیمنسو، جارجز (Clemenceau, Georges): ۱۲۴

کیلون، لارڈ (Kelvin, Lord): ۳۳

کیمبرج، لارڈ فریڈرک (Cambridge, Lord Fredrick): ۱۹۲، ۲۴۷

گ

گاندھی، مہاتما موہن داس کرم چند: ۷۸، ۹۱، ۹۲، ۱۳۱، ۱۴۸، ۱۶۲، ۱۷۴، ۲۵۸

گورنمنٹ کالج، لاہور: ۲۰۷

گیسلی، سٹیفن (Gaselee, Stephen): ۱۱۵، ۱۲۰

ل

لارنس، ٹی۔ ای (Lawrence, T.E.): ۱۲۶

Marfat.com

لاہور آرٹ سرکل: ۴۲، ۲۶۶،
جارج، لائڈ (George,Lloyd): ۹۵، ۱۲۳، ۱۲۴،
۱۲۸، ۱۲۹، ۱۴۳
لیال، سر چارلس (Lyall, Sir Charles): ۳۵۸
لیپر، ایلن (Leeper, Allen): ۱۰۷، ۱۰۸
لیسکی، ہیرالڈ (Laski, Harold): ۱۸۶
لیگ آف نیشنز: ۱۵۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۸۱،
۱۹۸، ۲۰۲، ۲۳۵، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۳۶۰، ۳۶۱
☆ انتداب: ۳۶۰
☆ اور عبداللہ یوسف علی: ۱۵۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۷۷،
۱۷۸، ۱۸۱، ۱۹۸، ۲۰۲، ۲۳۵، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۲،
۲۴۳، ۳۶۰، ۳۶۱
للی، سر فریڈرک (Lely, Sir Frederic): ۲۹، ۴۰،
۷۷، ۱۰۶، ۱۹۳، ۲۲۴
لیمنگٹن، لارڈ (Lamington, Lord): ۱۵۰، ۲۶۷

م

مارکوئی آف لنلتھگو (Marquess of Linlithgow):
۱۹۲
مسجد شہید گنج، لاہور: ۱۹۹
مسجد کانپور: ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۹۰، ۱۰۲، ۱۵۶، ۱۹۹
مسلم لیگ: ۱۹، ۱۴۰، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۰۰، ۲۰۷، ۲۳۷،
۲۶۰، ۲۶۷، ۲۹۳
مصطفیٰ کمال: ۱۳۱، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۹، ۱۸۰
معصومہ، مسز عبداللہ یوسف علی یا گرٹروڈ این موبے
(Masuma, Mrs Yusuf Ali or Gertrude
Anne Mawbey):
۱۳۳، ۱۳۴، ۱۶۰، ۲۰۱، ۲۴۷، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۵، ۲۶۸،
۲۷۰، ۲۷۴، ۲۸۹، ۲۹۰
ملٹ آرٹسٹ (Millet, artist): ۲۴۴
ملک، بیدار: ۱۷۲
ممتاز، جی۔ ایم: ۱۶۵، ۲۷۰
منالٹ: ۱۴۸
موبے، ٹامس (Mawbey, Thomas): ۱۳۳
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ: ۳۶۲
مورلے، لارڈ (Morley, Lord): ۶۵، ۸۵، ۱۴۱
مورلینڈ، ڈبلیو، ایچ (Moreland, W.H.): ۱۵۳،
۳۰۹
موریسن، تھیوڈور (Morison, Theodore): ۶۳
مونارکسٹ لیگ (Monarchist League): ۲۷۵
مونٹگیو، ایڈون (Montagu, Edwin): ۱۲۴، ۱۲۸،
۱۳۰، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۷، ۲۷۵
☆ اور عبداللہ یوسف علی: ۳۹، ۴۵، ۸۵، ۹۷،
۱۴۷، ۱۴۱، ۱۵۹، ۱۸۸، ۱۹۸، ۲۴۴، ۲۷۸، ۲۸۷،
۳۰۰، ۳۶۲
مونٹیسری، مادام (Montessori, Madame):
۲۰۲، ۲۹۲
مونگ اے مونگ (Maung Aye Maung): ۲۳۸
مہاراجہ آف بیکانیر: ۱۱، ۱۲۴، ۱۸۵

Marfat.com

میکی کن، ریورنڈ(Mackichan, Reverend):۳۷

میسٹر ووک، آئی ون(Mestrovic Ivan):۱۰۹،

۳۲۵،۳۱۳،۱۳۸

میسٹن، سرجیمز بعدازاں لارڈ

(Meston, Sir James, later Lord):۵۲،

۲۷۹،۲۶۷،۲۶۴،۲۶۳،۲۱۵،۱۸۱،۵۴

میکالے لارڈ(Macaulay, Lord):۳۶،۴۷

میکڈونلڈ، رمسے(Macdonald, Ramsey):۱۵۰

میکلیگن، سرایڈورڈ

(Maclagan, Sir Edward):۱۵۶

ن

نائیڈو، سروجنی:۷۰،۱۹۸

نظام آف حیدرآباد، امیر عثمان علی خاں:۷۱،۹۶،۱۵۱،

۲۱۰،۱۸۵،۱۷۳،۱۷۱،۱۵۳

نظامت جنگ، نواب:۱۵۳،۱۷۳

نکلسن، ڈاکٹر(Nixon, Dr):۱۸۸

نواب آف پالنپور:۱۸۱

نواب آف رنپور:۸۹

نوروجی، دادابھائی:۳۹

نون، سرفیروز خان:۲۰۲،۲۳۷،۲۸۶

نہرو، جواہر لال:۲۴۶،۲۵۸

نیشنل لبرل کلب:۳۵،۱۱۲،۲۴۷،۲۵۴،۲۶۲،۳۰۸

و

وارڈ، ریورنڈ(Ward, Reverend):۳۷

وٹوریو، اورلینڈو(Vittorio, Orlando):۲۰،۱۲۴

وکٹوریہ، ملکہ(Victoria, Queen):۳۹،۳۱۱

ولسن، سررولینڈ(Wilson, Sir Roland):۲۰،۳۲

ولسن، جون(Wilson, John):۲۷

ولسن کالج، بمبئی:۳۰،۳۱،۳۳،۴۴،۴۶

ولسن، وڈرو(Wilson,Woodrow):۲۰،۱۲۴

ویلنگٹن کالج، برک شائر

(Wellington College, Berkshire):

۸۶،۸۸

ولنگڈن، لارڈ(Willingdon, Lord):۱۲۴،۱۸۸،

۱۸۹

وہابیت:۸۱،۱۸۶،۳۴۳

ویڈربرن، ممبر پارلیمنٹ

(Wedderburn, Member of Parliament):۷۶

ہ

ہارڈنگ، لارڈ(Hardinge, Lord):۷۳،۹۰،

۱۲۰،۱۳۵،۱۴۶

ہندوستانی اکیڈمی:۱۶۷،۱۷۱

ہوز، جے(Hose, J.):۱۱۱،۱۱۵،۱۱۶،۲۲۶

ہیلی سرمیلکوم(Hailey, Sir Malcolm):۱۶۰

ہینکی، موریس(Hankey, Maurice):۱۲۶

Marfat.com

ی

ینگ ہسبنڈ، سر فرانسس

(Younghusband, Sir Francis):۱۸۷،

۲۰۳،۲۷۶،۲۷۷

یوسف علی، ادریس:۵۴،۸۰

یوسف علی، اصغر بلائے:۵۴،۸۰،۱۳۳

یوسف علی، البان حیدر:۵۵،۸۰،۱۰۵

یوسف علی، راشد:۱۴۳،۱۵۳،۱۶۰،۱۶۸،۱۷۳،۱۸۳،

۱۸۹،۲۴۷،۲۸۷،۲۸۹،۳۰۸،۳۶۵

یوسف علی، لیلا ٹیریسا:۱۰۵،۲۹۰

Marfat.com

سکون کی تلاش

سوانح حیات علامہ عبداللہ یوسف علی

Marfat.com